زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثالث

جلد۔۳ شمارہ ۔۱۲

جنوری تا مارچ ۲۰۱۸ء

مدیر اعزازی اقبال حسن آزاد

مدیر ثالث آفاق صالح

نائب مدیر: اعجاز رحمانی

رابطہ: : شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔۸۱۱۲۰۱
Mob.+91 9430667003
email.eqbalhasan35@yahoo.com
www.salismagazine.in

● پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔

● 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

قیمت۔فی شمارہ : .....۱۵۰ روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۵۰/روپے)
سالانہ : .....۶۰۰ روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۷۰۰/روپئے)
خصوصی تعاون : .....پندرہ ہزار روپئے یا ۳۰۰/امریکی ڈالر

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زرتعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	ستر (۷۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	اسّی (۸۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	پچاس (۵۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	پچاس (۵۰) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سو ساٹھ (۱۶۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	بیس (۲۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو پچاس (۱۵۰) ریال
قطر:	:	دوسو (۲۰۰) ریال
کویت	:	تیس (۳۰) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں Western Union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتے پر رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتے پر بھیجی جا سکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com

سالانہ ممبر شپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جا سکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Allahabad Bank
Jamalpur Branch
A/c No. 20962191966
IFSC Code-ALLA0210009

◀◀ ● ▶▶

فہرست

	اداریہ	ادارہ	۵
	حمد ونعت	ذوالفقار نقوی	۸۔۷
غزلیں			۹
	شفیع الرحمن شفیع، مرغوب اثر فاطمی، ڈاکٹر منصور خوشتر، ساجد حمید، شکیل جمالی، شہزاد انجم برہانی، جمیل ارشد خاں، وفا نقوی		
مضامین	اجالوں کی سیاہی کا منظر نامہ	ڈاکٹر منظر اعجاز	۱۸
	شکیلہ اختر اور ان کی ترقی پسندانہ واقعیت شعاری	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۳۹
	مولانا محمد حسین آزاد اور نظم نگاری	ڈاکٹر ندیم احمد	۵۴
گوشہ پروفیسر قمر رئیس			
	کوائف	ادارہ	۶۱
	غزل کی بے خزاں شادابی	پروفیسر قمر رئیس	۶۷
	قمر رئیس کی شاعری میں رومان پرور جزیرے	ڈاکٹر نگار عظیم	۷۴
	ناول کی تنقید	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	۸۶
	قمر رئیس ترجمہ اور فن ترجمہ	پروفیسر محمد ظفر الدین	۹۷
	غزلیں	پروفیسر قمر رئیس	۱۰۵
	نظمیں	پروفیسر قمر رئیس	۱۰۹
افسانے	آخری گجرا	محمد جاوید انور	۱۱۵
	اندمال	ناصر بغدادی	۱۲۹
	لہر لہر سمندر	نجمہ محمود	۱۳۶
	چڑیاں	محمد الیاس گوندل	۱۴۱
	آشرواد	احمد عرفان	۱۴۶

مائکروفکشن	محبت	ناہید طاہر	۱۴۷
انتخاب	بندوبست	اقبال حسن آزاد	۱۴۹
تجزیہ	افسانہ ''بندوبست'' کا بست وکشاد	ارشد عبدالحمید	۱۵۶
ناول کا ایک باب	راج سنگھ لاہوریا	اقبال حسن خاں	۱۶۱
فلم	یوسف ثانی	شکور پٹھان	۱۸۴
شوہر نامہ	میرے مجازی خدا	شائستہ انجم نوری	۱۹۱
تبصرے	لفظوں کا لہو	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۲۰۳
	یہ عشق ہے	اقبال حسن آزاد	۲۰۵
	دربھنگہ ٹائمز	اقبال حسن آزاد	۲۰۷
	پورٹریٹ	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۲۱۲
	دہلیز	ڈاکٹر سہیل	۲۱۶
ثالث پر تبصرہ	''ثالث'' کا گیارہواں پڑاؤ	محمد حامد سراج	۲۱۸
مکتوبات	پرتپال سنگھ بیتاب، نعیم بیگ، شفیع مشہدی، عبدالرحمن فیصل		۲۲۲

{ثالث ملنے کے پتے}

☆ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) 9304888739 +91

☆ آزاد کتاب گھر، ساکچی، جمشید پور (جھارکھنڈ) 6576999980 +91

اداریہ

تنقید نگار کا کام بہت پیچیدہ ہوتا ہے۔لہذا یہ ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ وسیع اور نظر گہری ہو۔ چونکہ اسے بہت سے علوم سے مدد لینی پڑتی ہے اس لیے تمام اہم علوم سے بھی اسے آگاہی ہونی چاہیے۔کم علم اور کم تجربہ رکھنے والا شخص تنقید کا حق ادا نہیں کرسکتا۔عام قاری کے برعکس تنقید نگار ایک باشعور قاری ہوتا ہے اور ضروری علوم پر اس کی نظر ہوتی ہے۔وہ کسی ادبی وفنی کارنامے کو سمجھنے اور سمجھانے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔اس کی تنقیدی رائے ایک طرف تو فنکار کی رہنمائی کرتی ہے اور دوسری جانب وہ فن پارے تک رسائی حاصل کرنے میں قاری کی مدد کرتا ہے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قاری نے کسی فن پارے کو پسند یا ناپسند تو کرلیا مگر اس کی پسند کا سبب کیا ہے یہ وہ نہیں سمجھ پاتا۔ لیکن اس فن پارے سے متعلق کوئی تنقیدی مضمون پڑھ کر اسے اپنے سوال کا جواب مل جاتا ہے اور وہ ذہنی الجھن سے نجات پالیتا ہے۔

تنقید سے متعلق ایک اور غلط فہمی عام ہے۔بعض نقادوں کا خیال ہے کہ تنقید کو صرف خوبیوں سے سروکار رکھنا چاہیے۔جبکہ دوسروں کا کہنا ہے کہ اسے صرف خامیوں پر نظر رکھنا چاہیے لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔اچھی تنقید ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد کسی فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کرتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ تنقید نگار کو غیر جانب دار ہونا چاہیے۔لیکن ان تمام باتوں کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ہے خلوص۔تنقید نگار جب کسی تحریر کو تنقید کی کسوٹی ہر پرکھے تو ادب اور فن کی طرف اس کا رویہ مخلصانہ ہونا چاہیے۔

☆☆☆

مولانا حالی بہت پہلے کہہ گئے ہیں کہ:

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

مگر ہمارے زیادہ تر احباب اپنی پرانی روش پر قائم ہیں۔انہیں کوئی نئی چیز اچھی ہی نہیں لگتی۔پرانے موضوعات، پرانا اسلوب.....بس یہی سب انہیں پسند ہے اور اس پر شکوہ کناں ہیں آج افسانے لکھے نہیں جارہے، پڑھے نہیں جارہے، ان پر بات نہیں ہورہی۔ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ اب وقت بدل گیا ہے، زمانہ بدل گیا ہے۔'جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا'۔پہلے خط لکھے جاتے تھے۔ اب موبائل پر بات ہوتی ہے اور میسیج کیے جاتے ہیں۔پہلے تخلیقات قلم سے لکھ کر لفافے میں ڈال کر سپرد

ڈاک کیے جاتے تھے۔آج کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ پر ٹائپ کر کے میل کر دیے جاتے ہیں۔زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب آگیا ہے مگر ہمارے بعض ''مستند'' شاعر اور ادیب نیٹ ورک سے بری طرح گریزاں نظر آتے ہیں۔نئے زمانے کے سورج کی تیز شعاؤں سے ان کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں اور انہیں سامنے کی چیزیں بھی نظر نہیں آرہی ہیں۔آج پہلے سے زیادہ اور بہتر افسانے لکھے جارہے ہیں، پڑھے جارہے ہیں اور ان پر گفتگو بھی ہورہی ہے۔مگر یہ سب دیکھنے کے لئے پہلے آپ کو ماضی کے حجرے سے باہر نکلنا ہوگا۔

☆☆☆

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی ہوگا۔''ثالث۔۱۲'' کو بہت پہلے منظر عام پر آجانا چاہئے تھا لیکن حالات کچھ اس تیزی کے ساتھ کروٹ بدلتے گئے کہ ادارہ چاہ کر بھی اسے وقت پر شایع نہیں کرواسکا۔ اس دوران ہمیں کئی ایسے قیمتی مضامین حاصل ہوئے جو رسالے کے لیے منتخب تو کر لیے گئے لیکن صفحات کی تنگی کی وجہ سے اس شمارے میں شامل نہیں کیے جاسکے۔ان شا اللہ یہ سارے مضامین آئندہ شمارے کی زینت بنائے جائیں گے۔اندر کے صفحات میں اگلے شمارے کی ایک ناتمام جھلک پیش کی جارہی ہے۔

اداریہ میں مشمولہ تخلیقات کا تعارف کرانا کارِعبث ہے۔'کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے۔قاری خود انہیں پڑھ کر اپنی رائے قائم کرسکتا ہے۔اور یہی سب سے بہتر طریقۂ کار ہے۔

الحمد للہ ''ثالث'' ایک رجسٹرڈ رسالہ ہے جس کو ISSN No. حاصل ہے۔اب یہ رسالہ UGC Approved Journal کی فہرست میں بھی شامل ہوگیا ہے۔اس رسالے نے ایک قلیل عرصہ میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور اس نے پوری اردو دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔اس کے لیے ہم اپنے باذوق قارئین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔اس رسالے کی ویب سائٹ کو تادم تحریر پینتالیس ہزار اکتیس (۴۵۰۳۱) سے زیادہ بار وزٹ کیا جاچکا ہے۔آپ بھی درج ذیل لنک پر جاکر اس کے گذشتہ شمارے بالکل مفت پڑھ سکتے ہیں:

www.salismagazine.in

www.facebook.com/salismag

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔(ادارہ)

◂◂ ● ▸▸

● ذوالفقار نقوی

حمد

راز بھی تو ہے رازداں تو ہے
منکشف ہو کے بھی نہاں تو ہے

میری منزل ہے مرا جادہ بھی
میری عقبیٰ مرا جہاں تو ہے

تو سمندر ہے میں ہوں اک قطرہ
میں اکیلا ہوں کارواں تو ہے

ریگزاروں میں پاؤں شل میرے
میں نرا دشت سائباں تو ہے

رات دن میں پھروں سرابوں میں
ہر حقیقت کا ترجماں تو ہے

میں درون و برون سے خارج
ذرے ذرے میں ضوفشاں تو ہے

ہفت اقلیم سلطنت تیری
میں ہوں محکوم حکمراں تو ہے

◂◂ ● ▸▸

● ذوالفقار نقوی

نعت

ضیائے آخری بن کر جو نورِ اولیں آیا
ستاروں نے لیے بوسے کہ ایسا مہ جبیں آیا

زمین و آسماں ہیں ہالۂ نورِ ہدایت میں
رسالت کا امیں آیا نبوت کا نگیں آیا

سرِ محشر صدا آتی ہے یہ رضوانِ جنت کی
گنہگارو چلے آؤ شفیع المذنبیں آیا

ہزاروں ماہِ کنعاں گم ہیں جس کی اک جھلک میں، وہ
جمیل و اجمل و اکمل، حسین و دلنشیں آیا

شبِ اسراء ز آدم تا بہ عیسیٰ ایک ہی صف میں
کھڑے ہیں با ادب سارے امام المرسلیں آیا

◂◂ ● ▸▸

C/o Ayyub Shah
Police Transport Workshop
Channi Himmat
Jammu-180015(J&K)

شفیع الرحمن شفیع

نظر اپنی تلاشِ حسن میں کب سے بھٹکتی ہے
لپکتی ہے ، جھجکتی ، جھپکتی ہے ، ٹپکتی ہے
نہ جانے کون سی بجلی بہر جانب چمکتی ہے
کہ جس کے خوف سے شاخِ شجر پیہم لچکتی ہے
کسی دن موت آنی ہے، بدن سے جان جانی ہے
زباں حق گو نہیں، کیوں قہرِ باطل سے دبکتی ہے؟
جلا کر خاک کردے گی کسی دن پوری بستی کو
لہکتی آگ چاروں سمت سے ، دیکھو، لپکتی ہے
قدم جب ڈگمگائے تو یہ دنیا دیکھتی ، ہنستی
خبر کس کو ہے، کس جانب نظر کس کی بہکتی ہے
خدائی ہر طرف ، ہر چیز میں ، انساں مگر غافل
سویرے کس قدر تسبیح میں چڑیا چہکتی ہے
کہاں گلشن، کہاں گل ہے، مشامِ جاں میں سرشاری
شعورِ حس میں خوش بو آج تک کس کی مہکتی ہے
نظامِ پیکرِ انساں عجب منظر کشی کرتا
کسی کی یاد بن کر چاندنی رخ پر دمکتی ہے
شفیعؔ اس تن کی زینت سے نہیں ملتا سکوں، دیکھا
توجہ روح پر اب ، جو تڑپتی ہے ، سسکتی ہے

◀◀ ● ▶▶

حسن کو ماہتاب لکھتے ہیں
دل کی خاطر کتاب لکھتے ہیں
زندگی تو سمجھ میں آ نہ سکی
پھر بھی روز ایک باب لکھتے ہیں
جب قلم اپنی انگلیوں میں ہو
جو بھی دکھتا، صواب لکھتے ہیں
بیچ کر لوگ بیشتر خامہ
ہر حقیقت کو خواب لکھتے ہیں
غاصب و خائن و ستم گر کو
لوگ عزت مآب لکھتے ہیں
اپنے ہاتھوں سے اپنی قسمت میں
بے تحاشا عذاب لکھتے ہیں
ہم تقاضائے وقت کیا جانیں
صرف اٹکل جواب لکھتے ہیں
روشنی خود نظر کی ناکافی
ہم دھوئیں کو سحاب لکھتے ہیں
دونوں دوشوں پہ دو دبیر شفیعؔ
خیر و شر کے حساب لکھتے ہیں

◀◀ ● ▶▶

Chand Manzil
Nawab Bahadur Road
Patna City-800008 (Bihar)

مرغوب اثر فاطمی

نکتہ شناس صاحبِ میزان چاہئے
مجھ کو ہر ایک سودے میں نقصان چاہئے

رکھّوں گا دیکھ بھال کے اقدامِ غور و فکر
ادراک و اشتیاق کا میدان چاہئے

آفاق کے سفر پہ نکلنے کو ہے جنوں
آگے حیات پیچھے بھی طوفان چاہئے

جس کی طرف یہ ہاتھ بڑھاؤں تپاک سے
راہِ طلب میں ایسا ہی انجان چاہئے

زنبیلِ پشت سے وہ نکالے گا کیمیا
لیکن اُسے شباب پہ بُحران چاہئے

ریشہ دوانیوں سے تری، ناطقہ ہے بند
کہنے کو بچ رہی ہے مِری جان، چاہئے؟

ناکامیوں کے خوف کے سائے نہ مار دیں
تجھ میں اثرؔ قرینۂ ایقان چاہئے

◀◀ ● ▶▶

Road No;7 Mohalla Ali Gunj
Gaya-823001

ڈاکٹر منصور خوشتر

تیر کھا کر مسکرانا چاہئے
حسن کا یوں ناز اٹھانا چاہئے
سربہ کف، نغمہ بہ لب، ہنستے ہوئے
کوچۂ قاتل میں جانا چاہئے
منزلیں پیدا ہوں گردِ راہ سے
حوصلہ ایسا دکھانا چاہئے
راہ کی تاریکیاں ہو جائیں دور
یوں چراغِ دل جلانا چاہئے
خوب ہے آزارِ فرقت کی دوا
لکھ کے نام اُس کا مٹانا چاہئے
اُس کے گھر جاؤں ہمیشہ میں ہی کیوں
اُس کو بھی تو آنا جانا چاہئے
روٹھنا بھی تو ادائے یار ہے
جا کے اے خوشترؔ منانا چاہئے

◀◀ ● ▶▶

Editor"Darbhanga Times"
Purani Munsafi
Post: Lal Bagh
Drabhanga-846004 (Bihar)
Mob:09234772764

ساجد حمید

یہ میں کہتا نہیں کہتی ہے دنیا ٹوٹ جاؤ گے
حسیں آنکھوں پہ مت کرنا بھروسا ٹوٹ جاؤ گے
ابھی آیا نہیں بیشک سلیقہ ٹوٹ جاؤ گے
محبت آپ اپنے سے نہ کرنا ٹوٹ جاؤ گے
وہ دیکھو کہہ رہی ہیں خون میں لتھڑی ہوئی سانسیں
نہ بدلو گے اگر سوچوں کا لہجہ ٹوٹ جاؤ گے
یہاں جینا اگر مشکل ہے مرنا بھی نہیں آساں
لچک پیدا کرو جیون میں ورنہ ٹوٹ جاؤ گے
دھڑکتے دل کی باتیں غور سے سنتے رہو ہر دم
اگر یہ بھی نہیں تم کو گوارا ٹوٹ جاؤ گے
یہ مایا جال ہے جس سے نکلنے کی ضرورت ہے
یہ دنیا ہے یہاں دھوکا ہی دھوکا ٹوٹ جاؤ گے
سنائی دے رہی ہیں آہٹیں سفاک لمحوں کی
جو بے قابو ہوا شوریدہ جذبہ ٹوٹ جاؤ گے
ابھی کچھ کام کرنے ہیں ابھی کچھ رنگ بھرنے ہیں
نہ دیکھو زندگانی کا نوشتہ ٹوٹ جاؤ گے
ضرورت ہے ذرا تخریب کی تعمیر کی خاطر
بنے پھرتے ہو ساجدؔ کیوں فرشتہ ٹوٹ جاؤ گے

◀◀ ● ▶▶

میں سوچتا ہوں اسے روز و شب غلط ہے کیا
بنا بتائے کسی کو سبب غلط ہے کیا
لپٹ کے خواب سے رونے لگی تھی تنہائی
پگھل رہا تھا میں سائے میں جب غلط ہے کیا
خود اپنی خاک اڑانے کی آرزو کی تھی
تم ہی بتاؤ یہ حسنِ طلب غلط ہے کیا
اچھل پڑی تھی مجھے دیکھ کر اداس اداس
اندھیری رات میں بنتِ عنب غلط ہے کیا
میں جانتا تھا پسند اور نا پسند اس کی
بدل نہیں سکا دل پھر بھی ڈھب غلط ہے کیا
میں ہوش ہی میں کہاں تھا ترے حصول کے بعد
ہر اک نگاہ کا کرتا ادب غلط ہے کیا
اچھالتا رہا پانی خلاؤں میں ساجدؔ
یہ ساری عمر رہا تشنہ لب غلط ہے کیا

◀◀ ● ▶▶

ساجد حمید

حواس دینے لگے لو بدن جو قید ہوا
کہ مشکبو تھی فروزاں ختن جو قید ہوا
وہ ایک شوخ شگفتہ سا ریشمی لہجہ
بنا کرخت سرِ انجمن جو قید ہوا
اسے خبر ہی کہاں تھی خود اپنے ہونے کی
وہ اپنی خاک میں تھا موجزن جو قید ہوا
لپٹ کے ہو گئے مدہوش مار زہریلے
مہک رہا تھا وہ صندل بدن جو قید ہوا
کسی نے پوچھا نہ دیکھا جو روح قتل ہوئی
بپا ہے شور یہ کاہے کا تن جو قید ہوا
وہ جال برق سا لہرا کے آ گرا اب کے
بہت اداس ہوئے گل، چمن جو قید ہوا
کس احتیاط سے ساجدؔ نظر سنبھالی تھی
مگر یہ کیا کہ ترا حسن ظن جو قید ہوا

◀◀ ● ▶▶

شکستہ موسموں سے استفادہ ہی غلط تھا
نئی دنیا بسانے کا ارادہ ہی غلط تھا
ندامت سے مری آنکھیں جھکی ہیں، ذہن میرا
تسلی دے رہا ہے کرنا وعدہ ہی غلط تھا
سمجھتے کیوں نہیں، سوچوں پہ کیا پہرے لگے ہیں
جہاں ہم نے جبیں رکھی وہ جادہ ہی غلط تھا
اگر تجھ کو یقیں آتا نہیں مہتاب سے پوچھ
بدن پر یاد کے کل شب لبادہ ہی غلط تھا
نشہ اترے گا جب تیری سمجھ میں آئے گا سب
پرستش تو نے کی جس کی وہ بادہ ہی غلط تھا
اندھیری رات تھی، لمبا سفر، میں پا پیادہ
ہوا جو سہو مجھ سے کچھ زیادہ ہی غلط تھا
زمانے کی نگاہوں کو نہ جانے کب تو سمجھے
مرے ساجدؔ یوں دل کرنا کشادہ ہی غلط تھا

◀◀ ● ▶▶

S.M..Manzil
18th cross
R.ML Nagar
Shimoga-577202(Karnataka)
Mob:0944955592

شکیل جمالی

نہ کوئی خواب کمایا نہ آنکھ خالی ہوئی
تمہارے ساتھ ہماری بھی رات کالی ہوئی

خدا کا شکر ادا کر وہ بے وفا نکلا
خوشی منا کہ تری جان کی بحالی ہوئی

ذرا سے خواب بُنے تھے کہ سانس پھول گئی
قدم دکاں پہ رکھا کہ جیب خالی ہوئی

وفا کے بارے میں لوگوں کی رائے ٹھیک نہیں
برادری سے یہ خاتون ہے نکالی ہوئی

تمھی تو سر پہ بٹھائے ہوئے تھے دنیا کو
تمھی پہ بھونک رہی ہے تمہاری پالی ہوئی

میں کیسے دیکھوں رواداریوں کو مٹتے ہوئے
یہ داغ بیل ہے میرے بڑوں کی ڈالی ہوئی

جو اہلِ نقد و نظر ہیں اِدھر بھی غور کریں
کہ یہ غزل بھی ہے ترکیب سے نکالی ہوئی

یہ قافیہ بڑی دقت کے ساتھ نظم ہوا
بڑے ہنر سے یہ عورت مسز جمالی ہوئی

◀◀ ● ▶▶

165-B-2,First floor
Hadi Appartment
Joga Bai Jamia Nagar
New Delhi-110025

شہزاد انجم برہانی

دشت میں خاک اڑا رکھی ہے
یار نے دھوم مچا رکھی ہے

آپ سمجھایئے مایوسی کو
ہم نے امیّد لگا رکھی ہے

کس نے سوچا تھا کہ مرجاؤں گا
میز پر اب بھی دوا رکھّی ہے

لڑکھڑاتا ہوں میں کمزوری سے
وہ سمجھتا ہے لگا رکھّی ہے

دل لگانے کی حماقت نہ کرو
طاق پہ رسمِ وفا رکھّی ہے

ایک اُمیّد ابھی زندہ ہے
ایک تدبیر بچا رکھّی ہے

کون ہے خادمِ اردو، صاحب!
سب نے دوکان لگا رکھّی ہے

چین سے بیٹھ کے کھاسکتا ہوں
اتنی عزت تو کما رکھّی ہے

◀◀ ● ▶▶

سچ کی آواز کا سولی پہ رد ہے، حد ہے
تم اگر جھوٹ بھی بولو تو سند ہے، حد ہے

تم تو سورج تھے پہ حیرت ہے مجھے وقت زوال
اک دیئے سے تمہیں اس درجہ حسد ہے، حد ہے

میں کہ مسجود ملائک تھا کبھی داور حشر
میرے اعمال پر ان سے ہی مدد ہے، حد ہے

جن چراغوں سے منور ہے مری ظلمتِ شب
روشنی سے مری آج ان کو ہی کد ہے، حد ہے

ہم تو بربادی کا سامان کیے بیٹھے تھے
مسلکِ عشق و وفا میں یہاں حد ہے؟ حد ہے

انجم اس شہر کو دعویٰ تھا زباں دانی کا
شاعر اس شہر میں تو ایک عدد ہے؟ حد ہے

◀◀ ● ▶▶

دنیا اپنی موت جلد از جلد مر جانے کو ہے
اب یہ ڈھانچہ ایسا لگتا ہے بکھر جانے کو ہے

عین اس دم نیشتر لے آتی ہیں یادیں تری
زخم تنہائی کا لگتا ہے کہ بھر جانے کو ہے

جانے والے اور کچھ دن سوگ کرنا ہے ترا
ذہن و دل سے پھر یہ نشہ بھی اتر جانے کو ہے

ہم حقیقت آشنا لوگوں سے کم ملتے ہیں لوگ
ان کو سمجھاؤ یہ شیرازہ بکھر جانے کو ہے

وقت رخصت بدگمانی تیری ایسا گھاؤ تھی
رفتہ رفتہ اب جو اپنا کام کر جانے کو ہے

رت ہوا بدلے گی سب گل شاخ پر مرجائیں گے
اب یہ موسم خوشبوؤں کا پر کتر جانے کو ہے

◀◀ ● ▶▶

Near Masjid Nawab Saheb
Chandra Kala
Burhanpur(M.P)
Mob:8770786313

کیا کیا ہے تھیلے میں تیرے سوداگر ؟
خوشیاں ہوں تو ہم کو بھی دے سوداگر

تیری دولت تجھ کو مبارک ؛ کیوں بیچیں
ٹوٹے پھوٹے خواب ہمارے سوداگر

آیا ہے کیوں شہرِ غریباں میں، شاید
جائے خالی ہاتھ یہاں سے سودا گر

تو نے کیسے خواب تھمائے ہم کو یہ
ٹوٹے پھوٹے الجھے الجھے سوداگر

آنکھیں کان کھلے رکھّو ہشیار رہو
ٹھگنے کو تیار ہیں سارے سوداگر

یوسف تیری بولی لگائے گا اب یاں
مصر کا یہ بازار نہیں رے سودا گر

قیمت ہے جیسی تو ویسا مال بھی دے
تو لے گا کیا کھوٹے سکّے ،سوداگر

بے چہرا لوگوں کی بستی میں پیارے
کون خریدے گا آئینے سوداگر

دے کے چراغِ کہنہ لے لو دیپ نئے
جانے کیوں چلّاتا گھومے سوداگر

جان کے بدلے جنت کا سودا منظور
ہم ہیں بس سوداء تیرے سوداگر

دنیا ہے بازار یہاں پر ارشدؔ جی
کچھ جھوٹے تو کچھ ہیں سچّے سوداگر

◀◀ ● ▶▶

شہرِ دل کو اس طرح زیرو زبر اس نے کیا
قریۂ رنگیں کو اک اجڑا نگر اس نے کیا

اک تصور ہی ترا تھا دوست اور ہمدم مرا
اس شبِ ہجراں کو میری مختصر، اس نے کیا

ہاں یہ نادانی ہے میرے دل کی، میرے دوستو
سنگِ خارا کو مرا نورِ نظر اس نے کیا

کر نہ پایا شیشہ رو، کم ظرف، ضبطِ غم ذرا
حالتِ دل سے جہاں کو باخبر اس نے کیا

چشمِ گریاں کا برا ہو، جان سے پیارے مرے
بیش قیمت آنسوؤں کو دربدر اس نے کیا

جانتا تھا دل مآلِ جادۂ الفت مگر
پھر بھی اس پر پاؤں رکھنے کو ہنر اس نے کیا

عمر بھر چلتا رہا ارشدؔ مخالف سمت میں
رائیگاں تھا سب کا سب جتنا سفر اس نے کیا

◀◀ ● ▶▶

C/O Fazeel Arshad Khan
Teacher's Colony
Khamgaon 444303
Dist-Buldana
Maharashtra

وفا نقوی

ختم ہوں گی کبھی دل کی امنگیں شاید
یوں ہی پرواز کریں گی یہ پتنگیں شاید

وہ جو سرحد پہ ہیں مضبوط فصیلیں تعمیر
اُن کے نیچے بھی کئی ہوں گی سرنگیں شاید

ختم ہوجائے گی آبادء انساں لیکن
ختم ہوں گی نہ کبھی آپسی جنگیں شاید

ڈور تھامے رہو امیّد کی مرتے دم تک
لوٹ آجائیں کٹی ساری پتنگیں شاید

کال پر کال مرے دل پہ اچانک ارشدؔ
ہیں کسی شوخ کے دل کی یہ ترنگیں شاید

◀◀ ● ▶▶

عجب سی صورتیں چاروں طرف ہیں
خدا جانے کہ ہم کس کے حدف ہیں

تمہارے قرب کا موسم تو آئے
بھلا سکتے ہیں ہم جتنے حلف ہیں

محاذِ جنگ ہے دنیا کا ایسا
جہاں ہم خود اکیلے خود ہی صف ہیں

کہاں قطرہ گرائے آبِ نیساں
دہن کھولے ہوئے کتنے صدف ہیں

بنائے جا رہے ہیں نقش اب بھی
زمیں اوڑھے ہوئے جتنے سلف ہیں

صدائے صور بھی پھوٹے گی ان سے
ابھی نغمہ کناں جو میرے دف ہیں

ہمیں دشمن کو بھی دینا ہے پانی
ہمارے سامنے شاہِ نجف ہیں

ہمارے ہی لہو کا دشت پیاسا
ہمیں ہیں جو زمیں پر سر بکف ہیں

ابھی سورج پہ جانی ہے یہ مٹّی
ابھی خوابوں کے کچھ باقی شرف ہیں

◀◀ ● ▶▶

H.No:4/114,Nagla Mallah
Civil Lines
Aligarh-202002 (U.P)

● ڈاکٹر منظر اعجاز

اجالوں کی سیاہی کا منظرنامہ

عبدالصمد کے تخلیقی کردار اور قلم کی سمت ورفتار کو دیکھتے ہوئے لامحالہ یہ خیال آتا ہے کہ افسانہ نگار عبدالصمد پر ناول نگار عبدالصمد نے سبقت حاصل کر لی ہے۔ ادھر تین چار برسوں میں ان کے تین ناول نظر سے گزرے ہیں ''بکھرے اوراق''، ''شکست کی آواز'' اور ''اجالوں کی سیاہی''۔ پہلے اور دوسرے ناول کے تاثرات ابھی حافظے سے محو بھی نہیں ہوئے کہ تیسرا ناول سامنے آ گیا۔ یہ تیسرا ناول ''اجالوں کی سیاہی'' ایک دوسرے زود نویس ناول نگار مشرف عالم ذوقی کے نام معنون ہے۔ اس مشترک تخلیقی میلان کے علاوہ بھی ان دونوں میں اشتراک فکر ونظر کے کئی پہلو ہیں اور ان دونوں میں چند باتیں مابہ الامتیاز بھی ہیں، لیکن یہاں میرا مقصد ان دونوں کا موازنہ نہیں۔ پھر بھی یہ عرض کر دینا غالباً بے محل نہ ہوگا کہ دونوں معاشرتی مسائل کی گتھیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ گتھیاں سلجھتی تو نہیں لیکن الجھیڑے قابل فہم ضرور ہو جاتے ہیں۔

عبدالصمد کا ناول ''اجالوں کی سیاہی'' انہی مسائل کی گتھیوں اور قابل فہم الجھیڑوں پر مشتمل ہے، جن میں چند سیاست گزیدہ صحافتی مصطلحات نمایاں ہیں۔ مثلاً لو جہاد، دہشت گرد، آتنک واد اور آتنکی وغیرہ۔ ناول کے قصے کا آغاز پیش امام وخطیب مسجد مولوی فضل امام کے چھوٹے بیٹے فہیم کے جذبہ ناشناس کے اظہار سے ہوتا ہے۔ جذبہ ناشناس اس لیے کہ خود فہیم اور فریق مخالف روپا بھی نہیں سمجھ پاتی کہ یہ کیا ہے؟ تاہم فہیم مبینہ طور پر دوستی کا ایک فرضی سا نام دے لیتا ہے اور سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو روپا بھی اسے باور کر لیتی ہے۔ حالانکہ لو جہاد کی اصطلاح اور اس کی تعبیر وتشریح جو وہ خود اپنے گھر میں خاص طور سے بھائیوں سے سنتی رہتی ہے، اس سے متوحش بھی رہتی ہے اور فہیم کی مفروضہ دوستی کو مسترد بھی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تنبیہ وتاکید بھی کرتی ہے، لیکن چاہنے اور چاہے جانے کا ایک فطری جذبہ تو ہر انسان میں ہوتا ہے جو اسے مذہب، مسلک، نسل، رنگ اور علاقائیت سے بالاتر کر دیتا ہے۔ فہیم اور روپا تو خیر پڑوسی ہیں۔ احتیاج کے پاؤں میں احتیاط کی بیڑیاں پہنانے کے باوجود چاہے اور چاہے جانے کا فطری جذبہ نمو پذیر رہتا ہے جو کبھی محبت سے موسوم نہیں ہو پاتا اور اسے دوستی سے بڑھ کر کوئی نام نہیں دیا جاتا۔ فہیم بھی روبرو ملاقات یا سیل فون پر رابطہ کے دوران دوستی کے حدود سے تجاوز کرنے والا کوئی لفظ استعمال نہیں کرتا۔

اس کی گفتگو یا رویے سے وہ خصوصیات سامنے نہیں آتیں، وہ اوصاف ظاہر نہیں ہوتے جو روپا کے بھائیوں کی تشریح وتعبیر کے مطابق 'لو جہادیوں' میں پائے جاتے ہیں۔ اس لیے اپنے دیکھے بھالے اور سوچے سمجھے یعنی مشاہدات وتجربات کی بنیاد پر وہ فہیم کو ایک اچھا اور سچا دوست تسلیم کر لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس لیے وہ خود بھی فہیم سے رابطے کا سلسلہ منقطع نہیں کرتی۔ اس طرح دونوں معاشرتی نظام اور اس کے نشیب وفراز سے چشم پوشی نہ کرتے ہوئے بھی مراسم دوستانہ برقرار رکھتے ہیں اور محتاط رویے کے ساتھ یہ سلسلہ قائم رہتا ہے۔

میرے خیال میں یہ ایک افسانے کا موضوع تھا اور اس موضوع پر ایک افسانہ بُنا جا سکتا تھا۔ لیکن اس قسم کے چند موضوعات اور بھی عبدالصمد کے پیش نظر تھے جنہیں جوڑ توڑ اور کاٹ چھانٹ کر انہوں نے ناول کے قدرے وسیع کینوس پر اتارنے کی فنی کاوش ہے، جس میں واقعات و واردات اور مسائل حیات وکائنات ہی نمایاں نظر آتے ہیں۔

مولوی فضل امام کوئی عالم فاضل قسم کے آدمی نہیں لیکن ان کی ذات بابرکات اپنے علاقے میں غنیمت ہے کہ نماز پنجگانہ کی امامت کا سزاوار بھی ان سے بہتر یا ان جیسا اس علاقے میں کوئی دوسرا نہیں۔ نمازیوں کی نظر میں وہ معتبر ومحترم ہیں۔ مسجد ہی کے صحن میں کچھ بچوں کو بھی پڑھاتے ہیں اور مختصر سی آمدنی میں قناعت پسندی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی بیوی زیب النسا بھی راضی بہ رضا نظر آتی ہیں۔ اس لیے فضل امام کو اپنی مفلسی اور ناداری وحشت زدہ نہیں کرتی البتہ اولاد کی فکر کس باپ کو نہیں ہوتی، انہیں بھی فہیم کا دن بھر غائب رہنا پریشان کرتا ہے، اس کی سرگرمیوں کا بھی انہیں کوئی علم نہیں۔ بڑا بیٹا قسیم کسی دوسرے شہر میں رہتا ہے اور کبھی کبھار اپنے والدین کو اپنی صورت دکھا جاتا ہے۔ اس کے سر بھی والدین کی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہی غنیمت ہے کہ وہ خود کفیل ہے، والدین کے سر کا بوجھ نہیں۔

مولوی فضل امام کی مصروفیات اس محاورے کے عین مطابق ہیں کہ ''ملا کی دوڑ مسجد تک''۔ نماز کا وقت ہوتا ہے تو گھر سے نکلتے ہیں۔ خود ہی اذان دیتے ہیں اور نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ محلے پڑوس کے بیس پچیس مصلی مقتدی بن جاتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی مقتدی چائے کے لیے مدعو کرتا ہے تو مسجد سے متصل چائے خانے میں تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر وہاں کوئی دین وشریعت سے متعلق کچھ استفسار کرتا ہے تو اپنے علم ومعلومات کی کوئی چھینٹ اڑا دیتے ہیں۔ سماجی یا سیاسی مسائل پر گفتگو چھڑتی ہے تو بے رغبتی سے سنتے ہیں گویا چائے کا خمیازہ بھگت رہے ہوں، استفسار پر ہاں، ہوں کے اسلوب میں زبان کھولتے اور جواب دیتے ہیں۔ دینی اور شرعی امور میں وہ گہرا درک نہیں رکھتے۔ وہ ایک عام انسان اور صوم و

صلوۃ کے پابند مسلمان ہیں۔ ان جیسا ان کے مسلم معاشرے میں کوئی دوسرا نہیں۔ مسلمان ان کے پیچھے اسی مسجد میں عیدین کی نمازیں بھی ادا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی شخصیت واجب التعظیم سمجھی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ معاشرہ اور ماحول پس ماندگی کا مظہر ہے۔ موجودہ دور میں بھی ایسے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے شہر یا گاؤں میں جن کی مسجدوں میں کوئی عالم، فاضل، حافظ یا قاری امامت کے لیے ملازم نہیں رکھے جاتے ہیں۔ البتہ ماہ صیام میں تراویح کی امامت کے لیے نزدودور سے حافظ بلوائے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا بھی کم ہی ہوتا ہے۔ اپنے اپنے طور پر بھی یعنی بغیر کسی امام کے نماز تراویح ادا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں مفلسی و ناداری ہو اور چندہ رقم سے بھی کسی امام کی کفالت ممکن نہ ہو، وہاں امامت کے لیے باضابطہ اور مستقل امام تو رکھے نہیں جاسکتے۔ غالباً مسلم معاشرہ کی پس ماندگی کے اظہار کے لیے ہی عبدالصمد نے اس ماحول اور معاشرہ کا انتخاب کیا ہے۔

عبدالصمد نے اس قصہ مختصر کو طول دینے کے لیے بعض واقعات عصری صحافتی صورت حال سے بھی اخذ کیے ہیں اور بعض کردار اسی مسلم معاشرہ کی مٹی سے گڑھے ہیں۔ اس ناول میں چودھری شرف الدین کے کردار سے نہ صرف یہ کہ ناول کی شکم پری کے مواقع ہاتھ آگئے ہیں بلکہ مولوی فضل امام کے لیے بھی کچھ آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ چودھری شرف الدین بقول راوی:

''علاقے کے امیر ترین آدمی تھے، بہت سے شہروں میں ان کے بزنس پھیلے ہوئے تھے۔ وہ زیادہ تر اپنے تجارتی دورے ہی پر رہتے۔ مسجد میں بھی انہوں نے حال ہی میں آنا شروع کیا تھا جب انہوں نے داڑھی رکھ لی تھی اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے۔ ویسے مسجد میں بھی ان کی امارت کا سب پر رعب طاری رہتا۔ انہیں دیکھ کر لوگ اٹھنے کی کوشش کرتے اور ان کے لیے اگلی صف میں جگہ خالی کردیتے، اگرچہ چودھری صاحب ان باتوں کے لیے منع کرتے تھے اور وہ جہاں جگہ ملتی، وہاں بیٹھ جاتے، مگر لوگ کہاں مانتے تھے۔'' (ص ۴۲-۴۳)

دولت و امارت سے متعین چودھری شرف الدین کی سماجی حیثیت انہیں خدا خانے میں لائق احترام اور واجب التعظیم بناتی ہے اور فلاکت زدہ مسلمانوں کا یہ معاشرہ چاندی سونے کے بت کی پرستش کی طرف مائل دکھائی دیتا ہے۔ یہاں محسوس ہوتا ہے کہ عبدالصمد نے اجتماعی نفسیات کی گرہ کشائی کے لیے چودھری شرف الدین کا کردار گڑھا ہے۔

معاشرتی رویے کا ایک دوسرا پہلو دوسرے انداز سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ ہے چودھری شرف الدین کی اصلاح معاشرہ کی طرف پیش رفت۔ لیکن اس سے پہلے وہ چھٹیوں میں آئے ہوئے اپنے پوتے

پوتیوں کو قرآن اور اردو کا قاعدہ پڑھانے کے لیے منہ مانگی اجرت کی پیشکش کرتے ہوئے مولوی فضل امام کو راضی کرتے ہیں۔ اسی دوران خود ان میں بھی قرآن پڑھنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ اس پیشکش کو بھی بادل نا خواستہ مولوی صاحب قبول کرلیتے ہیں۔ حالانکہ بہت ہی واضح طور پر بتادیتے ہیں کہ مسجد کی چٹائی پر بیٹھ کر انہوں نے کٹرمٹر پڑھا ہے۔ وہ بہت پڑھے لکھے آدمی نہیں لیکن چودھری شرف الدین تو رومن رسم الخط کے قرآن خواں ہیں اس لیے کسی بھی لفظ کے تلفظ کی ادائیگی اور کسی بھی عبارت کی قرأت درست نہیں چنانچہ مولوی فضل امام انہیں از سر نو پڑھاتے ہیں۔ مولوی صاحب کو اپنا ایک بہتر سامع سمجھ کر چودھری صاحب اپنے تصورات و تخیلات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ قوم کی ناگفتہ بہ حالت سے تفکر اور تردد میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کچھ باتیں معقول ہوتی ہیں اور مولوی صاحب کو قائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بعض باتیں اوپر سے گزر جاتی ہیں اور ہاں ہوں کے سوا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ مولوی فضل امام کی سادہ لوحی کا اندازہ لگانے کے لیے ذیل کے اقتباسات کافی ہوں گے:

''آپ نے غور کیا ہے مولوی صاحب، مسجد کے آس پاس جو چائے خانے ہیں، جنہیں میں چنڈو خانے کہتا ہوں، وہ ہر وقت بھرے رہتے ہیں اور وہاں سے شور وغل کی عجیب آوازیں آتی رہتی ہیں.....؟

چودھری صاحب نے اچانک ان سے دریافت کیا۔ فضل امام تائید میں صرف سر ہلا کر رہ گئے۔ وہ ان چائے خانوں میں باقاعدہ جانے والوں میں شامل نہیں تھے بلکہ خود سے شاید وہ کبھی نہیں گئے تھے، کوئی انہیں مدعو کر کے لے جاتا اور بس۔''

چودھری شرف الدین سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنا مدعا یوں بیان فرماتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم لوگ چنڈو خانوں سے اپنے آپ کو آزاد کرلیں تو بہت سی مصیبتوں سے ہمیں خود بہ خود نجات مل جائے گی۔ وہاں سوائے ذہنوں کے آلودہ کرنے اور غلط سلط باتوں کو اپنے اندر داخل کرنے اور انہیں یقین کا جامہ پہنانے کے اور تو کوئی کام ہوتا نہیں.....

مولوی فضل امام فوری طور پر فیصلہ نہیں کرسکے کہ چودھری صاحب صحیح کہہ رہے ہیں یا غلط۔ وہ جب بھی بقول چودھری صاحب 'چنڈو خانے' میں جاتے تھے تو وہاں کی گفتگو انہیں بہت اچھی لگتی تھی۔ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ جو لوگ معمولی نظر آتے ہیں، وہ یہاں بیٹھ کر کس قدر اچھی باتیں کرتے ہیں، اپنی جانکاری کا کتنا ثبوت دیتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ دنیا بھر میں سبز جھنڈا لہرا رہا ہے یا جلد ہی لہرائے گا۔ تاریخ میں جن گھوڑوں کی ٹاپ سے ملکوں کے ملک فتح یاب ہوئے تھے، ان کی دھمک ان کی گفتگو سے صاف سنائی دیتی۔ لیکن اب جب کہ چودھری صاحب ان باتوں کی اصلیت سے پردہ اٹھا رہے تھے تو

انہیں لگتا کہ چودھری صاحب کی باتوں میں سچائی ہی سچائی بھری ہے.....(ص ۶۹)

ظاہر ہے کہ مولوی فضل امام کی سماجی حیثیت، اکتسابی نوعیت اور علمی بصیرت کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ چائے خانوں میں گپیں ہانکنے والوں کا مزاج و مذاق اور روایتی انداز نظر بھی عام سی بات ہے۔ اس قسم کے چائے خانے جہاں بھی ہوں تفریح گاہ کی حیثیت اختیار کیے ہوتے ہیں۔ چند لوگ چائے کے بہانے اکٹھے ہو کر خوش گپیوں میں فاضل وقت کا نمٹارا کر لیتے ہیں اور اکثر نشہ آور گفتگو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ عبدالصمد نے ''سبز جھنڈا'' کے حوالے سے یہی تاثر دیا ہے۔

دراصل تاریخ کو تفریح کا سامان یعنی افسانہ بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے اور ایسا بھی ہوا ہے کہ افسانے کو تاریخ کا لبادہ پہنا کر جز و ایقان و ایمان بنانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ویسے بھی پسماندہ اور شکست خوردہ قوموں کے نفسیاتی تجزیے سے یہ بات سامنے آتی رہی ہے کہ حال کی ناموافق و نامساعدت انہیں ماضی کی شاندار روایت پناہ گاہ فراہم کرتی ہے۔ مولوی فضل امام سیدھے سادے بھولے بھالے عوام کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ بیچارے تاریخ اور افسانے کا فرق کیا جانیں۔ ویسے بھی عزلت گزینی اور گوشہ نشینی ان کے مزاج و مذاق کا خاصہ ہے۔ پانچ وقت کی نماز، نماز کی امامت اور مسجد کی صاف صفائی اور خدمت انہیں گھر سے باہر قدم رکھنے پر مجبور کرتی ہے ورنہ ان مصروفیات کے علاوہ تو وہ خانہ نشیں ہی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فہیم دن بھر کیا کرتا ہے؟ کہاں مارا مارا پھرتا ہے؟ فری شپ کے باوجود وہ اپنی پڑھائی میں کتنی دلچسپی لیتا ہے؟ یہ سوالات مولوی فضل امام کے دل و دماغ میں سر تو ضرور ابھارتے ہیں لیکن وہ فہیم کی خبر گیری کے لیے کسی سرگرمی کا پتا نہیں دیتے۔ بڑے بیٹے قسیم کے بارے میں بھی انہیں بس اس قدر معلوم ہے کہ وہ کسی شہر میں کوئی کام کرتا ہے، خود کفیل ہے۔ وہ اپنے والدین کے سر کا بوجھ نہیں لیکن اگر کبھی اپنے گھر آتا ہے تو اس میں عجیب قسم کی پیاس دکھائی دیتی ہے۔ وہ دین و مذہب اور شریعت کے متعلق اپنے والد سے ایسے ایسے سوالات کرتا ہے کہ وہ متوحش سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے اس لیے اپنی دانست کے مطابق اس کی ملاقات ایک مولانا سے کراتے ہیں، لیکن اس کے سوالوں کا شافی جواب وہاں بھی نہیں ملتا اور اس کی پیاس برقرار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پیاس کی یہ شدت اسے ایک قسم کے جنون میں مبتلا کر دیتی ہے۔

چودھری شرف الدین کی پذیرائی اور دل دہی سے کسی حد تک مولوی فضل امام کی معاشی حالت بہتر ہو جاتی ہے اور ان کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی دلبستگی اس احساس سے بھی ہوتی ہے کہ علاقے کا ایک بڑا بزنس مین اور دولت مند آدمی ان کا قدردان ہے۔ لیکن مولوی فضل امام سے اپنے

پوتے پوتیوں کو درس دلانے اور خود درس لینے کے علاوہ چودھری شرف الدین انہیں دنیا داری کے امور میں خود بھی درس دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اپنا ہم خیال بنا کر معاشرے کی اصلاحی سرگرمیوں میں ان سے تعاون کے خواست گار رہتے ہیں۔ ان کی گفتگو سے تو کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ مولوی فضل امام کی مسلمانوں کی امامت اور چودھری شرف الدین کی معاشرتی اور سیاسی قیادت کا اتحاد ہو جائے تو نا خواندہ اور پس ماندہ مسلمانوں کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ وہ اپنے تجربات و مشاہدات یا اپنے خیالات کا اظہار دور اندیشانہ انداز میں اس طور پر بھی کرتے ہیں کہ ان میں ناول نگار کے نقطہ نظر کی جھلک ہم آہنگی اختیار کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ عصری صورت حال کی جھلک بھی نمایاں ہوتی ہے۔ چودھری شرف الدین ایک موقع پر مولوی فضل امام کو یوں مخاطب کرتے ہیں:

''اور جانتے ہیں مولوی صاحب، بے سر پیر کی باتیں کرنے سے ہم اپنے لیے مصیبت ہی مول لیتے ہیں، دوسروں کو کیا پتا کہ ہماری باتیں ایک دم کھوکھلی ہیں اور محض فریب پیہم جو ہم اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لیے گڑھ لیتے ہیں، وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ ضرور ان باتوں کا تانا بانا کہیں اور سے ملتا ہے اور ضرور ہی یہ باتیں کہیں سے چھن چھن کر سامنے آتی ہیں.....'' (ص ۷۰)

ایسا ہی ایک واقعہ مولوی فضل امام کو یاد آتا ہے جس کی بنیاد پر وہ چودھری صاحب سے نہ صرف اتفاق کا اظہار کرتے ہیں بلکہ اس طرح تائید فرماتے ہیں:

''بالکل صحیح فرما رہے ہیں حضور، تجربے میں بھی یہ بات آئی ہے کہ ہم خواہ مخواہ مصیبتوں کو دعوت دیتے پھرتے ہیں.....'' (ص ۷۰)

ناول نگار کا اشارہ واضح ہے۔ ان مکالموں میں اجمالاً جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کی تفصیلات اخبارات و رسائل اور مختلف ٹی وی چینلوں کے ریکارڈ میں بھی محفوظ ہیں۔ بہر حال، مولوی فضل امام کی تائید سے ہم خیالی تو مترشح ہوتی ہے۔ چنانچہ:

''چودھری صاحب کے چہرے پر اپنا ایک ہم خیال پا کے سرخی سی آ گئی، وہ بولے: 'جو طاقت ہم فضول اور مہمل باتوں میں لگا دیتے ہیں، انہیں اگر کچھ تعمیری کاموں میں لگائیں تو اپنا بھی بھلا ہو اور قوم کا بھی فائدہ ہو.....''

انفرادی اور اجتماعی مفاد اور قومی دردمندی کے خوش کن اس خیال پر بطور ردعمل کوئی استفہامیہ جملہ حد ادب کے پاس و لحاظ کی وجہ سے مولوی صاحب کی زبان سے نہیں نکلتا، لیکن چہرے پر استفہامیہ رنگ نمودار ہوتا ہے جسے دیکھ کر وہ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپ کہیں گے، ان لوگوں کو، خاص طور پر لڑکوں کو کام کہاں ملتا ہے، ارے بھائی لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ بس نوکری ہی ایک کام ہے، کسی طرح سے بھی نوکری حاصل کرلو، پھر چین سے رہو، اس لیے کہ محنت جو بھی ہوتی ہے، وہ تو نوکری حاصل کرنے سے پہلے ہوتی ہے، اس کے بعد محنت کہاں.....؟(ص ۱۷)

موجودہ معاشی اور سماجی حالات اور اجتماعی نفسیات کی اس عکاسی میں واقعیت ہی واقعیت ہے۔ ویسے بھی عبدالصمد نے واقعیت شعاری کو فنکارانہ شعور سے ہم آہنگ کر کے اس ناول کی تخلیق کی ہے۔ انہوں نے فن کارانہ تخیلات سے کام لے کر واقعات و واردات گڑھے نہیں ہیں اور جو واقعات وواردات پیش کیے گئے ہیں وہ بالعموم تاریخ وصحافت کا حصہ ہیں جن کو سلیقہ شعار ہنرمندی سے ترتیب دے کر ادب کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نکتہ رسی بھی ابھرتی رہی ہے جس سے عمومی تاثرات میں گہرائی اور گیرائی بھی پیدا ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر خود چودھری شرف الدین اپنی کامیاب تجارت کا حوالہ دیتے ہیں یا کسی غیر متعلق فرد کی ایک سو روپے سے مدد کرتے ہیں اور وہ معمولی قسم کی تجارت سے ایک ہفتے میں ایک سو کے ایک ہزار بنالیتا ہے۔ مولوی فضل امام تجارت میں برکت کے ایمان وایقان کے قائل ہیں۔ پھر بھی مولوی صاحب کیا، کوئی عام آدمی اسے تسلیم بھی کرلے تو بطور قاعدہ کلیہ اسے تسلیم نہیں کرسکتا۔ خاص طور سے وہ معاشرہ اور قوم جس کے لیے ہمدردی اور دردمندی کا جذبہ چودھری صاحب کے سینے میں موجزن دکھائی دیتا ہے۔

اسی نشست کی گفتگو کے دوران چودھری شرف الدین کئی ایسے تلخ حقائق بیان فرماتے ہیں جن سے چودھری صاحب کی ہمہ دانی پر مولوی صاحب کو ایک طرف رشک آتا ہے تو دوسری طرف ناگواری کے اثرات بھی چہرے سے عیاں ہوتے ہیں لیکن چودھری صاحب کی مرعوب کن شخصیت کا لحاظ کرتے ہوئے وہ ان کی باتوں کو گویا زہر مار کر لیتے ہیں۔ ان کے چہرے پر مسکینیت ابھر آتی ہے۔ چودھری صاحب اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہتے۔ وہ خود بھی سنبھلتے اور مولوی صاحب کو بھی سنبھالتے ہیں، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے مترشح ہے:

''آپ ذرا غور فرمایئے، بیکاری، جہالت، فضول چیزوں سے رغبت، مذہب کی غلط تشریح اور سمجھ نے ہمیں آج کہاں پہنچادیا ہے۔ جہنم میں.....''

''ہاں اور کیا۔ آپ کا جو یہ خودکش دستہ ہے، وہ آپ کو کہاں لے جارہا ہے، سوچا ہے آپ نے.....؟''

''میں آپ کو نہیں کہہ رہا ہوں بھائی، میرا مطلب ہے یہ لوگ ہمارے ہی

بچے ہیں نا، خود بھی جہنم میں جارہے ہیں، ہمیں بھی دھکیل رہے ہیں.....'' (ص ۷۳)

ایک دوسرے موقع پر چودھری شرف الدین اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں مولوی فضل صاحب کہ میں قوم کی اصلاح کے لیے نکل پڑوں، اس کی فکر ہرگز نہ کروں کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا، شاید میری بات کسی کے دل میں اتر جائے۔'' (ص ۱۱۰)

چودھری شرف الدین کے کردار میں کسی حد تک سیاسی سمت ورفتار کی جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے ماضی کی داستان جو موقع بہ موقع سنائی ہے یعنی کہ وہ معمولی آدمی تھے لیکن دوراندیش اور زمانہ شناس تھے۔ بزنس شروع کیا اور اسے ترقی دی۔ اسی ترقی سے خود ان کی ترقی کا دور شروع ہوا اور دنیا بھر کی دولت کمائی۔ یہ دولت اولاد کے حال ومستقبل کو سنوارنے میں بھی لگائی، جو اَب مغربی ملکوں میں عیش کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا بنگلہ بھی بنوایا۔ نوکر چاکر اور ملازم رکھے اور شان وشوکت کی زندگی گزارنے لگے۔ اخیر عمر میں آخرت کا خیال آیا تو دین کی طرف مائل ہوئے اور اب انہیں قوم کا درد ستانے لگا ہے۔

مولوی فضل امام سے اپنے اصلاحی مقصد کی تائید پاکر وہ پرجوش ہوجاتے ہیں اور اسی وقت اصلاح قوم کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کچھ متامل بھی ہوتے ہیں اور بادل ناخواستہ ان کے ساتھ نکل پڑتے ہیں۔

چودھری شرف الدین کے کردار میں عبدالصمد کے ایک سابقہ ناول کے مرکزی کردار کی جھلک ملتی ہے جو زندگی بھر تو اپنی دنیا اور دنیاداری میں گم رہتا ہے لیکن جب مخالف معاشرے کا کوئی فرد آئینہ دکھاتا ہے تو اسے معاشرتی اعتبار سے اپنی مسخ شدہ شناخت اور تشخص کا احساس ہوتا ہے اور تب وہ مسجد کا رخ کرتا ہے اور قوم کی قیادت کے لیے آگے قدم بڑھاتا ہے، لیکن صلاحیت اور قابلیت کے فقدان کی وجہ سے اس کی چودھراہٹ کھوٹا سکہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کردار سے کچھ ملتا جلتا اور کچھ مختلف کردار ''اجالوں کی سیاہی'' میں چودھری شرف الدین کا ہے۔

عصر اور مغرب کے درمیان چودھری شرف الدین مولوی فضل امام کے ساتھ شہر کی سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ آتے جاتے لوگوں کو سلام کرتے اور انہیں روک کر اپنی قومی دردمندی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں ہم خیال وہم نوا بنا کر اپنا حلقہ وسیع کرسکیں۔ لیکن انہیں مایوسی ہوتی ہے۔ اس واقعے کی صورت گری عبدالصمد نے اس انداز واسلوب میں کی ہے:

''.....عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا، مولوی فضل امام کو تو کچھ لوگ پہچانتے تھے، انہیں لوگوں نے سلام کیا، چودھری صاحب زیادہ تر لوگوں کے لیے اجنبی تھے، کبھی کبھار لوگ انہیں مسجد میں دیکھ

لیتے تھے، ان کی طرف کوئی مخاطب بھی نہیں ہوا تو چودھری صاحب نے خود ہی آگے بڑھ کر سلام کرنا شروع کیا، لوگ انہیں جواب دیتے اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔

'یہ لوگ تو ٹھہرتے ہی نہیں، ان سے کیسے بات ہو.....''

سادہ لوح مولوی فضل امام پر تو چودھری صاحب کا مقصد واضح ہے لیکن ابھی وہ کس کام سے نکلے ہیں یہ واضح نہیں۔ پھر بھی ان کے رویے سے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ چودھری صاحب کچھ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ چائے خانے کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہیں جہاں اکٹھے کچھ لوگوں سے ملاقات اور بات ہوسکتی ہے۔ لیکن چودھری صاحب کے جواب سے تامل کا اظہار ہوتا ہے:

''وہ تو بڑا گندا چائے خانہ ہے، وہاں تو قاعدے سے بیٹھنے کی بھی جگہ نہیں، گندے گندے بینچ اینٹوں پر رکھے ہیں، میں کبھی کبھی نگاہیں ڈالتا ہوں، ہر وقت مکھیوں اور دھویں کا غول نکلتا رہتا ہے.....'' (ص ۱۱۲)

مولوی فضل امام کو چودھری شرف الدین کا یہ انداز اچھا نہیں لگا:

''اور یہ لوگ کہاں بیٹھیں گے حضور، وہاں سستی چائے بھی مل جاتی ہے اور دو تین اردو کے اخبارات بھی۔ بڑے غریب لوگ ہیں.....'' (ص ۱۱۲)

مولوی فضل امام سوچ میں پڑ گئے تھے کہ چودھری صاحب آخر کس صاحب آخر کس قوم کی تلاش میں نکلے ہیں؟ جس قوم کی وہ بات کر رہے تھے، وہ ایسی جگہوں کے علاوہ اور کہاں مل سکتی تھی۔ چودھری صاحب مخمصے میں پڑ گئے تھے اور اس دفعہ مولوی فضل امام ان پر بھاری پڑ رہے تھے:

''آخر ہم لوگ چلتے پھرتے لوگوں سے تو بات نہیں کر سکتے نا، یہ تو بہت اچھا ہے کہ لوگ چائے خانے میں بیٹھے مل جائیں گے.....''

''آپ کی خواہش ہے تو چلیے.....'' (ص ۱۱۲)

چودھری شرف الدین گویا طوعاً و کرہاً راضی ہوتے ہیں۔ عبدالصمد نے یہاں واقعیت شعارانہ اور فنکارانہ شعور کے ساتھ انفرادی احساسات اور مسلم معاشرے کی اجتماعی نفسیات کی گرہ کشائی کی ہے۔ چائے خانے میں جس قسم وقماش کے افراد آتے جاتے اور اٹھتے بیٹھتے ہیں اور جس نوعیت کی باتیں ہوتی ہیں وہ چودھری صاحب کے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر چودھری صاحب کے حافظے میں محفوظ ہیں، اسی لیے وہ چائے خانے کو چنڈوخانہ کہتے ہیں۔ اسی مقام پر اور ایسے ہی لوگوں کو سلام وکلام کا مرحلہ درپیش ہے جن کے

سلسلے میں ان کے تاثرات پہلے ہی سے اچھے نہیں ہیں۔

یہ چائے خانہ یا چنڈوخانہ معاشرتی صورت حال کی علامتی تعبیر ہے۔ یہ معاشرہ معاشی، معاشرتی اور ذہنی ونفسیاتی اعتبار سے بھی افلاس زدہ اور زوال پذیر ہے، پھر بھی اس کی زندگی کا بے سمت سفر جاری ہے۔ اس سفر میں کوئی نئی بات سامنے آتی ہے یا کوئی نیا واقعہ ظاہر ہوتا ہے تو وہ مشکوک ہو جاتا ہے، چونک پڑتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ:

''..... چائے خانے میں مولوی صاحب کے ساتھ چودھری صاحب کو دیکھ کر کچھ لوگ چونک گئے۔ مسجد میں آتے جاتے دیکھ کچھ لوگ چودھری صاحب کو پہچانتے تھے۔ مولوی فضل امام نے فرداً فرداً سب کا تعارف چودھری صاحب سے کرایا۔ دکان دار ان کے لیے کونے میں پڑی تین پائے کی ایک کرسی لے آیا۔ اسے اینٹوں کے سہارے کھڑا کیا، اور ان سے اس پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ چودھری صاحب بیٹھ تو گئے مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کیسے شروع کریں۔ انہیں وہاں بیٹھا دیکھ کر دکان کے باہر بھی کچھ لوگ کھڑے ہو گئے تھے، اور آپس میں کھسر پسر کر رہے تھے کہ آنے والے چناؤ میں شاید یہ صاحب کھڑے ہونے والے ہیں۔ چودھری صاحب کو پس وپیش میں دیکھ کر مولوی فضل امام ہی نے گفتگو شروع کی۔'' (ص ۱۱۲، ۱۱۳)

یہاں صورت حال تجسس خیز اور تحیر انگیز تو نہیں لیکن گفت وشنید کا سلسلہ جو مکالمے کی صورت میں سامنے آیا ہے وہ نہایت ہی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ مولوی فضل امام چودھری صاحب کا تعارف اس انداز و اسلوب میں کراتے ہیں:

''میرے دینی بھائیو..... چودھری صاحب کو آپ لوگ پہچانتے ہوں گے، اللہ نے انہیں بہت کچھ عطا فرمایا ہے، جسے پا کر لوگ مغرور ہو جاتے ہیں، مگر ہمارے چودھری صاحب اس درخت کی زندہ مثال ہیں جس پر بہت پھل آ جاتے ہیں تو وہ جھکتا چلا جاتا ہے.....'' (ص ۱۱۳)

یہاں ردعمل کے طور پر کسی شخص کی آواز بھرتی ہے:

''چودھری صاحب کس پارٹی سے کھڑے ہو رہے ہیں، مولوی صاحب.....؟''

آخر باہر کھڑے ایک شخص سے نہیں رہا گیا اور اس نے فضل امام کو درمیان ہی میں ٹوک دیا:

''لاحول ولا قوۃ .....' چودھری صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا.....' میں خدانخواستہ چناؤ وغیرہ میں کیوں کھڑا ہونے لگا۔ میں تو آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ ہم اپنے راستے سے بھٹک گئے ہیں، اپنے مقصد کو بھلا بیٹھے ہیں، ہم کس طرح اپنے اصل کی طرف رجوع ہوں.....'

چودھری صاحب کی زبان کھلی تو کھلتی ہی گئی۔ ابھی وہ بول ہی رہے تھے کہ ایک شخص نے درمیان ہی میں مولوی فضل امام سے پوچھ لیا۔

'چودھری صاحب تبلیغی جماعت کے ہیں یا جماعت اسلامی کے.....؟'

چودھری صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا، مولوی صاحب جلدی سے بولے۔

'ارے بھائی، چودھری صاحب کا کسی جماعت سے کوئی تعلق نہیں، وہ اپنے آپ میں ایک انجمن ہیں.....'

چودھری صاحب کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔'' (ص ۱۱۳)

عبدالصمد نے یہاں جس معاشرے کی اجتماعی نفسیات کا تجزیہ فنی اور فنکارانہ اسلوب میں کیا ہے اس میں سیاسی، سماجی اور مذہبی قیادتوں کے سلسلے میں عام عوام کے یقین و اعتماد کی کیفیت بالکل واضح ہو گئی ہے۔ گفتگو کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا آگے بڑھتا ہے اور کافی دیر تک جاری رہتا ہے، لیکن نتیجہ جو نکلتا ہے وہ وہی ڈھاک کے تین پات والا۔ چودھری صاحب اسلام کے حوالے سے اخلاقیات اور معاملات کو بنیاد بنا کر سوال اور استفسار کرنے والوں کو جواب دیتے ہیں لیکن اس دوران کسی نہ کسی گوشے سے ایسی آواز ابھرتی ہے کہ وہ تلملا کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر مولوی فضل امام معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چودھری صاحب کی بے لوث قومی خدمات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں، لیکن انہیں بھی ایسا جواب ملتا ہے کہ وہ لاجواب سے ہو جاتے ہیں۔ یعنی کہ آپ کا وعظ ہی کیا کم ہے یا پھر میلاد کی محفلوں میں جو ہم سنتے ہیں کیا وہ غنیمت نہیں۔ اصل مسئلہ جو بے کاری، بے روزگاری اور معاشی بدحالی کا ہے، اسے حل کرنے والا کہاں کوئی سامنے آتا ہے۔ موقع بہ موقع ایسے تیکھے لہجے میں کوئی کچھ بول دیتا یا ٹوک دیتا ہے تو چودھری صاحب کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ جاہلوں سے گفتگو بے سود ہے۔ وہ دینی اور قومی مسائل کے حوالے سے مولوی فضل امام اور مولانا صاحب سے ایسی مدلل و مفصل گفتگو کرتے تھے اور اکثر ان پر حاوی ہو جاتے تھے اور اس کامیابی اور کامرانی سے ان کے اعتماد اور حوصلے میں اضافہ ہوتا تھا، لیکن یہاں تو حالات حوصلہ شکن تھے، جس کا شدید احساس مولوی فضل امام کو بھی تھا۔ ایسے حالات میں انہوں نے پیغمبران دین کے مقاصد اور اصلاح کی کوششوں میں ان کے مسائل اور مصائب کے حوالے دے کر چودھری صاحب کی حوصلہ افزائی کرنے کی مخلصانہ کوشش کی، کیوں کہ چودھری صاحب کا اخلاص ان نظروں میں غیر مشتبہ تھا۔ لیکن اصلاح قوم کے سلسلے میں ان کی مخلصانہ پیش رفت کا پہلے ہی قدم پر جو نتیجہ نکلا تھا وہ ان کی زندگی کا ایسا تجربہ تھا جس نے ان کے حوصلے پست کر دیے تھے۔ مولوی فضل امام کا خیال تھا کہ جب چودھری صاحب اس راہ پر نکل چکے ہیں تو انہیں قدم پیچھے نہیں ہٹانا چاہئے لیکن لاکھ سمجھانے

بجھانے کے بعد بھی چودھری صاحب کے بجھے ہوئے دل کی لو بڑھانے میں کامیاب نہ ہوئے تو مایوسی کے گھنے کہرے میں وہ بھی کہیں معدوم ہو گئے۔

میرے خیال میں اس ناول کا بنیادی مقصد یہی ہے یعنی مسلم اکثریت کی علمی، تہذیبی، اخلاقی، سماجی اور معاشی پسماندگی اور یہاں یہی نکتہ بطور خاص ابھرتا ہے کہ معاشی پستی ہی دوسری پستیوں کا اصل سبب ہے۔ بہ فتوائے تاریخ و تحقیق بھی یہ درست ہے کہ ہندوستانی قوم میں مسلم فرقہ ہی سب سے زیادہ زبوں حالی کا شکار ہے۔ لیکن متوازی طور پر ایک دوسرا تصور بھی ابھرتا ہے اور وہ ہے مذہب و شریعت سے بے گانگی اور بے عملی۔ لیکن ان دونوں نظریات و تصورات میں کوئی قابل لحاظ تصادم نظر آتا ہے نہ مفاہمت۔ مذہب کی جہاں پابندی دکھائی دیتی ہے وہ بھی محض رسمی اور کھوکھلی نظر آتی ہے۔ اخلاص فی العمل کے فقدان کی وجہ سے انتشار ہی انتشار دکھائی دیتا ہے۔ قیادت خواہ سیاسی ہو یا مذہبی سب نے طبقہ عام و عوام میں اپنا وقار و اعتبار کھو دیا ہے۔ چودھری شرف الدین کے عوامی رابطے کے مرحلے میں ایسے سوالات کہ چودھری صاحب کیا اگلے چناؤ میں کھڑے ہو رہے ہیں یا یہ کہ تبلیغی جماعت یا جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں؟ عوام کی بیزاری کے اظہار پر مشتمل ہیں۔ شکوک و شبہات کی یہ کیفیات کئی پشتوں کے استحصال کا نتیجہ ہیں۔ عبدالصمد نے غالباً ادبی وفنی اسلوب میں انہیں کیفیات کی نشاندہی کی کوشش کی ہے اور کہیں کہیں عالم اسلام کی مجموعی صورت حال سے ہم آہنگ کر کے آفاقیت کی لے میں پرو دیا ہے۔ بوسنیا، فلسطین، عراق اور سربیا وغیرہ کا ذکر ضمنی ہوتے ہوئے بھی مرکزی نقطہ نظر سے متعلق و متصل ہے۔

عبدالصمد نے عصریت اور ہندوستانی شہریت کے تناظر میں مسلم تہذیب و معاشرت اور معیشت کو خاص موضوع بنا کر قلم فرسائی کی ہے اور ضمنی طور پر ہی سہی بعض ایسے مسائل کو اپنے دائرہ کار میں شامل کیا ہے اور ان کی سنسنی خیزی کو قلم کی سیاہی میں گھول کر ایسے منظروں کی تشکیل کی ہے جو ہر فرد معاشرہ کے لیے لمحہ فکریہ کی تعبیر رکھتے ہیں۔ مولوی فضل امام کے دو بیٹے فہیم اور قسیم کے کرداروں کے ذریعہ جو مسائل ابھارے گئے ہیں اور 'لو جہاد' اور 'آتنک واد' کی نومولود اصطلاحات کی جس طرح تعبیر و تشریح کی گئی ہے وہ ہر چند کہ بالکل سامنے کی باتیں ہیں اور سیاست و صحافت کا حصہ ہیں لیکن ادب کے دائرے میں تاریخیت کے عنصر کی حیثیت کے باوجود تاریخ سے زیادہ مستند و معتبر اور موثر ہو گئے ہیں۔

مولوی فضل امام کا ایک بیٹا فہیم روپا سے دوستی میں روپا کے گھر والوں اور خاص طور سے بھائیوں کی نظر میں 'لو جہاد' کا مجرم بن جاتا ہے اور اس کی ایسی سزا پاتا ہے کہ مرتے مرتے بچ جاتا ہے، لیکن اپاہج بن کر رہ جاتا ہے۔ ٹک ٹک دیکھتا رہتا ہے، آواز غائب اور ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں، بچتا بھی ہے تو روپا

کی مہربانیوں سے، جو اپنے بھائیوں کے قاتلانہ تیور کو دیکھتے ہوئے پولیس کو مطلع کر دیتی ہے اور پولیس پارک کی جھاڑیوں میں سے اس زندہ لاش کو نکال کر لے آتی ہے۔ ادھر روپا کے بھائی اپنے مشن کی کامیابی پر اکڑتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں تو پھانسی کے پھندے سے جھولتی ہوئی روپا کی لاش ملتی ہے اور اس 'لو جہاد' کا قصہ یہیں تمام ہو جاتا ہے۔

مولوی فضل امام کو قسیم کی سرگرمیوں کا کوئی واضح علم نہیں سوائے اس کے کہ وہ کسی شہر میں چھوٹا موٹا کوئی کام کرتا ہے، خود کفیل ہے، لیکن اس میں مذہبی اور تاریخی علم کی ایسی پیاس ہے، اس کے ذہن میں ایسے ایسے سوالات ابھرتے ہیں جن کا وہ تشفی بخش جواب چاہتا ہے اور وہ جواب نہ تو اسے خود اپنے باپ مولوی فضل امام یا کسی دوسرے مولانا سے مل پاتا ہے۔ اس کا یہ مسئلہ اسے بے چین رکھتا ہے۔

عبد الصمد نے گویا اس ناول میں مولوی فضل امام کے ان دونوں بیٹوں کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے حوالے سے مسلم معاشرے کے نوجوانوں کی حرکات وسکنات اور نفسیاتی و ذہنی کیفیات کی ترجمانی اور عکاسی کی کوشش کی ہے۔

قسیم جہاں رہتا ہے، وہ ڈورمیٹری قسم کا رہائشی مکان ہے جس میں قسیم ہی جیسی مالی حیثیت کے کئی نوجوان رہتے ہیں۔ ان میں مبین اور اختر کے ساتھ قسیم کا دوستانہ ہو جاتا ہے۔ مبین اس سے ہمدردی کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے اور اسے الجھا الجھا سا دیکھ کر سمجھاتا بجھاتا بھی رہتا ہے۔ مثلاً عالم اسلام اور ان کے حال زار کے پس منظر میں وہ سمجھاتا ہے:

''ہم ان کی مصیبتوں کو دور کرنے کی دعا کریں اور کوشش کریں کہ ہم پر وہ مصیبت نازل نہ ہو۔ تم تو پڑھتے ہی رہتے ہو، یہ بھی جانتے ہو گے کہ دوسروں پر جو مصیبتیں آتی ہیں، وہ تمہارے لیے باعث عبرت ہوتی ہیں.....'' (ص ۱۲۳)

لیکن قسیم مبین کے خیالات سے متفق نہیں ہوتا۔ عالم اسلام کی صورت حال کے سلسلے میں قسیم کی معلومات اختر ہی کی خبروں کے خزانے کی رہین منت ہے۔ قسیم کی ایسی خبروں میں دلچسپیاں بڑھتی جاتی ہیں اس لیے مبین کے مقابلے میں قسیم ذہنی طور پر اختر سے قریب ہوتا جاتا ہے اور پھر اسی کے مشورے سے ایک لیپ ٹاپ خرید کر اس پر دل کی بھڑاس نکالنے لگتا ہے۔ اسے یہ ترکیب بھی اختر نے ہی بتائی تھی:

''جب بھی تمہارے دل اور ذہن میں ایسی باتیں بھر جائیں جن کا باہر نکلنا تمہارے لیے بہت ضروری ہو تو تم اس کے اسکرین پر اپنے جذبات کا اظہار کر دو، جو کچھ تمہارے دل میں ہو، وہ سب اسکرین پر لے آؤ، اس سے تمہارا دل بہت ہلکا ہو جائے گا اور تمہیں سکون مل جائے گا۔ پھر یہ چیز تمہاری ذاتی ہے۔ اسے

ہر وقت اپنے پاس رکھو، جب ضرورت ہو، استعمال کرو، جب چاہو بند کر دو.....'' (ص ۱۳۰، ۱۳۱)

اسے استعمال کرنے کا طریقہ بھی اختر نے ہی سکھایا تھا اور قسیم جلد ہی لیپ ٹاپ آپریٹ کرنا سیکھ گیا تھا۔ اس پر اختر کی فراہم کی ہوئی اطلاعات بھی اسے مل جاتی تھیں، اس کی تصویروں کے ساتھ۔ لیکن اس کا ہیجان کم ہونے کے بجائے اور بڑھتا ہی جا رہا تھا کیوں کہ جو معلومات اسے حاصل ہو رہی تھیں وہی احساس کمتری اور انتشار و ہیجان میں بھی مبتلا کر رہی تھیں اور اس انتشار و ہیجان پر وہ لیپ ٹاپ کے ہی ذریعہ قابو بھی پاتا تھا۔ اس کی تسلی اور تشفی کے لیے اتنا کافی تھا کہ جن باتوں کا پہلے اسے کوئی علم نہ تھا وہ باتیں معلوم ہونے لگی تھیں، اور بے خبری کے مقابلے میں یہ باخبری غنیمت تھی کہ اس کے خیال میں اصل بیماری اور کمزوری بے خبری ہی تو تھی۔ جیسا کہ ایک موقع پر مبین کو مخاطب کر کے اظہار خیال کرتا ہے:

''..... بھائی مبین صاحب، ہماری اصل بیماری اور کمزوری ہماری بے خبری ہی تو ہے، ہم اپنے مذہب کے احکام سے واقف نہیں، اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف نہیں، اپنی فتوحات سے واقف نہیں، ہمارے اوپر دنیا بھر میں جو ظلم ہو رہے ہیں، ان سے واقف نہیں تو آخر ہم کس قسم کی زندگی گزار رہے ہیں، ایسی بے حسی تو جانوروں میں بھی نہیں ہوتی.....'' (۱۵۰)

اس سے ملتا جلتا واقعہ عبد الصمد کے سابقہ ناول ''شکست کی آواز'' میں بھی ملتا ہے۔ مسلم ہاسٹل میں نوجوانوں کی سوچ کچھ اسی قسم کی نظر آتی ہے، لیکن وہاں ایک اجتماعی سرگرمی دکھائی دیتی ہے جو یہاں نہیں ہے البتہ چھاپے وہاں بھی پڑتے ہیں اور یہاں بھی، گرفتاریاں وہاں بھی ہوتی ہیں اور شکوک وشبہات کا غبار یہاں بھی پھوٹتا ہے۔ قسیم اپنے اندر کی آگ کو جلائے رکھنے کے لیے یا اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے لیپ ٹاپ پر اپنے جذبات قلم بند کرتا رہتا ہے اور اپنے اندر کے انتشار یا ہیجان پر وہ نہ صرف اس کے ذریعہ قابو پاتا ہے بلکہ سکون محسوس کرتا ہے۔

مبین جب اسے ہر وقت لیپ ٹاپ سے چپکے رہنے سے منع کرتے ہوئے احساس دلاتا ہے کہ اتنی جانکاری اور معلومات حاصل کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ تو قسیم بے خبری کو ہی اصل بیماری اور کمزوری کی وجہ قرار دیتا ہے۔

قسیم کے داخلی انتشار اور ہیجان کا سبب متعلقہ اقتباس سے پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ اس کے اسلوب سے اس کی جذباتیت بھی ظاہر ہے۔ مزید وضاحت اس قسم کے جملوں سے بھی ہوتی ہے کہ بولتے بولتے قسیم بے حد جذباتی ہو گیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن مبین کی سنجیدگی برقرار رہی۔ البتہ اس نے بحث کو طول دینے سے گریز کیا اور جب قسیم ذرا ٹھنڈا ہوا تو اس نے ایک مخلصانہ مشورہ دیا کہ لیپ ٹاپ پر اپنے

جذبات قلم بند کرنے سے تو بہتر تم بند کمرے میں خوب بول کر دل کی بھڑاس نکال دو۔

قسیم بالآخر اس مشورے کو مان لیتا ہے۔ اختر اور مبین اس کے دوست ہیں۔ اختر کے مشورے پر ہی قسیم لیپ ٹاپ خریدتا ہے لیکن اس سے اسے جتنا فائدہ نہیں ہوتا اس سے زیادہ نقصان ہوتا ہے کیوں کہ اس کے انتشار یا ہیجان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ ہر وقت لیپ ٹاپ سے چپکا رہتا ہے۔ مبین اس کی اس حرکت کو اس کی صحت کے لیے نقصان دہ سمجھتا ہے، اسی لیے لیپ ٹاپ کے متبادل کے طور پر دوسرا مشورہ دے ڈالتا ہے اور قسیم اس مشورے کو مان بھی لیتا ہے اور اس پر عمل بھی کرنے لگتا ہے آگے چل کر اس کا فائدہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر قصہ بننے اور بیان کرنے میں فکری وفنی سطح عبدالصمد نے جس دانش وارانہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ وہ زیادہ اہم ہے۔

اختر، مبین اور قسیم ایک ہی ساتھ ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ یہ تینوں اپنی سوچ سمجھ اور فہم وشعور نیز مصروفیت اور مشاغل کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ قسیم کے دماغ میں جس قسم کے سوالات ابھرتے ہیں ان کا تشفی بخش جواب نہ تو اسے اپنے والد مولوی فضل امام سے مل پاتا ہے نہ تو مولوی فضل امام کے شناسا مولانا سے۔ صحافی ہونے کی وجہ سے اختر کے پاس اگرچہ خبروں کا خزانہ ہوتا ہے اور وہ قسیم کے ساتھ شیئر بھی کرتا ہے لیکن اسے مطمئن نہیں کر پاتا۔ اس لیے لیپ ٹاپ خریدنے اور انٹرنیٹ شیئر کرنے کا مشورہ دے کر قسیم سے کسی حد تک چھٹکارہ حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن قسیم کی حالت دیکھ کر مبین تشویش میں مبتلا ہوتا ہے اور اسے جو مشورہ دیتا ہے اس کی ایمائیت اور اشاریت پر غور کریں تو عصر یب اور تاریخیت کے تناظر میں عبدالصمد کی دانشوری، دوراندیشی کے ساتھ ایک محتاط رویے کا انکشاف ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایک طرف تو قسیم کے کردار کو جس طرح منظرنامے پر ابھرنا چاہئے نہیں ابھرتا۔ دوسری طرف جس وبال جان میں وہ گرفتار ہوسکتا تھا اس سے کسی حد تک بچ جاتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں مبین کی مخلصانہ کاوش ہی کام آتی دکھائی دیتی ہے۔

چھاپے دو جگہ پڑتے ہیں، ایک تو قسیم کی رہائش گاہ پر اور دوسرا مولوی فضل امام کے خستہ حال مکان پر۔ خفیہ محکمہ پولیس کی مدد سے مولوی فضل امام کے مکان پر چھاپا مارتا ہے، مکان کی تلاشی لیتا ہے اور مولوی صاحب سے طرح طرح کے سوالات کرتا ہے، ڈراتا دھمکاتا ہے اور قسیم کی گرفتاری کی بھی خبر دیتا ہے۔ پہلے فہیم کے ساتھ پیش آنے والا سانحہ اور پھر قسیم کے سر مڈھے گئے ملک دشمنی کے الزامات سے مولوی صاحب کی شخصیت اور حیثیت اہل محلہ اور مصلیوں کے درمیان بھی مشکوک ہوجاتی ہے۔ چہ مہ گوئیاں شروع ہوجاتی ہیں۔ یہاں تک کہ چودھری شرف الدین بھی قوم و مذہب کے حوالے سے اپنے مخصوص

انداز میں سرزنش کرنے سے باز نہیں آتے، لیکن 'سانچ کو آنچ نہیں' کے مصداق مولوی فضل امام اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں۔ وہ اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ راوی کا بیان ہے کہ:

''چھاپے تو فی الوقت دو ہی جگہ پڑے، لیکن ایسا لگا جیسے دونوں علاقے دور دور تک تھرا اٹھے۔ فوری طور پر کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ دراصل ہوا کیا۔ چھاپے کی بات تو کسی کے ذہن میں دور دور تک نہیں تھی، وہ بھی فضل امام کے بوسیدہ مکان اور قسیم کے بے سروساماں ٹھکانے پر۔ وہ تو بہت دیر کے بعد کانوں کان یہ بات پھیلی کہ چھاپے دہشت گردوں کی تلاش میں کیے گئے ہیں اور چھاپہ ماروں کو صرف آدمیوں ہی کی نہیں، دہشت گردی میں استعمال ہونے والے ہتھیار، موبائل، لیپ ٹاپ، لٹریچر، کتابیں، خطوط اور کچھ نامعلوم قسم کی چیزیں بھی درکار تھیں۔'' (ص ۱۹۹)

اس طرح کا کوئی بھی واقعہ یا واردات رونما ہو تو عوامی معاشرے میں خود ہی ایک قسم کی دہشت پیدا ہوجاتی ہے اور ذہنوں میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں اور ان خیالات کا اظہار بھی قیاس آرائیوں کی بنیاد پر مختلف قسم کے اسلوب اور لہجے میں ہوتا ہے۔ یہ گویا ایک طرح کا فطری ردعمل ہوتا ہے۔ عبدالصمد نے اس فطری ردعمل کو فطری انداز و اسلوب میں پیش کیا ہے جس میں بعض نا قابل تردید حقیقت بھی سامنے آگئی ہے۔ مثلاً کسی کا یہ خیال کہ مولوی فضل امام کے گھر کی تلاشی کے علاوہ بھی دوسرے گھروں کی تلاشی ہوسکتی ہے اس لیے اگر کسی کے گھر میں کھلونے والے ہتھیار بھی ہوں تو انہیں ہٹا دینا چاہئے۔ لیکن ان معمولی چیزوں سے کسی کو کیا غرض ہوسکتی ہے..... کسی دوسرے شخص نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو پہلے شخص نے اس دوراندیشانہ باخبری کا ثبوت یوں پیش کیا:

''اس کا مطلب ہے، تم اخبار نہیں پڑھتے، ریڈیو، ٹی وی نہیں سنتے، دنیا کی کوئی خبر نہیں رکھتے۔ تم یہ بھی نہیں مانتے کہ ہمارے فورسیز میں کتنے بڑے بڑے کلاکار اور کہانی کار بھرے ہوئے ہیں، جو زمین کو سیدھے آسمان سے ملا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں.....'' (ص ۲۰۳)

''کلاکار.....؟ کہانی کار.....؟ آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی آپ کہنا کیا چاہتے ہیں.....؟

ظاہر ہے کہ بھولے بھالے لوگوں کا یہ استفسار بھی غیر فطری نہیں ہے لیکن یہ صورت حال عصری، سیاسی رجحان کے تناظر میں مضحکہ خیز ضرور ہے۔ ایمائیت اور اشاریت سے آراستہ اسلوب بیشتر لوگوں کی فہم وفراست سے بالاتر ہی رہتا ہے۔ ایسے میں برہنہ گفتار اسلوب کی اہمیت فزوں تر ہوجاتی ہے:

''ارے بھیا، وہ تمہاری ان تمام معمولی چیزوں کی ایسی ایسی کہانی بنا دیں گے اور اس کو ایسا روپ دے دیں گے کہ تمہیں ہرگز یقین نہیں آئے گا کہ یہ تمہاری ہی چیزیں ہیں، یہ تم ہو، تم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے

اپنے آپ کو دیکھو گے، پھر بھی شاید پہچان نہیں سکو گے.....'' (ص ۲۰۳، ۲۰۴)

عبدالصمد نے سیاست، صحافت اور تاریخی عناصر کی ترکیب وترتیب سے جو واقعہ پیش کیا ہے وہ تخیلی نہیں ہے اس لیے اس میں تخلیقیت کا بھی فقدان ہے اور جہاں تک واقعیت کا سوال ہے تو ٹھوس حقائق کا بیان اسلوب کی صلابت سے بھی ظاہر ہے۔

عبدالصمد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ادب جزو بنا ڈالا ہے۔ تاریخی صداقتوں کو ادبی صداقتوں میں تبدیل کر دینا بھی آج کی فن کاری کا ایک اہم رجحان ہے۔

بہر حال، مولوی فضل امام کے گھر کی تلاشی ہوتی ہے تفتیشی کارروائی کے طور پر پوچھ تاچھ بھی ہوتی ہے اور دھمکی بھی دی جاتی ہے۔ لیکن بالآخر چھاپا مار دستے کو ناکامی ہی ہاتھ لگتی ہے اور اس دستے کے بیشتر افراد وارکان کو یقین ہو جاتا ہے کہ انہیں جو نقشہ دیا گیا تھا، جو رپورٹ دی گئی تھی وہ سب بناوٹی تھا۔ اس لیے مولوی فضل امام یا اہل خانہ کی گرفتاری نہیں ہوتی۔ کچھ اسی قسم کی صورت حال قسیم کی رہائش گاہ پر رونما ہوتی ہے۔ لم غلم سامان کے علاوہ ایک لیپ ٹاپ چھاپا مار دستے کے ہاتھ لگتا ہے۔ اس سے راز اگلوانے کی کوشش شروع ہوتی ہے:

''پھر لیپ ٹاپ نے بھری محفل (مجمع) میں اپنے راز اگلنے شروع کیے۔ طرح طرح کی گالیاں.....

قسم قسم کے عزم.....

وغیرہ وغیرہ.....'' (ص ۲۱۵، ۲۱۶)

لیپ ٹاپ کے اسکرین پر ملک دشمن کارروائیوں کی تعریفیں اور حمایت بھی نظر آتی ہے اور یہ دیکھ کر چھاپہ مار دستے کے افسر کا پیشہ وارانہ ردعمل بھی ظاہر ہوتا ہے۔ موجود ثبوت اور دلائل کی بنیاد پر وہ گھیرنے کی کوشش کرتا ہے۔

قسیم تو خیر ملزم ہی ہے، پھر وہ ذہنی طور بھی اس قابل نہیں کہ اس صورت حال کا مقابلہ کر سکے یا اپنی صفائی پیش کر سکے۔ اس پر تو سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ دوسرے ساتھی بھی ہکا بکا سے نظر آتے ہیں۔ لیکن مبین اس صورت کا ہمت مردانہ کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے وہ افسر کو جواب دیتا ہے:

''سر یہ لیپ ٹاپ تو قسیم کا ہے اور وہ دماغی طور پر کمزور ہے، اب وہ اس میں کیا بھرتا ہے ہمیں کیا معلوم اور ہمیں اس سے کیا واسطہ.....'' (ص ۲۱۷)

مباحثے کا سلسلہ صورت حال کے مطابق آگے بڑھتا ہے اور صورت حال یہ ہے کہ مبین بحیثیت

ملزم کٹہرے میں کھڑا ہے دوسرے ساتھی حیران وششدر اور غصے میں بھرے ہیں کیوں کہ قسیم ہی کی حرکتوں کی وجہ سے وہ بھی شک کے دائرے میں آ گئے ہیں، اور مبین گویا وکیل جرح کے مقابلے میں کھڑا قسیم کے گواہ کے طور پر اس کا دفاع کر رہا ہے:

''میں سچ کہہ رہا ہوں سر، لیپ ٹاپ بے شک اسی کا ہے اور اس نے بڑی مشکلوں سے اپنا پیٹ کاٹ کے اسے حاصل کیا ہے، مگر ہے یہ ایک دم پاگل.....''

''سر، میں آپ کو بتاتا ہوں، جو کچھ اس نے لیپ ٹاپ میں بھرا ہے، وہ سب باتیں یہ ہماری غیر موجودگی میں کمرہ بند کر کے چیخ چیخ کے دہراتا ہے، بار بار دہراتا ہے.....'' (ص ۲۱۹)

مبین یہ باور کرانے کے لیے کہ قسیم واقعی پاگل ہے دلیل کے طور پر ایک واقعہ بھی بیان کرتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قسیم واقعی نارمل نہیں ہے۔ دوسرے ساتھی بھی قسیم کی تائید کرتے ہیں۔ عبدالصمد نے قسیم کے کردار کو Psycho Analysis کا کیس بنا دیا ہے۔ وہ اس کردار کے حوالے سے غالباً یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ موجودہ صورت حال میں مسلم معاشرے کے بعض نوجوان ایسے ذہنی مرض میں مبتلا ہو رہے ہیں جسے ذہنی مرض کے ماہرین Psycheatric problem کا نام دیتے ہیں اور انہیں اس مرض میں مبتلا کرنے میں ایک طرف اگر ناداری، مفلسی اور بے روزگاری ہے تو دوسری طرف میڈیا اور Electronic Devices بھی اہم رول ہے۔ مبین اس سنگین صورت حال میں بھی قسیم کے بارے میں جو واقعہ بیان کرتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ قسیم نارمل نوجوان نہیں ہے۔ اس کی ذہنی حالت دگرگوں ہے:

''ہم کسی ضرورت سے دن ہی میں واپس آئے تو کمرہ اندر سے بند تھا، اندر سے جیسے کوئی زبردست لڑائی کی آوازیں آ رہی تھیں، گالی گلوچ، مار دھاڑ، کسی کو پیٹنے کی آوازیں، کسی کو للکارنے کی آوازیں..... میں تو ڈر گیا اور جلدی سے بھاگ کر باہر سڑک پر کھڑا ہو گیا اور کمرہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا.....'

'کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا تو یہ برآمد ہوا، میں انتظار کرتا رہا کہ اور لوگ بھی نکلیں، بہت انتظار کے بعد بھی کوئی نہیں نکلا۔ اس کے چہرے پر وحشت کی سرخی تھی، آنکھیں لال ہو رہی تھیں، اور سر سے پیر تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اندر ضرور اس نے کچھ خون خرابہ کیا ہے، ہو سکتا ہے کسی کا قتل کیا ہو، میں ڈر کے مارے وہیں چھپا رہا، یہ باہر نکلا، باہر کے نل پر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور ایک طرف کو چل دیا۔ تب میری جان میں جان آئی۔ میں جلدی سے کمرے میں گیا، وہاں کوئی نہیں تھا، البتہ سارا سامان بے ترتیب گرا

پڑا تھا جیسے کسی نے انہیں لا پروائی سے پھینک دیا ہو، اب بتایئے سر، یہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے.....''
(ص ۲۱۹)

لیکن سر دست یہ بیان قسیم کی نا کردہ گناہی کا ثبوت نہیں بن پاتا بلکہ مجرمانہ سرگرمیوں میں اس معاملے کو آگے بڑھانے کے لیے لیپ ٹاپ ہی کافی ہوتا ہے۔

ایسے واقعات میڈیا میں آکر تل کا تاڑ اور رائی کا پہاڑ کیسے بن جاتے ہیں، کوئی سفید جھوٹ پکی سیاہی میں سچائی کا روپ کیسے دھار لیتا ہے؟ اس مرحلے کو بھی عبدالصمد کے قلم نے فنکارانہ سلیقہ شعاری کے ساتھ ساتھ طے کیا ہے اور یہی پہلو یہاں توجہ طلب بھی ہے، ورنہ جو موضوع ہے، جو مضمون ہے اس میں کوئی جدت یا ندرت نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہی ہے کہ یہ نہایت ہی فرسودہ ہے، لیکن عبدالصمد نے سیاق و سباق کے حوالے سے ادب کا ناگزیر جزو بنا کر تازگی عطا کر دی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب سارا معاملہ طشت از بام ہو ہی گیا تو ٹی وی چینلس اور اخبارات طرح طرح کی بے شمار کہانیاں گڑھ رہے تھے۔ لمحوں کے اندر مولوی فضل امام اور ان کا ٹوٹا پھوٹا گھر نہایت تیز روشنیوں میں نہا گیا تھا۔ اتنی تیز روشنی کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ رات کی مہیب سیاہی بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ شہر اور محلے کی بات تو دور پورے ملک میں چرچا کا بس یہی موضوع تھا۔ اخبارات اور ٹی وی کے نمائندے جنہیں نیوز بنانے کی ٹریننگ دی گئی تھی، راتوں رات فکشن نگار بن گئے تھے۔ بڑے افسانہ نگار بننے کی ایک دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ ہر شخص کو بس ایک ہی دھن سوار تھی، وہ ایسے چونکانے والے افسانے لکھے کہ دوسرے رشک و حسد میں مبتلا ہو جائیں اور اسے بہت بڑا افسانہ نگار تسلیم کر لیا جائے۔ یہ سب تو بڑی سطح پر ہو رہا تھا۔ اور جو اس کھیل کے مبینہ مرکزی کردار تھے، وہ کسی اور ہی محور پر گھوم رہے تھے۔ انہیں پتا بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک کتنے اہم ہو گئے ہیں اور کس اونچے اسٹیج پر لا کے انہیں بیٹھا دیا گیا ہے۔'' (ص ۲۲۰، ۲۲۱)

میڈیا کے حوالے سے عہد حاضر کی کڑوی سچائیوں کو عبدالصمد نے جس انداز و اسلوب میں پیش کیا ہے، یہی ان کا فنی کارنامہ ہے اور موضوع و مضمون سے زیادہ اہم بات یہی ہے۔ ایک اہم بات اور بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہ موضوعات و مسائل ضمنی اور ہنگامی ہیں، عبدالصمد کا اصل موضوع مسلم معاشرے کی زبوں حالی کی داستان سرائی ہے، بلکہ یوں کہوں کہ وہ زاویے بدل بدل کر اس مفلوک الحال معاشرے کو آئینہ دکھانے کا کام کرتے رہے ہیں تو شاید یہ غلط نہ ہوگا۔ اس ناول میں یہ کارنامہ تین زاویوں پر مشتمل ہے۔ اس مسلم معاشرے کے ایک سرے پر مولوی فضل امام ہیں تو دوسرے سرے پر ان کے پیچھے نمازیں ادا کرنے والے یا چودھری شرف الدین کے خیال میں چنڈو خانے میں بے سر پیر کی اڑانے والے

مسلمانوں کی جماعت ہے۔ تیسری طرف خود چودھری شرف الدین نہیں جو اپنی دولت و امارت کی بنا پر مسلمانوں کے عام طبقے سے مختلف ہیں اور بظاہر اصلاح قوم کے بہانے قومی قیادت کی دستار سے سرافتخار کو مزین کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح بزعم خود انہوں نے محنت سے دولت حاصل کی ہے اسی طرح اپنی نام نہاد محنت و کوشش سے یہ دستار فضلیت بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے کاروبار کو پھیلانے اور دولت کمانے کے لیے خود اپنے بیان کے مطابق انہوں نے سیاسی روابط سے کام لیا ہے، قانون سازوں اور وزیروں سے کام لیا ہے، اسی طرح وہ مولوی فضل امام کے سہارے قوم کے قائد اعظم بننے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں، لیکن اس سلسلے کی پہلی ہی پیش رفت سے انہیں تھکن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ البتہ ان کی جاگتی آنکھوں کا خواب بے رنگ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بنگلے میں ہی بیٹھے بیٹھے سیاست کی دکانداری چمکانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ اخبارات اور ٹی وی چینلوں میں مولوی فضل امام اور قسیم کے حوالے سے مشتہر ہونے والی خبروں کے بعد انہیں ایک بار پھر مولوی صاحب کی یاد آتی ہے لیکن وہ پرسان حال بن کر خود مولوی صاحب کے گھر پھیرے لگانے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے بلکہ کسی کارندے کی معرفت بلواتے ہیں۔

مولوی فضل امام جب پہنچتے ہیں تو چودھری صاحب والہانہ استقبال کرتے ہیں، اور رسمی تکلفات کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ ''آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔''

ردعمل کے طور پر مولوی فضل امام کی معصومیت کا اظہار جس انداز میں ہوا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ان پر جو افتاد پڑی اسے صرف وہی جانتے ہیں۔ انہیں پتا نہیں کہ اس سلسلے کی خبریں ہفتوں اخبارات میں آتی رہیں اور ٹی وی چینلوں پر دکھائی جاتی رہیں اور دنیا بھر میں مشتہر ہوتی رہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں چودھری صاحب کی باخبری پر انہیں حیرت ہوتی ہے اور وہ اس حیرت کا اظہار بھی کر بیٹھتے ہیں:

''آپ کو اور، اور لوگوں کو پتا کیسے چلا، یہ تو صرف میرے ساتھ گزری تھی.....'' (ص ۲۲۵)

اس ایک ہی مختصر سے جملے میں مولوی فضل امام کی سادہ لوحی اور معصومیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی سیرت و شخصیت اور بے نیاز قسم کی زندگی کا پہلو جس طرح مترشح ہوتا ہے، اس پر کسی کو بھی ترس آ سکتا ہے۔ لیکن ایسے شخص کے بارے میں میڈیا میں جس قسم کی کہانی گڑھی گئی اس پر رونا آتا ہے۔ مولوی صاحب کے استفہام و استفسار پر چودھری صاحب کا ہنس پڑنا اسی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔ لیکن مولوی صاحب کا تفصیلی جواب بھی چودھری شرف الدین اس طرح دیتے ہیں:

''کمال کرتے ہیں مولوی صاحب، اس کا مطلب ہے، آپ کو دنیا و مافیہا کی کچھ خبر ہی نہیں۔ ارے بھائی، آپ کے ساتھ جو کچھ گزری اور آپ کے بیٹے قسیم کے ساتھ جو

گزری، وہ تو ہفتوں، سارے ٹی وی چینلز پر دکھایا جاتا رہا، تمام اخبارات اس سے رنگے رہے، آپ کے گھر کو آتنک وادیوں کا بہت بڑا اڈہ بتایا گیا اور آپ کے بچوں کو..... سب سے زیادہ ہنسی کی بات تو یہ ہے کہ آپ کو ماسٹر مائنڈ تک ڈیکلیر کر دیا گیا، اور آپ کو کچھ پتا نہیں.....'' (ص ۲۲۵)

گفت وشنید کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو چودھری صاحب پولیس والوں کی طرح جرح کرنے لگتے ہیں۔ یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی فضل امام کا کردار بھی ان کے شک کے دائرے میں ہے اور بالفرض محال اگر وہ مولوی صاحب کو معصوم اور بے گناہ تسلیم بھی کر لیں تب بھی ان کا بیٹا قسیم تو یقینا مجرم ہے اور اس کا جرم مولوی فضل امام سے پوشیدہ نہیں۔ چودھری صاحب وکیل جرح کی طرح سوالات کرتے رہتے ہیں اور مولوی صاحب نپے تلے اور پر اعتماد لہجے میں جواب دیتے رہتے ہیں۔ وہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا بیٹا مجرم نہیں لیکن جہاں اس سلسلے کو چودھری صاحب موقوف کرتے ہیں وہیں پھر فہیم کا ذکر چھیڑ کر پولیس والوں کے تفتیشی تیور کے ساتھ مولوی صاحب کو گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

عبد الصمد نے اس سلسلے کی ساری تفصیلات نہایت ہی فطری انداز و اسلوب میں پیش کی ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ایسے الزامات سے ملزم کی شبیہ پر کتنا برا اثر پڑتا ہے۔ دس دس بارہ بارہ سال تفتیش اور الزام ثابت کرنے کی کوششوں میں نکل جاتے ہیں۔ ثبوت کے فقدان میں جرم ثابت نہیں ہوتا تو باعزت بری کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کلین چٹ کے باوجود شخصیت جو داغدار ہوتی ہے اس کا ازالہ نہیں ہو پاتا۔ زندگی کے خوبصورت دن اس طرح گزر جانے کے بعد انسان کسی قابل نہیں رہ جاتا۔ مسلم معاشرے کا یہ المیہ ہی استعاراتی طور پر ''اجالوں کی سیاہی'' ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Head Dept. of Urdu & Persian
A.N. College Patna

حافظ کرناٹکی کی تصنیفات

نام کتاب : حضرت عائشہؓ صفحات : ۸۰ قیمت : ۵۰/روپے	نام کتاب : حضرت عمرؓ صفحات : ۷۲ قیمت : ۵۰/روپے
نام کتاب : اللہم بارک صفحات : ۱۲۰ قیمت : ۷۰/روپے	نام کتاب : اللہم صل صفحات : ۱۲۰ قیمت : ۷۰/روپے

نام کتاب : ابھی سرسبز شاخ ہے صفحات : ۶۹ قیمت : ۵۰/روپے

● **ڈاکٹر ہمایون اشرف**

شکیلہ اختر اور ان کی ترقی پسندانہ واقعیت شعاری

شکیلہ اختر اردو کی ایک مقتدر اور مستند افسانہ نگار ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ شکیلہ اختر بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے غیر معمولی امتیازات کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی ۵۸ سالہ ادبی زندگی میں سخت محنت و ریاضت سے اپنے لیے ایک منفرد راہ نکالی اور اردو کی صف اول کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک ممتاز و ممیز مقام کی حقدار بنیں۔

شکیلہ اختر کی پیدائش ۱۶/اگست ۱۹۱۶ء کو ضلع ارول (پرانا گیا اور جہان آباد ضلع) کے ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ یہ خوبصورت قصبہ سون ندی کے کنارے آباد ہے۔ شکیلہ کا پورا خاندان اسی قصبے میں بسا ہوا تھا۔ ان کے والد شاہ محمد توحید وہاں کے زمیندار اور ذی علم انسان تھے۔ والدہ کو بھی ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے اجداد میں شاہ عمیر اور شاہ زبیر جنگ آزادی میں بہ نفس نفیس شریک رہے۔ شاہ مشتاق احمد اور ان کے صاحبزادے نامور کانگریسی رہنما اور کٹیہار کے رکن پارلیمنٹ جناب طارق انور ان کے رشتہ دار ہیں۔

گھریلو ماحول میں پہلے شکیلہ اختر ''شکیلہ بانو'' کہی جاتی رہیں۔ پھر شکیلہ توحید اور شادی کے بعد شکیلہ اختر کے نام سے معروف ہوئیں۔ اسکول یا کالج کی باضابطہ تعلیم انہوں نے حاصل نہیں کی۔ چار سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم کے لیے انہیں ''غفور دادا'' کے مدرسے میں بھیجا جانے لگا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم آٹھ سال کی عمر میں مکمل کر لی۔ اس کے بعد ان کو پردے میں بٹھا دیا گیا۔ ان کے گھر میں علمی و ادبی فضا تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے یہاں علم و ادب سے بھری کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ جب آنکھ کھلی تو انہوں نے اپنے ہی گھر میں ہندوستان بھر کے رسائل و جرائد اور اخبارات بھی دیکھے۔ شکیلہ اختر کی زندگی میں انقلاب اس وقت آیا جب ۲۵/مئی ۱۹۳۳ء کو اردو کے مشہور ادیب، افسانہ نگار، ناول و ڈرامہ نویس، نقاد، محقق اور شاعر پروفیسر اختر اورینوی سے ان کی شادی ہوئی۔ لیکن ان کے بطن سے ایک بھی پھول نہ کھل سکا۔ اولاد کی کمی عمر

بھر انہیں ستاتی رہی۔ لا ولدی کے اس غم کو ہلکا کرنے کے لیے شکیلہ اختر مستقل طور پر تصنیف و تالیف میں منہمک رہیں اور گھر کے دوسرے بچوں سے دل بہلاتی رہیں۔ ان کا انتقال ۱۰ر فروری ۱۹۹۴ء کو پٹنہ میں ہوا۔

شکیلہ اختر نے بلا شبہ اسکول و کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی لیکن گھر پر ہی میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، اقبالؔ وغیرہ کو پڑھ چکی تھیں جب اختر اورینوی ان کی زندگی میں داخل ہوئے تو نہ صرف انہیں بلکہ ان کی بہنوں رضیہ رعنا، زہرہ نگار، نسیمہ سوز کو ''دیوان غالب'' اور ''بانگ درا'' کی تفسیریں بھی بتائیں اور انگریزی، تاریخ اور جغرافیہ بھی پڑھائی۔ شعر سمجھنے اور شعر کہنے کی مشقیں بھی کرائیں۔

شکیلہ اختر کو لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ گھر کا ماحول بھی ادبی تھا، جس کی وجہ کر ابتداء ہی سے شعر و ادب کا ذوق پیدا ہو گیا۔ شکیلہ اختر نے شاعری بھی کی، چھوٹے چھوٹے مضامین، انشائیے، خاکے، افسانے اور ناولٹ بھی لکھے۔ شاعری میں انہیں زیادہ کامیابی نہیں ملی مگر افسانہ نگاری میں انہوں نے اپنی شناخت ضرور قائم کی۔ شکیلہ اختر کے تصورات کی تشکیل اور مطالعے میں ان کے خاندان اور شوہر کی رفاقت، محبت اور حوصلہ افزائی کا زبردست ہاتھ رہا۔ ان کے ادبی ذوق کو اختر اورینوی صاحب نے پروان چڑھایا اور وہ افسانہ لکھنے کی طرف مائل ہو گئیں۔

شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری کا سال آغاز ۱۹۳۶ء ہے۔ اسی سال ان کا پہلا افسانہ بعنوان ''رحمت'' رسالہ ''ادب لطیف'' لاہور میں شائع ہوا۔ اپنے ادبی کیریئر کے آغاز کے سلسلے میں انہوں نے خود لکھا ہے:

> ''میں نے ۱۹۳۶ء سے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ ۔۔۔میرا پہلا افسانہ ''ادب لطیف'' جیسے چوٹی کے معیاری رسالے میں چھپا تھا اور صرف چھپا ہی نہیں تھا، ایڈیٹوریل میں پورا صفحہ میرے افسانے کی تعریف سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے پر خلوص طور پر یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ میں شاعری چھوڑ کر افسانے لکھا کروں۔''[۱]

اس کے بعد ان کے افسانے ''نیرنگ خیال'' ''عصمت'' ''ساقی'' ''کلیم'' ''نیا دور'' (کراچی) ''ادبی دنیا'' ''ادب لطیف'' ''نقوش'' ''افکار'' ''سیپ'' ''آجکل'' ''شاعر'' ''زبان و ادب'' میں متواتر شائع ہوتے رہے۔

شکیلہ اختر کا تعلق اس دور سے ہے جب کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، بیدی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، رضیہ سجاد ظہیر، صالحہ عابد حسین، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر وغیرہ کے رشحات قلم ادبی افق پر جگمگا رہے تھے۔ اس دور میں جب کہ فنکاروں اور

ادیبوں کا مجمع تھا، سرزمین بہار سے ابھرنے والی یہ افسانہ نگار، افسانہ نگاری کے میدان میں ایک امتیازی شان کے ساتھ وارد ہوئی اور اپنی انفرادیت قائم کی۔ یہ اپنے افسانوں کا ایک جداگانہ پرچم لیے سامنے آتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر ہماری روزمرہ کی زندگی سے عبارت ہے۔ انہوں نے اپنے اردگرد پھیلے متوسط اور پسماندہ گھرانے کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں اپنے دور کی اہم سیاسی اور سماجی واقعات کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے افسانے تفریحی اور خیالی نہیں ہیں۔ ان میں حقیقی زندگی کے اتار چڑھاؤ ہیں۔ ایک عورت کی طرح انہوں نے اپنی قوم کی فطرت، ضرورت اور مجبوری کو سمجھا ہے اور اسے اپنے افسانے کے ذریعے عیاں کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ ان کے افسانے سیدھے سادے قصہ پن کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ قصہ پن کی وجہ سے ان میں کردار جانے پہچانے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض کرداروں کی ذہنی نفسیات کا تجزیہ بھی خوب کیا ہے۔

شکیلہ اختر بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے کے فن کی قدر و قیمت محسوس ہی نہیں کی گئی بلکہ اس کا اعتراف بھی کیا جاتا رہا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے آغاز کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۳۷ء میں ''مکتبہ اردو'' لاہور نے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''درپن'' شائع کیا۔ جس میں ''بکھرے ہوئے پھول'' ''بزدل'' ''نئے طریقے'' ''لوکٹ'' ''انتظار'' ''شہناز'' ''شفیق'' ''سڑک پر'' ''ایک بیل'' ''بوڑھا مدرس'' ''تین تارے'' ''کچے دھاگے'' ''سہاگ'' اور ''سرخ بندی'' عنوانات کے تحت کل ۱۴ر افسانے شامل ہیں۔

۱۹۴۸ء میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''آنکھ مچولی'' شعبۂ اردو، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلی کیشنز لمٹیڈ، ممبئی کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا۔ اس میں کل ۱۱ر افسانے ''اعتراف'' ''بزدل'' ''مد و جزر'' ''انتخاب'' ''تم کس نگری میں بستے ہو'' ''آنکھ مچولی'' ''پکار'' ''بے چاری'' ''صدائے واپسیں'' ''سوکھا ہوا پودا'' اور ''کیڑے'' شامل ہیں۔ اس کے بعد ''مکتبہ اردو'' رمنا روڈ، پٹنہ نے ۱۹۵۲ء میں ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''ڈائن'' شائع کیا۔ اس کے مشمولات میں کل ۱۲ر افسانے ہیں۔ جن کے عنوانات اس طرح ہیں: ''ڈائن'' ''پیاسی نگاہیں'' ''نفرت'' ''بن تتلی'' ''ایک دن'' ''دھند لکا'' ''قرار'' ''شاید'' ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' ''موسی'' ''گھریا ویرانہ'' ''مظلوم''۔ ۱۹۶۷ء میں رام نرائن لعل، بینی پرساد، کٹرا، الٰہ آباد، نے شکیلہ اختر کی ۱۳ر کہانیوں پر مشتمل مجموعہ ''آگ اور پتھر'' کے نام سے شائع کیا۔ اس میں جو افسانے شامل کیے گئے ان کے عنوانات یہ ہیں: ''پیاسی نگاہیں'' ''آگ اور پتھر'' ''مظلوم'' ''ننگی آنکھیں'' ''موسی'' ''بھٹکی ہوئی منزل'' ''محاذ'' ''ایک دن'' ''لجیا'' ''گھریا ویرانہ'' ''گریز'' ''بے گار'' اور ''بجھتے ہوئے چراغ''۔ بعد

ازیں ۱۹۷۶ء میں بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ کے زیر اہتمام پانچواں مجموعہ ''لہو کے مول'' اشاعت پذیر ہوا۔ اسے پروفیسر اسلم آزاد نے مرتب کیا تھا۔ اس مجموعے کی زینت کل ۱۲ رکہانیاں ہیں۔ ''ڈیٹنگ'' ''باسی بھات'' ''یوپی'' ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' ''ٹوٹی ہوئی گڑیا'' ''خش بختا'' ''دھند لکا'' ''سیندور کی ڈبیا'' ''قرار'' ''چار کوردار ساڑیاں'' ''گز بھر کفن'' اور ''لہو کے مول''۔ نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ نے ان کا چھٹا افسانوی مجموعہ ''آخری سلام'' ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ اس مجموعہ میں ۱۵ رکہانیاں اس ترتیب سے شامل ہیں: ''آہ کی صدا نکلی'' ''چائے کی کلہیا'' ''سلمتا'' ''ٹھنڈی اگنی'' ''تلاش منزل'' ''بے نام'' ''منگلا ہاٹ کی راج کماری'' ''جلتے ہوئے البم'' ''سویا ہوا خدا'' ''چھین لے مجھ سے حافظہ میرا'' ''ایک عجیب سی لڑکی'' ''فیس پاؤڈر'' ''اسٹیل والا'' ''گینگرین'' اور ''آخری سلام''۔

شکیلہ اختر کے مطبوعہ ۶ رافسانوی مجموعے میں جو افسانے شامل ہیں، ان کی مجموعی تعداد ۷۸ ر ہے۔ لیکن ان کے مشمولات کو بہ نظر غائر دیکھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ بعض افسانے مثلاً ''بزدل'' ''پیاسی نگاہیں'' ''مظلوم'' ''موسی'' ''ایک دن'' ''دھند لکا'' ''قرار'' ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' ''گھریا ویرانہ'' کئی مجموعوں میں مشترک ہیں۔ شکیلہ اختر کی بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں اور ابھی تک مختلف رسائل میں بکھری پڑی ہیں۔ شکیلہ اختر کے افسانوں میں بیانیہ اور روایتی انداز ملتا ہے۔ ان میں ماجرا وہ کردار سازی اور کہانی پن کا عنصر موجود ہے۔

شکیلہ اختر کا نقطۂ نظر وسیع اور مشاہدہ تیز ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش اور ماحولیات و سماجیات سے باخبر ہیں۔ اس لیے انہوں نے ہر موضوع پر قلم اٹھایا اور اسے نہایت ہنرمندی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا۔ شکیلہ اختر نے اپنے بعض افسانوں میں ذاتی دکھ درد، جذبۂ نارسائی، حزن و یاس اور رنج و غم کو بھی سمونے کی کاوش کی ہے۔ لیکن اسے انہوں نے فنکارانہ طریقے سے ہمہ گیر بنا دیا ہے۔ افسانہ ''درپن'' اور ''آنکھ مچولی'' اس کی بہترین مثال ہیں۔ ان کہانیوں میں شکیلہ نے حقیقت کو افسانوی شکل دینے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب ہیں۔ شکیلہ اختر نے زندگی کا باریک بینی سے مطالعہ کیا اور اپنے اردگرد کے حالات کو بڑی چابک دستی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں بہار کے متوسط اور کمزور گھرانوں کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جن کے چہرے پر امید و بیم کے نقش ڈوبتے اور ابھرتے نظر آتے ہیں۔ شکیلہ اختر کے افسانوں میں عورتوں کے دکھ درد اور مسائل کی عکاسی بھی خوب ہوئی ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے عورتوں کی نفسیات کے آئینہ دار بھی ہیں۔

شکیلہ اختر کے افسانے میں زندگی کی رمق ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کہیں بھی ترسیل کا مسئلہ

نہیں ہے بلکہ ان میں بھرپور کہانی پن ہے۔ اسی لیے ان کے افسانے غیر معمولی امتیازات کے حامل ہیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے ایک جگہ واضح طور پر لکھا ہے کہ ''اگر تین بڑی افسانہ نگاروں کا نام لیا جائے تو عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے بعد تیسرا نام شکیلہ اختر کا ہوگا'' استاد محترم تو یہاں تک لکھ بیٹھے ہیں کہ داخلیت کی بنیادوں پر شکیلہ اختر کے افسانے، عصمت چغتائی کے افسانوں سے ممتاز ترین ہیں۔ یہاں موصوف یقیناً علاقائی عصبیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ بلاشبہ شکیلہ اختر کے افسانوں میں گہری داخلیت ہے لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان میں معاشرے کے پیچ و خم اور نشیب و فراز بھی چھپے ہوئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شکیلہ اختر کے مقابل عصمت چغتائی جن بلندیوں پر ایستادہ ہیں وہاں تک رسائی شکیلہ اختر کی نہیں ہو سکی ہے۔ عصمت چغتائی اڑوس پڑوس کے گھروں میں جھانکتی ہیں اور شکیلہ اختر دلوں کو ٹٹولتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے شکیلہ اختر کے چند افسانوں کی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''شکیلہ اختر کا امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ذات کے کرب کو وسعت دے کر اسے ہمہ گیر بنا دینے کی بے پناہ صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کا افسانہ ''آنکھ مچولی'' ہے۔ آٹو بایوگرافیکل زمرے کا یہ افسانہ شکیلہ اختر کی اپنی کہانی بھی ہے اور اس قماش کی دوسری نامراد عورتوں کی بھی۔ یہاں داخلیت کا احاطہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور نامرادی کے احساسات ہمہ گیر بن گئے ہیں۔ لیکن جہاں اپنی ذات سے متعلق کوئی المیہ نہیں ہے وہاں بھی احساسات کی تیز آنچ محسوس کی جا سکتی ہے۔ ''پیاسی نگاہیں'' ''آگ اور پتھر'' ''ننگی آنکھیں'' ''بھٹکی ہوئی منزل'' اور کئی دوسرے افسانے میرے مطالعے کو تقویت دیتے ہیں۔''[۲]

بلاشبہ شکیلہ اختر حقیقت کو افسانوی شکل دیتی رہی ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی، شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شکیلہ اختر کو ترقی پسندی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ پورے معنی میں ایک گھریلو افسانہ نگار ہیں۔ اپنے دور کی دوسری تمام خواتین کے مقابلے میں ان کا امتیازی وصف یہی ہے۔''[۳]

پروفیسر وہاب اشرفی نے ''تاریخ ادب اردو'' جلد سوم کے صفحہ ۱۱۸۷ ر پر ان کی بابت لکھا ہے کہ:

''بہت کم ایسا ہوتا ہے جب انتہائی غریب گھرانوں کے قصے کو وہ موضوع بناتی ہیں۔''۴؎

مجھے مذکورہ دونوں حضرات کے بیانات سے شدید اختلاف ہے۔شکیلہ اختر نے جس دور میں لکھنا شروع کیا اس وقت ترقی پسند تحریک کا سورج اپنی تمام تر تابناکیوں کے ساتھ طلوع ہو چکا تھا۔لہٰذا وہ اپنے عہد کے تاریخی اور ثقافتی احوال وکوائف سے بے تعلق کیسے رہ سکتی تھیں۔وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تو نہ ہوئیں مگر اس کی طرف متوجہ ضرور ہوئیں۔انہوں نے خود لکھا ہے:

''وہ دور ترقی پسندوں کا تھا (ویسے تو ہر دور ہی ترقی پسندوں کا ہوتا ہے)۔زندگی سے بھرپور سانس لیتی ہوئی کہانیاں لکھی جاتی رہیں۔میں نے انہیں افسانوں سے متاثر ہو کر افسانے لکھے۔''۵؎

یہ دور سیاسی وسماجی حالات وکیفیات کے انتشار وجدوجہد پر محیط تھا۔جنگ آزادی جاری تھی اور سماجی ومعاشرتی صورت حال ناگفتہ بہ تھی۔ایسے ہی ماحول وفضا میں شکیلہ اختر نے افسانوی میدان میں قدم رکھا اور اپنے تجربات ومشاہدات کی عمدہ مصوری کی۔شکیلہ اختر نے معاشرہ نگاری کے سلسلے میں اپنے ایک ایسے افسانوی اسلوب کی تشکیل کی جس میں مشرقی معاشرے کا گہرا شعور تھا۔عہد نو کے تقاضوں کے پیش نظر ایک معیاری معاشرۂ نسواں کی تشکیل کی آرزومندی بھی ان کے یہاں ہے اور مہلک رجعت پسندی سے انحراف کا میلان بھی ہے۔مغرب میں تو پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی عورتوں کے معاشرے میں بے داری کی ایک تیز لہر آ گئی تھی۔ہندوستان میں یہ صورت حال آزادی کے بعد سامنے آئی۔حالانکہ معاشرۂ نسواں کی فلاح واصلاح اور بہبود وبہتری کی طرف توجہ اصلاح پسندوں نے بھی دی تھی۔اصلاحی کاوشوں کے اثرات کم وبیش پچاس برسوں کے بعد سامنے آئے۔شکیلہ اختر اپنے افسانوں کے ذریعہ قبل آزادی ہی کے عہد سے عورتوں کی گھریلو زندگی اور ان کی آزمائش ومشکلات کی طرف توجہ دلا رہی تھیں۔ان کے افسانوں میں نسائی معاملات ومسائل کی عکاسی بہ طریق احسن ملتی ہیں۔جذبات نگاری اور نفسیات نگاری میں بھی انہیں مہارت حاصل ہے۔شکیلہ اختر نے اپنے عہد کی معاشرتی زندگی کی عام سچائیوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔انہوں نے اپنے رومانی ونفسیاتی افسانوں کے ذریعہ عورتوں کی زندگی کے حقیقی روپ کو منظر عام پر لانے کی کوشش تو کی ہی ہے،سماجی زندگی کے انتشار وتضاد کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کی واقعیت پسندی دونوں ہی نوعیت کے افسانوں میں موجود ہے۔شکیلہ اختر کے تقریباً پچاس فیصد افسانے اپنے پلاٹ، کردار، واقعات کے تحت غریب اور نچلے طبقے کے گرد ہی طواف کرتے ہیں۔

بلاشبہ شکیلہ اختر کسی خاص نقطۂ نظر سے وفادارانہ وابستگی کو غیر مستحسن تصور کرتی تھیں۔لیکن انہوں

نے ترقی پسند تحریک کا اثر ضرور قبول کیا۔یہ حقیقت ہے کہ وہ دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح اشتراکی نہ بن سکیں۔البتہ انہیں پسماندہ اور دبے کچلے محنت کش لوگوں اور مظلوم عورتوں سے گہری ہمدردی ضرور رہی۔انہوں نے اس دور کے سیاسی وسماجی اور تہذیبی اقدار وحالات کو اپنے افسانوں میں حقیقت پسندی اور صداقت بیانی سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔وہ عصری ماحول وفضا کی عکاسی اس ہنرمندی سے کرتی ہیں کہ قاری پر اس کا شدید تاثر قائم ہوتا ہے۔''لہو کے مول''''خش بختا'' ''چار کور دار ساڑیاں''''گز بھر کفن''''محاذ''''ڈائٹنگ''''کیڑے''''سوکھا ہوا پودا'' بے چاری''''ڈائن''''صدائے واپسیں''''موسی'''' لجیا''''باسی بھات''''جھنڈا اونچا رہے ہمارا''''گریز''''بے گار''''بوڑھا مدرس'' ''نئے طریقے''''ایک بیل''''سڑک پر''''تین ستارے''اور''آگ اور پتھر'' شکیلہ اختر کی ایسی کہانیاں ہیں جن میں صحیح معنوں میں انسان دوستی اور حقیقت پسندی کا پرتو ملتا ہے۔ان میں نچلے طبقے کی محرومیوں بھری زندگی کے الم ناک گوشوں کو روشن ومنور کیا گیا ہے۔

''لہو کے مول''اس خطے کی کہانی ہے جہاں بچے پھلتے ہیں،جہالت کی کھیتی ہوتی ہے اور افلاس کا ننگا ناچ ہوتا ہے۔مناف میاں اسی سرزمین کا ایک ناکام ونامراد انسان ہے۔سخت محنت کے باوجود جب وہ اپنے بچوں کا پیٹ نہیں پال پاتا تو اپنے کھیت گروی رکھ کر ایک خوبصورت کشتی،مچھلی مارنے کا ایک جال،دو بیگھہ زمین اور ایک چھوٹا سا ندی کنارے مکان بنانے کی تمنا لیے شہر منتقل ہو جاتا ہے۔وہاں کمشنر صاحب کی کوٹھی میں وہ نوکر ہو جاتا ہے اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں کچھ اطمینان وسکون کی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔لہٰذا اس کے دل میں سوئی ہوئی جنت کی تمنا پھر سے جاگ اٹھتی ہے۔اس غریب خاندان کے آجانے سے کمشنر صاحب کے گھر میں بھی کچھ رونق سی ہو گئی ہے۔لیکن ہوتا یوں ہے کہ مناف میاں کی دوسری بچی نجمہ بس سے کچل کر مر جاتی ہے۔اس حادثے کا صدمہ سبھوں کو ہے اور مناف میاں کو بھی ہوگا۔مگر زندگی بھر دکھ درد جھیلنے والے اس غریب خاندان کی زندگی میں بچی کی محرومی سے ہی مسرت کی راہ نکلتی ہے۔کمشنر صاحب کے توسط سے مناف میاں کو بس مالک کے ذریعہ خوں بہا کے طور پر ملنے والے پانچ ہزار روپئے سے اس کی زندگی میں مسرت کی بہار آجاتی ہے اور وہ پھر سے خواب دیکھنے لگتا ہے۔بیگم صاحبہ یہ سوچ کر کانپ اٹھتی ہیں کہ غریبوں کی زندگی میں مسرت کے حصول کی راہ کس قدر کٹھن اور صبر آزما ہوتی ہے۔شکیلہ اختر نے اس کہانی میں جس حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے،وہ دیدنی ہے۔حقیقت کا ایک برہنہ اظہار دیکھئے:

''بچے تو پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔کسی کے مرنے کی قیمت کب ملی ہے۔مناف میاں کا دل خدا کا شکر اور صاحب کے احسان سے بھر

جاتا ہے۔ مناف میاں ہنسی خوشی اپنے خاندان کے ساتھ زینے سے اترتے
چلے گئے۔ سیڑھیوں پر سے دھما دھم بچے کودتے پھاندتے ہوئے اتر رہے
تھے۔ بیگم صاحبہ کی کھوئی ہوئی نگاہیں دور خلا میں نجمہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ دور
سے مناف میاں کے خاندان کی مسرت بھری آوازیں آ رہی تھیں۔''

''خش بختا'' میں بھی غریبوں کے دکھ درد کو ابھارنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ افلاس زدہ خش بختا گھر سے ملازمت کی تلاش میں نکلا ہے لیکن اس کا دل ماں کی محبت سے معمور ہے۔ بیگم صاحبہ کو اس کا قطعی احساس نہیں۔ وہ تو غریب انسان کو بے حس اور بے زبان جانور سمجھتی ہیں۔ اس لیے خش بختا کی سعادت مندی کی داد دینے کے بجائے اسے ''ماں کا جایا، کمبخت، کمینہ اور منحوس'' جیسے خطابات سے پیہم نوازتی رہتی ہیں۔

''چار کوردار ساڑیاں'' کا مکھن ایک جوان، کنواری، گدرائی حسینہ کو اپنے بازوؤں میں بھر لینے کی تمنا لیے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے کونوں میں جھریاں سمٹ آتی ہیں۔ آگے کے کئی دانت بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور اس کے کمر میں جھکاؤ اور ڈھیلا پن بھی آ جاتا ہے۔

افسانہ ''گز بھر کفن'' میں بھی سماج کی شدید معاشی نابرابری کی دل دوز، دردناک، بھیانک اور سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر مائر کے کتے کو جو غذا ملتی تھی، اسی ڈاکٹر کی نوکرانی ہمیشہ اس سے محروم رہی۔ کتے کی موت کے بعد اس کے مقبرے پر لکھا گیا ''ہماری محبتوں کا چراغ اس اندھیرے میں بجھا ہوا ہے۔'' اور اسی مقبرے کے صحن میں ایک ماں اپنی مردہ بچی کو گود میں لیے چیخ چیخ کر نوحہ کر رہی ہے کہ ''ہائے رے میری سہجادی بیٹی! تو رے ایک گج کفن بھی نا ملا۔''

''لجیا'' ایک کمزور، بے سہارا، کمسن اور بھولی بھالی لڑکی کی کہانی ہے جسے سب لوگ پیار تو کرتے ہیں مگر اسے اپنانے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ بالآخر وہ ایک اناتھ آشرم میں بھیج دی جاتی ہے۔

''ڈائٹنگ'' میں بھی کچھ یہی صورت حال ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک چھوٹی سی لڑکی کنسو سے سماج کے لوگ ہمدردی تو رکھتے ہیں لیکن اسے مستقل طور پر اپنے گھر رکھنے، ملازمت یا سہارا دینے کے لیے کوئی روادار نہیں۔

''محاذ'' میں سماج و معاشرے کے تضاد کو ابھارا گیا ہے۔ یہاں چند اشتراکیت پسند افراد بھوک، مہنگائی اور ظلم و استحصال کے خلاف بڑے بڑے محاذ کھولنے کا منصوبہ بناتے ہیں مگر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ خود اپنے گھر کے نوکر کی مفلسی دور نہیں کر پاتے اور جو اپنے بھوکے لڑکوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کتے کے نام پر کھانا مانگ کر لے جانے کو مجبور ہیں۔

''باسی بھات'' کے اندھے انسان کو خلوص کے ساتھ ملنے والے باسی بھات کو کھانے میں جو مزہ ملتا ہے وہ پراٹھے اور حلوے مانڈے میں نہیں ملتا۔ ''سوکھا ہوا پودا'' میں ایک غریب رکشے والے کی کہانی پیش کی گئی ہے۔ ''ڈائن'' میں ایک بد ہیئت، کمزور اور کریہہ شکل و صورت والی مچھوارن کی داستان ملتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کردار کو اس خوبصورتی سے ابھارا ہے جو قاری کے دل کو شدید متاثر کرتا ہے۔ ''کیڑے'' میں ہماری مہذب سوسائٹی کے اس تضاد پر بھرپور طنز کیا گیا ہے جو کسی مرنے والے کی آخری رسومات میں تو دل کھول کر حصہ لیتے ہیں لیکن اس کے یتیم اور بے سہارا بچوں کو نالی کا کیڑا بننے کے لیے بے سہارا چھوڑ دیتے ہیں۔ ''صدائے واپسیں'' میں خود فریبی جو عصری ہندوستانی معاشرے پر حاوی ہے، اس کا فنکارانہ اظہار ہوا ہے۔

شکیلہ اختر کے افسانوں میں اپنے عہد کی معاشرتی زندگی کی تلخ سچائیوں کا جو شدید احساس موجزن ہے، اس کی ایک بہترین مثال ان کا افسانہ ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' بھی ہے۔ چھوٹا ناگپور میں رہنے والے آدی باسیوں کی عسرت زدہ زندگی کی حقیقت آمیز عکاسی اس میں ملتی ہے۔ افسانہ نگار نے ایک جانب اس میں یوم آزادی کی مسرتوں اور شادمانیوں کا نقشہ پیش کیا ہے تو دوسری طرف حاشیے پر پڑے آدی باسی کی سماجی و معاشرتی بدحالی اور غربت و افلاس کی حقیقی اور موثر تصویر کشی کی ہے:

''جھنڈا اونچا رہے ہمارا، کتنا پیارا تھا یہ گیت! اور صبو کے دل کو ایک
مسرت آگیں احساس نے چونکا دیا۔ اب ہم آزاد ہیں۔ کتنے رنگوں میں سے
رنگ کر ہمارے یہ جھنڈے اب کہیں جا کر اپنے رنگ میں رنگے تھے۔ اور
ایک دم اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ گاڑی کبھی آہستہ اور کبھی تیز چلتی رہی۔ صبو کا دماغ
خیالات سے یکسر خالی ہو چکا تھا اور وہ برستے ہوئے پانی کی خوش گوار ٹھنڈک
میں بڑے مزے سے ملک راج آنند کا ناول ''قلی'' پڑھتی رہی۔ گاڑی جب
ایک بڑے سے اسٹیشن پر ٹھہر گئی تو اس نے کتاب کو بند کر دیا۔ بھیک منگوں کی
ٹولیاں، اپنی اپنی صدائیں بلند کر رہی تھیں۔ صبو کا چہرہ نفرت سے تن
گیا۔''[۷]

ملک کو آزاد ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن ان آدی باسیوں کی زندگی میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا۔ وہ آج بھی وہیں ہیں جہاں آزادی کے وقت تھے۔ آج بھی یہ خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے کو مجبور ہیں۔ حکومت کو ان کی ترقی و فلاح کی کوئی فکر نہیں۔ افسانہ نگار نے ان کی غربت و افلاس کا حقیقت آمیز نقشہ کھینچا ہے:

''اسٹیشن پر چھابڑی والے کی پراتوں سے بھاپ نکل رہی ہے۔
پہیے لگے صندوق میں رنگ برنگی مٹھائیاں بھری ہوئی ہیں۔حلوہ پوری والا حلوہ
پوری کی صدائیں بلند کر رہا ہے لیکن اس سارے شور وغل میں جو صدا بھاری
ہے، وہ ہے ایک آدی باسی ماں کی پکار، میرا بچا بھوکا ہے۔''۸؎

اس کا یہ ننگ دھڑنگ سیاہ فام تین سالہ بچہ پانی میں بھیگتا تھر تھر کانپتا ہر آنے جانے والے مسافر کے سامنے سجدہ ریز ہو کر کس طرح کاسہ لیسی کرتا ہے، دیکھئے:

''سب سے آخر میں ننگ دھڑنگ سیاہ رنگ کا ایک سہہ سالہ بچہ
المونیم کا ایک ٹوٹا ہوا پیالہ کھلونے کی طرح پکڑے لڑکھڑاتا ہوا، جیسے کھیلتے کھیلتے
تماشہ دیکھنے کو یہاں آ گیا تھا۔اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ ٹپکتے ہوئے
پانی سے شرابور ہو کر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ننّھا اور معصوم بچہ جس کے ننھے ننھے
دانت سردی سے کٹکٹا رہے تھے۔ اس کی کانپتی ہوئی آواز کبھی کبھی سنائی
دیتی 'مائی ایک ٹاکا دے دے۔دے دے مائی! ہم جھلام کرتا مائی۔' وہ اپنے
چھوٹے چھوٹے پاؤں پر دو تین بار اچھلتا اور بھیگی ہوئی زمین پر اپنی ننھی سی
پھولی ہوئی ہتھیلی رکھ کر اس پر سجدہ ریز ہو جاتا۔ پھر ڈگمگاتا ہوا خالی پیالہ سب
کے آگے پھیلا دیتا۔''۹؎

شکیلہ اختر کی ترقی پسندانہ واقعیت شعاری کی ایک عمدہ مثال افسانہ ''گریز'' کے اس اقتباس میں ملاحظہ فرمائیے::

''یہ تین اونچے گھروں والی بستی اپنے دامن میں اتنے بد بو دار
چیتھڑے سمیٹے ہوئے بھی دور سے کتنی خوبصورت نظر آتی تھی۔تین گھروں کے
ٹھیکوں کے لیے جب غلوں کا سنہرا پونج سامنے کھلیان میں لگ جاتا تو افسردہ
چہروں پر بھی تازگی کی ایک جھلک سی آجاتی۔کٹائی اور پسائی کی اجرتوں سے
زندگی کے کچھ دن آرام سے گزر جاتے تھے اور عیش کوشی حیرت میں تھی کہ اللہ!
کس قسم قسم کے غلوں میں اتنے بڑے بڑے ڈھیر کہاں چلے جاتے
تھے۔''۱۰؎

شکیلہ اختر اپنے عہد کے عصری سیاسی حالات وواقعات کی حقیقی مصوری کرتی ہیں۔افسانہ ''سوکھا ہوا

پودا'' میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے پیدا شدہ قحط اور گیرانی کی صورت حال کو کامیابی سے آشکار کیا گیا ہے۔ ''آخری سہارا''، ''ایک دن'' اور ''آگ اور پتھر'' فسادات، ملک کی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر مبنی موثر افسانے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کی ہنگامہ خیز معاشرتی صورت حال کی واقعیت پسندانہ مصوری دیکھئے:

''اب تو یہ نعرہ (اللہ اکبر) سنتے ہی کلیجہ بیٹھنے لگتا ہے کہ اللہ پھر کیا کچھ
ہوگا؟ میرے گاؤں ہلسہ میں جب ہزاروں ہزار کے بپھرے ہوئے موب کا
مقابلہ کرتے کرتے مٹھی بھر مسلمان تھک کر ختم ہونے لگے تو ان کی آخری آواز
یہی ''اللہ اکبر'' کا نعرہ تھا۔اور یہی آخری صدا ہم عورتوں کے لیے آخری نشانی
تھی کہ اب ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے۔ ہم مر رہے ہیں۔اب تم اپنے کو
کنویں میں گرا کر ایک عزت کی موت مر جاؤ۔''۱۱؎

شکیلہ اختر کے افسانوں میں فساد اور فرقہ وارانہ تشدد کا کرب ملتا ہے۔افسانہ ''ایک دن'' میں انہوں نے فسادات کے نتائج کی عمدہ نقش گری کی ہے۔موصوفہ لکھتی ہیں:

''بہار میں بینی باد کے فساد کے بعد سے ۱۰/نومبر تک کیسی کیسی
قیامتیں کمزوروں پر توڑی گئی تھیں۔کیا آج ہم اس آسانی سے اسے بھلا چکے
ہیں۔ایک ایک دن میں وہ آئے ہوئے آٹھ آٹھ ٹرک جو ذبح شدہ، جھلسائے
اور بوٹی بوٹی کٹے ہوئے معصوم شہیدوں سے اٹے رہتے تھے۔انہیں آج اتنا
جلدی فراموش کر دیا گیا؟ ہسپتال میں جب ننھے ننھے بچوں کے چھوٹے
چھوٹے ہاتھوں، پیروں اور ان کے جسموں کے نرم و نازک ٹکڑوں اور ان کی
جھلسی ہوئی لاشوں کے ڈھیر پر تڑپ تڑپ کر ہم آنسو بہائے تھے تو یقین تھا کہ
یہ داغ ساری زندگی ہمارے دلوں میں دہکتا رہے گا مگر ۱۸/نومبر سے ۸/دسمبر
تک کے اتنے قلیل عرصے ہی میں ہم انہیں اپنے دل سے اس طرح مٹا چکے
ہیں۔''۱۲؎

اسی طرح انہوں نے بعض افسانوں میں اس دور کے سیاسی، سماجی حالات اور ہندو مسلم نفرت و حقارت اور تقسیم ہند کے دل خراش حالات وحوادث کی حقیقت آمیز عکاسی کی ہے۔فرقہ وارانہ فسادات کے زیر اثر قومی، سماجی اور معاشرتی کیفیات وحالات کا ایک نقش ملاحظہ ہو:

''یہاں بھی ایک ریلیف کیمپ تھا۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد باہر برآمدے اور صحن میں بیٹھے ہوئے تھے اور گھر کے اندر عورتیں تھیں۔ اونچے اونچے اور اوسط درجے کے گھرانوں والیاں ماتم زدہ حالت، سوکھے ہوئے چہرے، روتی ہوئی آنکھیں، اس پر بھی شرم سے سمٹی جارہی تھیں۔ ان میں کسی کا جسم ایک کچھی اور پھٹی ہوئی ساڑی میں لپٹا ہوا تھا اور کسی نے چادر، پھٹی ہوئی کمبل اور برقع کے ٹکڑے سے ہی اپنے کو ڈھک رکھا تھا۔ ضرورتیں ان کے چہروں سے برس رہی تھیں مگر ان کی زبانوں پر جیسے سکتہ لگ گیا تھا۔''۱۳؎

شکیلہ اختر نے اپنے مشاہدہ کے پیش نظر زمانے کی سماجی گراوٹ پر طنز و تضحیک بھی کی ہے۔ انہوں نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے کردار و عمل کو بھی روشن کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

''مسز احسان نے کہا۔ 'میں ذرا بیگم تصدق اور آپا ناظمہ کے ساتھ اغوا کی ہوئی لڑکیوں کے سلسلے میں آئی۔ جی سے ملنے جارہی ہوں۔ آپ ان کے ساتھ یہ ساری چیزیں تقسیم کردیجئے۔''۱۴؎

شکیلہ اختر کی نگاہیں عوامی معاشرے کی تلخ اور سنگین حقیقتوں پر پھیلی ہوئی ہیں انہوں نے اپنے افسانوی فن کو تصوریت اور جذباتیت سے بچائے رکھا ہے۔ زندگی کی طبقاتی ناہمواریوں نے ہندوستانی عوام کو دکھ درد اور کرب و اذیت کی جو تلخیاں بخشی ہیں، شکیلہ اختر نے ان کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور دردمندانہ واقعیت شعاری کے ساتھ اپنے تاثرات کو افسانوی اسلوب میں منتقل کیا ہے۔ ان کی حقیقت نگاری کا انداز عریاں نہیں ہے۔ یہ فنی ضابطے کی پابند ہیں۔ افسانہ ''بے گار'' میں شکیلہ اختر نے بہار کے قصباتی ماحول میں روا رکھے جانے والے زمیندارانہ مظالم اور غریبوں کی بے بسی کی مصوری بھی اسی فنی سلیقہ مندی سے کی ہے۔ زیر نظر افسانہ کا مرکزی کردار ''سکھوا'' جب شہر سے ایک طویل مدت کے بعد اپنے گاؤں پہنچتا ہے اور گھر آتا ہے تو کچھ دیر کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی کو موجود نہ پاکر، اس کے بارے میں استفسار کرتا ہے اور پھر اس استفسار کے جواب میں جو ایک خاص ردعمل اس پر ہوتا ہے، اس کا اظہار وہ یوں کرتا ہے:

''سکھوا نے بھابھی سے پوچھا کہ، بھیا کہاں ہیں؟ بھابھی نے اپنی روئی روئی آنکھوں میں حقارت بھر کر ہونٹ بچکاتے ہوئے کہا۔ ''جائیں گے کہاں، اوہی جمیندار کے گھر پر، بے گاری میں دھر لیے گئے ہیں۔'' سکھوا کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی، بے گاری؟ زمیندار کی بے گاری ابھی تک چل

رہی ہے؟ کیسا کیسا راج الٹا۔ کیسی کیسی دنیا بدلی۔ راجے مہاراجے پرجا بن گئے اور یہاں بے گاری ابھی تک نہیں مٹی ہے؟ اس کا چہرہ غصے سے تن گیا اور اس کی آنکھوں میں نفرت کی سرخی جھلک پڑی۔''۱۵؎

سکھوا کا یہ غصہ، یہ جذبۂ نفرت، اس کے نئے شعور کا ترجمان ہے، جو کلکتہ کے آٹھ سالہ دور قیام میں اسے حاصل ہوا ہے۔ ترقی پسندوں کے یہاں اس نوعیت کے کردار انقلابی بن جاتے ہیں لیکن سکھوا کو شکیلہ اختر نے انقلاب پسند نہیں بنایا ہے۔ وہ جوش جذبہ میں زمیندار کے روبرو اپنے بڑے بھائی چندرا کے ساتھ جاتا تو ہے لیکن زمیندار کی میٹھی میٹھی باتیں اسے موہ لیتی ہیں اور وہ خود بھی اپنا ریشمی کرتا اور چمکیلے جوتے اتار کر زمیندار کی بے گاری میں لگ جاتا ہے۔ گویا وہ روایات سے خود کو بھی نہیں چھڑا سکا۔ شکیلہ اختر کے یہاں مجبور و مظلوم اور نادار کردار زیادہ ملتے ہیں اور ان کے توسط سے وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف احتجاج بھی کرتی ہیں۔

شکیلہ اختر نے بہار کے قصباتی اور شہری ماحول کے پس منظر میں متعدد کہانیاں لکھی ہیں، جن میں معاشرتی زندگی کی سرگرمیاں اپنے مختلف نشیب و فراز کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں عصری زندگی کے تجربوں کا شعور ہے جسے بیانیہ تکنیک میں پیش کیا گیا ہے۔ شکیلہ اختر نے ترقی پسند تحریک کے نعروں اور ولولوں سے خود کو محفوظ رکھا مگر صحت مند ترقی پسندانہ عوامل سے گریز بھی نہیں کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے استاذ محترم ش۔ اختر نے درست لکھا ہے کہ:

''شکیلہ اختر بہار کی وہ واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جنہوں نے پابندی اور تسلسل کے ساتھ متوسط طبقے کے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا۔ عورت حقیقی طور پر مرد کو بہتر طریقے سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ شاید اسی لیے شکیلہ اختر نے ترقی پسند ادب کو چند اچھی کہانیاں دیں۔''۱۶؎

شکیلہ اختر نے اپنے عہد و ماحول کا بہ نظر غائر مطالعہ و مشاہدہ کیا اور پھر اپنے فن پاروں میں ان کی کامیاب نقش گری کی۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی خوبصورتی سے حقیقت کو افسانوی پیرایہ عطا کردیتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے ان کے افسانوی اسلوب و مزاج کی وضاحت کرتے ہوئے بہت اچھی باتیں لکھی ہیں:

''شکیلہ اختر کا دائرۂ کار، خاندانی معاملات اور معاشرتی موضوعات ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ متوسط طبقے کی گھریلو زندگی اور اس طبقے کے افراد کے باہمی معاملات کی پیچیدگیوں پر شکیلہ اختر کی نظر بڑی گہری ہے۔ وہ بہت باریک بینی

کے ساتھ مرد و زن کے تعلقات کی الجھنوں اور تہوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتی ہیں۔ اس مطالعہ کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں نہ تو عصمت چغتائی کی طرح جنسی انحراف کا تعاقب ہے، نہ حجاب امتیاز علی کی مافوق الفطری تخیلات کی جلوہ گری، نہ قرۃ العین حیدر کی طرح صوفیانہ فلسفہ طرازی اور نہ ہاجرہ مسرور کی طرح اشتراکی پیچ وخم۔'' ۱۷؎

شکیلہ اختر کے اسلوب میں لطافت، دلکشی اور سادگی ہے۔ زبان و بیان میں کوئی تصنع آمیز رنگ نہیں ملتا۔ وہ جا بجا موقع و محل کے اعتبار سے بہار کے خصوصی محاورات اور روزمرہ کی لفظیات کو بہت چابک

آئندہ شمارے کی ایک ناتمام جھلک

ثالث، شمارہ نمبر ۱۳ میں اردو کے بے مثل افسانہ نگار، ناول نگار حسین الحق پر ایک گوشہ شایع کیا جائے گا جس میں ان کے ناول ''اماوس میں خواب'' پر، پروفیسر شافع قدوائی (علی گڈھ) اور پروفیسر علی احمد فاطمی (الہٰ آباد) کے گرانقدر مضامین پیش کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ حسین الحق کا ایک منتخب افسانہ مع تجزیہ بھی شامل رہے گا۔

دیگر مشمولات:

مضامین: خالد جاوید کے افسانوں میں وجودی عناصر.....عبدالرحمن فیصل (علی گڈھ)، عروض کا سکندر اعظم ڈاکٹر رؤف خیر (حیدرآباد)، شموئل احمد اور جنسی نفسیات.....زبیر عالم (نئی دہلی) مابعد جدید تنقیدی نظریات.....ایک تعارف.....رافد اویس بھٹ (حیدرآباد) برطانوی دور حکومت اور تعلیم نسواں.....رابعہ ناز (نئی دہلی)

ڈاکٹر شاہد جمیل (پٹنہ)، فرحین جمال (بیلجیم) اور سارا احمد (پاکستان) کے افسانے، محمد جمیل اختر (پاکستان) کا افسانچہ، حسیب اعجاز عاشر (پاکستان) کا سفرنامہ، لاہور سے قصور تک، فاطمہ عمران (پاکستان) کا شوہرنامہ

ذوالفقار نقوی (جموں کشمیر)، عرفان وحید (نئی دہلی)، اصغر شمیم (کولکاتا) اور ماجد جہانگیر مرزا (پاکستان) کی غزلیں، کے۔ بی۔ فراق (پاکستان)، سید تحسین گیلانی (جنوبی افریقہ) اور اقبال حسن آزاد کی نظمیں۔ ممتاز رفیق (پاکستان)، ارشاد آفاقی (سوپور) اور اقبال حسن آزاد کے تبصرے

''ثالث'' پر تبصرے اور قارئین کے خطوط

☆☆☆

دستی سے برتتی ہیں جو قاری کے دل پر گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ ان کے افسانوی اسلوب کی بابت ڈاکٹر ش۔ اختر کی یہ رائے صائب ہے

''ان کی تحریریں اپنی نسائیت کو کبھی نہیں چھپاتیں۔ ان کا نسوانی اسٹائل ان کی زبان کے سہارے زندہ رہتا ہے۔۔۔شکیلہ کی زبان عام طور پر سیدھی سادی ہے۔۔۔اس پر مقامی بولیوں اور تبدیلیوں کے اثرات بھی ہیں۔'' ۱۸؎

شکیلہ اختر ایک نابغۂ روزگار افسانہ نگار ہیں لیکن سچائی تو یہ ہے کہ ملک گیر سطح پر انہیں وہ پذیرائی نہیں ملی جس کی وہ مستحق ہیں۔ ان کی فنکاری پر سنجیدگی سے توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

{حواشی}

۱؎ ماہنامہ ''آجکل''، دہلی، ستمبر ۱۹۹۴ء

۲؎ ''تاریخ ادب اردو'' جلد سوم، از: وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۱۸۸

۳؎ ''نقطۂ نظر'' از: ڈاکٹر عبدالمغنی، ص: ۲۸۲

۴؎ ''تاریخ ادب اردو'' جلد سوم، از: وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۱۸۷

۵؎ ماہنامہ ''آجکل''، دہلی، ستمبر ۱۹۹۴ء

۶؎ ''لہو کے مول'' از: شکیلہ اختر، ص:

۷؎ ''جھنڈا اونچا رہے ہمارا'' مشمولہ ''لہو کے مول'' از: شکیلہ اختر، ص: ۵۶

۸؎ ایضاً، ص: ۵۷

۹؎ ایضاً، ص: ۵۸

۱۰؎ ''گریز'' مشمولہ ''آگ اور پتھر'' از: شکیلہ اختر، ص: ۲۲۶

۱۱؎ ''آگ اور پتھر'' از: شکیلہ اختر، ص: ۱۷۲

۱۲؎ افسانہ ''ایک دن'' مشمولہ ''ڈائن'' از: شکیلہ اختر، ص: ۶۹

۱۳؎ ایضاً، ص: ۱۷

۱۴۔ ایضاً،۲:۷۲

۱۵۔ ’’بے گار‘‘مشمولہ’’ آگ اور پتھر‘‘از: شکیلہ اختر،ص:۲۴۰

۱۶۔ ’’ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر‘‘ مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس،سید عاشور کاظمی،ص:۲۹۲

۱۷۔ ’’کتاب کے بعد‘‘از: ڈاکٹر عبدالمغنی،مشمولہ:’’لہو کے مول‘‘ص:۱۹۶

۱۸۔ ’’شناخت‘‘از: ڈاکٹر ش۔ اختر،ص:۲۰۴

P.G.Department of Urdu
Vinoba Bhave University
Hazaribagh. 825301(Jharkhnand)
Mob:09771010715Email: dr.h.ashraf@gmial.com

● ڈاکٹر ندیم احمد

مولانا محمد حسین آزاد کی نظم نگاری

مولانا محمد حسین آزاد کی پیدائش ۱۸۳۳ء کو دہلی میں ہوئی تھی۔ ان کے والد میر باقر علی کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ملوث ہونے کے الزام میں انگریز حاکموں نے موت کی سزا دی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد آزاد کا گھر بار بری طرح برباد ہو چکا تھا۔ تلاش معاش کی فکر میں وہ لکھنؤ پہنچے۔ جہاں فوجی اسکول میں انھیں مجبوراً ملازمت کرنی پڑی۔ اس کے بعد لاہور کے محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی جہاں انہوں نے آخری دم تک قیام کیا۔ یہاں انہوں نے کرنل ہائرائڈ کی مدد سے انجمن پنجاب نامی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے تحت اردو میں طرحی نظمیں لکھنے کی روایت کا آغاز ہوا۔ وہ کرنل ہالرائیڈ کی مہربانی کی بنا پر پنجاب میگزین کے مدیر بھی بنائے گئے اور کچھ ہی عرصہ بعد لاہور گورمنٹ کالج میں بطور عربی فارسی معلم بھی مقرر کر لیے گئے۔ ۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کے جشن زریں کے موقع پر انھیں شمس العلماء کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا۔

اگرچہ آزاد کی زندگی کافی مشکل اور جدوجہد سے پر رہی مگر انہوں نے کبھی بھی حوصلہ شکنی سے کام نہیں لیا۔ اور نہ ہی اپنے ضمیر کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ ہی کیا۔ انہوں نے اپنے نام کی مناسبت سے آزاد خیالی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا مگر کہا جاتا ہے کہ زیادہ محنت ومشقت کرنے اور بیٹی کی موت کے غم نے انھیں بہت کمزور کر دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ دماغی بیماری میں مبتلا ہو گئے اور ۲۶ جنوری 1910ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا۔

آزاد شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کے شاگرد تھے اس لیے ابتدا میں انہوں نے غزل کا راستہ اختیار کیا مگر جلد ہی وہ اس سے کنارہ کشی کر کے نظم کی راہ میں چل نکلے اور بہت جلد اس صنف کے بہترین شعرا میں شمار کیے جانے لگے ان کی نظموں کا ایک ضخیم مجموعہ ’نظم آزاد‘ کے نام سے خود ان کی زندگی میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مشہور ہو کر داد تحسین حاصل کر چکا تھا۔ اس مجموعے میں کافی سادہ اور آسان نظمیں شامل کی گئیں تھیں جن میں گنج قناعت، ودائے انصاف، صبح امید، خواب امن اور شب قدر تو باقاعدہ مثنوی کی طرح کافی طویل ہیں۔ یہ پورا مجموعہ جدید تراکیب وتفکرات کا حسین گلدستہ کہا جا سکتا ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی آزادؔ نے کھلے

ذہن اور کھلی طبیعت سے طبع آزمائی کی ہے نیرنگ خیال، سخندان فارس، نصیحت کا کرن پھول، نگارستان فارسی اور آب حیات جیسی تخلیقات ان کی فکری بصیرت اور وسیع المطالعگی کا پتا دیتی ہیں۔ آب حیات ان کا مقبول ترین نثری کارنامہ ہے جسے اردو شعرا کی تاریخ پر لکھے جانے والے تمام تذکروں پر سبقت حاصل ہے۔

جدید ہندی ادب میں جو مقام بھارتیندو ہریش چندر کا ہے وہی مقام اردو میں مولانا محمد حسین آزاد کا ہے۔ کیونکہ دونوں نے ادبی دنیا میں اپنے اپنے زمانے کو تبدیل کر دینے جیسے اہم اور غیر معمولی کارنامے کو انجام دیا ہے آزاد نے نہ صرف اردو اور فارسی نظم میں موجود نقائص کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرائی بلکہ اردو شاعروں کو اپنے محدود دائرے اور تنگ نظری کو چھوڑ کر کھلی طبیعت اور کھلے ذہن سے زندگی کو دیکھنے اور حقیقت بیانی کے ساتھ اس کی شاعری میں عکاسی کرنے کی نصیحت دی۔ آزاد نے اپنے تخیل کی بلند پروازی اور عمیق مشاہدے کی بنا پر اردو نظموں میں حقائق زندگی اور مناظر فطرت سے وابستہ شاعری کی اردو ادب میں بنیاد ڈالی اور روایتی نظموں میں موجود خامیوں کی جانب بھی شعرا حضرات کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک کانفرنس میں اردو نظم میں موجود خامیوں جیسے تکرار کلام، فرسودہ تراکیب وصنعتوں کے برمحل استعمال، لفظی آرائش وزیبائش اور غیر یقینی باتوں کے استعمال سے متعلق اپنے فکری وشعری نظریات کا بڑی بے باکی سے مظاہرہ کیا اور ان تمام خامیوں کی کھلے دل سے مخالفت اور مذمت کی۔ ساتھ ہی اردو شعرا کو بھی اس بات کے لیے خبردار کیا کہ اگر وہ اردو نظم کی ترقی چاہتے ہیں تو حسن وعشق کے مصنوعی موضوعات کو اپنی شاعری سے ترک کر دیں اور نظم جو ایک خوبصورت دلہن کی مانند ہے اسے اندھیری کوٹھری سے نکال کر نئی روشنی میں عیاں کرنے کا کام کریں انہوں نے صاف طور پر اردو شعرا کو یہ سمجھایا ہے کہ سادگی، سلاست، فطری پن اور اثر انگیزی انھیں ہندی زبان سے سیکھنی چاہیے اور مختصر جائزہ اور ندرت بیان ہمیں یورپین ادب سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح آزاد نے نہ صرف اردو شاعری کی خامیوں اور تنگ نظری ہی سے ہمیں آشنا نہیں کیا بلکہ ان سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بھی ہمارے سامنے پیش کیا اور اس کی تکمیل کے لیے انہوں نے ترقی کی راہ بھی ہموار کرنے کی پہل کی۔ خاص بات یہاں یہ بھی ہے کہ آزاد نے نظم اردو کی جن خامیوں کی جانب اپنی تقریر میں اشارہ کیا ہے انھیں عملی طور پر اپنی نظموں میں انہوں نے خود دور کر کے بھی دکھایا ہے اس طرح وہ ایک عامل کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں۔ ۸ مئی ۱۸۷۴ کو انجمن پنجاب کی جانب سے ایک تاریخی مشاعرے کا انعقاد لاہور میں کیا گیا تھا جس میں آزاد نے اپنی مشہور طویل نظم 'شب قدر' پیش کی اور اسے سامعین نے واہ واہی کے ساتھ خوب پسند کیا اس نظم میں 'شب قدر' کی اہمیت اور رات کے نکلنے جیسے واقعات کی منظر کشی نہایت پر اثر انداز میں کی گئی ہے معنوی

اعتبار سے یہ بالکل نئی اور روایتی نظموں سے کافی جداگانہ ہے۔

آزاد نے اردو شعرا کو ملک کے سماجی، تہذیبی اور سیاسی مسائل و پریشانیوں پر غور وفکر کرنے کا درس بھی دیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے قدیم تعلیم اور تہذیب کے فریب میں تبدیلی کرنے کی ضرورتوں سے بھی انکار نہیں کیا وہ ہمیں دقیانوسی خیالات سے بھی چھٹکارا دلانا چاہتے تھے۔ آزاد کی کوششوں کی وجہ سے لوگ جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے بیرونی ممالک جانے سے اور زندگی کے نئے راستے تلاشنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ آزاد نے ان لوگوں کی بہت جم کر خبر لی ہے۔ آزاد نے صاف الفاظ میں انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ گھر (ملک) کی چہار دیواری میں بند ہو کر بیوی بچوں سے ہی محبت کرتے رہنا حب الوطنی نہیں ہے۔

حب وطنی اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں
بچوں کے منہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں
ہے کوئی گود میں کوئی گردن کا ہار ہے
بی بی کہے میاں کو مجھ سے بہت پیار ہے

کہا جاتا ہے کہ آزاد واقعی بہت آزاد خیال تھے اور کسی بھی بندش میں بندھنے کے قائل نہ تھے انہوں نے الوطنی کی مذکورہ اشعار میں جو تشریح بیان کی ہے وہ ہماری تنگ نظری پر ایک تنقید بھی ہے اور آزاد کے مزاج کا آزاد نمونہ بھی ہے۔ ان کی مذکورہ باتوں کو اس زمانے کے ہندوستانیوں کے عادات اور خصلت کو سامنے رکھ کر ہی صحیح طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے جب لوگوں کا دیگر ممالک میں جانا اپنے مذہب وعقیدت کو برباد کر دینے کے مترادف خیال کیا جاتا تھا جس کے نتیجے میں گاندھی جیسی شخصیت کے روبرو بھی اسی قسم کی دشواریاں اور باتیں پیش آئی تھیں مگر تاریخ شاہد ہے کہ گاندھی جی نے ہی نہیں بلکہ اس دور کے دیگر سیاسی وسماجی لیڈران نے بیرون ممالک کے سفر کو علمی وتہذیبی تبدل کا ذریعہ خیال کیا اور آزادی کی لڑائی میں ان ہی بیرونی علمی، فکری اور سیاسی تجربات سے استفادہ حاصل کر کے اپنا اہم اور غیر معمولی کردار تحریک آزادی میں ادا کیا۔

آزاد رواج پسندی کے مخالف تھے وہ چاہے زندگی میں ہو یا ادب میں انہوں نے اردو شاعری کی خامیوں کو لے کر مخالفت تو کی ہی مذہبی برائیوں کے خلاف بھی ہمیشہ آواز اٹھاتے رہے وہ لوگوں کو اس بات سے ہمیشہ باخبر کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ لوگ مذہبی برائیوں کے جال میں نہ پھنسے آزاد کے نزدیک زنار اور سجدہ دونوں جال کی طرح ہیں جس کی وجہ سے انسان صرف ہندو یا مسلمان بن کر رہ

جاتا ہے۔

دیکھنا قید تعلق میں نہ آنا آزاد
دام آتے ہیں نظرسجدوزناد مجھے

آزاد نے اردو نظم کو کافی وسعت عطا کی۔ ان کا یہ کمال بھی کسی کرشمے سے کیا کم کہا جائے کہ انہوں نے اردو شاعری کے موضوعات کو لامحدود کر دیا۔ ان کی باریک بیں نظر سماج کے ہر طبقے پر رہی۔ انہوں نے عجیب و غریب موضوعات پر بھی نظمیں، مثنویات اور رباعیات کہیں۔ اس طرح امتحان کی تیاری میں مصروف طالب علم بھی ان کی نظم کا موضوع بن گئے۔

ہیں مدرسے کے طالب علم اپنے ہاتھ میں
کل صبح امتحاں ہے سواس کے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے
پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکروغور سے
کرلیں کچھ بھی کرنا ہے، شب درمیان ہے
کل صبح اپنی جان ہے اورامتحان ہے

یہ طلبہ کی زندگی سے جڑی ایک حقیقی اور فطری نظم ہے یہاں نہ تو اردو کی روایتی نظم جیسی نازک خیالی ہی ہے اور نہ ہی محدود دائرے میں کرشمہ دکھاتی ہوئی کوئی فن بازی۔ اسی طرح مہاجن پر لکھی گئی ان کی نظم کے کچھ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اوروہ جو لکھتی ہے مہاجن جہان میں
آدھی بچی ہے پروہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کے ہیں دم دیے ہوئے
بیٹھا ہے گودمیں یہی کھاتا لیے ہوئے

مہاجن پر نظم تحریر کر دینا صرف آزاد کا ہی شیوہ شاعری ہوسکتا ہے زندگی اور سماج کی ایسی تصویر کشی اردو شاعری کے لیے کسی دیرینا خواب سے کم نہ تھی جسے آزاد نے شرمندہ تعبیر کر دیا۔ آزاد کی ان کاوشوں کی وجہ سے اردو نظم کو نیے نیے موضوعات کی رسائی عام ہونے لگی۔ جس کی وجہ سے اردو نظم زندگی اور اس سے متعلق معاملات کو پیش کرنے کا حقیقی آئینہ اور آلہ کار بن گئی۔

آزاد نے نظم کے نیے موضوعات کی تلاش میں جہاں زندگی سے جڑے مسائل پر کھل کر غور و فکر

کرنا شروع کیا وہیں فطرت سے متعلق موضوعات پر بھی کافی دلکش نظمیں تحریر کی ہیں گرمی، بارش، سردی اور جھرنے وغیرہ جیسے موضوعات پر انہوں نے نظم کے پیرائے میں کئی حقیقی اور دلکش تصورات پیش کیے ہیں۔ اپنی مثنوی ابر رکم میں انہوں نے ساون کے بادلوں کا جھوم جھوم کر چلنا اور برسنا جیسے قدرتی عمل کی تصویر کشی نہایت خوبصورت انداز میں پیش کی ہے مگر ان بادلوں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں مچلنے والے جذبات اور ارمانوں کی کیفیت کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ساون کے گیت اٹھارہے طوفان دلوں میں ہے
پردیسیوں کی یادو ں کے ارماں دلوں میں ہے
ہرتان میں ملہسار کی مستی کا شورہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکورہے

اسی طرح گرمی میں آسمان سے تیز دھوپ کی شکل میں آگ کے برسنے اور اس کی وجہ سے لوگوں کا پانی کی

اقبال حسن آزاد کی تصانیف

قطرہ قطرہ احساس (افسانے، ۱۹۸۷)

مردم گزیدہ (افسانے، ۲۰۰۵)

پورٹریٹ (افسانے، ۲۰۱۷)

نثری اصناف ادب اور طنز و مزاح کی روایت (تحقیق، ۲۰۱۴)

اوس کے موتی (افسانے، زیر طبع)

تیسری آنکھ (تنقیدی مضامین، زیر طبع)

ایک بوند کے لیے ترسنا جیسی حقیقی کیفیت پر بھی آزاد کی پوری نظر ہے یہ اشعار گرمی کی حقیقت کو کتنی کے کوئی ساتھ عیاں کر رہے ہیں۔

دنیا میں بوند بوند کی خلقت ترس رہی
پانی کی جاے، آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے
اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے

آزاد نے شاعری میں جس فطری انداز کو برتنے کی بار بار گزارش کی ہے اسے انہوں نے بہت ابتدا سے ہی کھل کر اور عملی طور پر اپنی شاعری میں ہمشہ برتا ہے۔ آزاد نے شاعر کے لیے جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے وہ تمام خوبیاں ان کے یہاں بھی کثرت سے موجود ہیں۔ جن کا پرتو ہمیں ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔

اس طرح شب میں شاعر روشن دماغ ہے
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلا ئے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سرکو گریباں میں ڈال کے
اڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پرخیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اتار کر
جاتا زمیں کی گودمیں ہے پھر غوطہ مارکر
پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نیے نیے
ہوجاتے ہں ے وہیں دُرے مضموں نیے نیے

جوشاعر خیالات کے پرکھول کر آسمان میں پرواز کرتا ہے اور زمین کی تہوں میں جھانک کر ذرے ذرے کو پہچاننا چاہتا ہے اسے ہی نیے شاعرانہ موضوعات میسر آتے ہیں نہیں تو شاعر نئی سنائی اور فرسودہ طرز کی ہی شاعری کرسکتا ہے۔ آزاد نے شاعری میں نئے موضوعات کی تلاش کرنے اور چوری سے بچنے کی ہمیشہ تلقین کی ہے ان کے نزدیک فطرت اور زندگی کی حقیقی ملاقات سے ہی کچھ نیا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

آزاد نے مسجع نظمیں نہیں لکھیں چونکہ نظم نگاری کے پیچھے ان کا مقصد صرف لفظیات کی شاعری کرنا یا آرائشی وزیبائشی تصنیف لکھنا نہ تھا وہ تو شاعری کے ذریعے زمانے کو بدل ڈالنے اور شاعری کے روایتی

بتوں کو توڑنے میں یقین رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو ایک نئی راہ دکھائی جس پر چل کر وہ نئی زندگی اور نئے موضوعات حاصل کرسکی۔ آزاد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قنوطیت کو چھوڑ کر عمل اور مسرت کے نغمے گائے۔ اس ضمن میں ان کے مندرجہ ذیل استعار یاد کیے جاسکتے ہیں۔

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو
باغ مراد ہے ثمرافشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت میری جاں چلے چلو

یہاں چلنے اور چلتے رہنے کی آواز صاف طور پر سنائی دیتی ہے یہ زندگی کے عزم کو حاصل کرنے والا اہم نعرہ ہے۔ زندگی کی لڑائی میں حوصلہ اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھنا ہی سودمند مانا جاتا ہے اور جو مضبوط ارادوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے اس کے سامنے انسان تو کیا آسمان بھی جھک جاتا ہے۔

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائیں گے
دشمن فلک بھی ہوں گے تو سرکو جھکائیں گے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائیں گے
نیکی کے دور اٹھ کہ بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنوان چلے چلو

جنگ آزادی کے تناظر میں ان نظموں کی تشریح کو سمجھنے پر ہمیں ان اشعار کی اہمیت وافادیت کا اور بھی زیادہ اندازہ ہوجاتا ہے۔ آزادی کی لڑائی میں شامل دیوانوں کو یہ اشعار انگریزوں کے خلاف لڑنے میں یقینا ہمت حوصلہ اور ترغیب دیتے ہوں گے۔

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آزاد نے اردو شاعری میں نہ صرف طرحی اور نیچرل نظمیں لکھنے کی بنیاد رکھی بلکہ اردو نظم کے روایتی انداز اور تنگ دامن کو بھی اپنے وسیع مطالعے مشاہدے عمیق، ذاتی تجربات اور منفرد فکری بصیرت کی وجہ سے موضوعاتی اور تاثراتی طور پر نئی وسعت عطا کی۔ یہ آزاد کی ہی خوبی کہی جاسکتی ہے کہ انہوں ے اردو نظم پر قلم اٹھانے والے آئندہ نسل کے شعرا کو ایک ایسا زاویہ نظر عطا کیا جس کی پاسداری کرتے ہوئے اقبال، جوش، مجاز اور علی سردار جعفری جیسے شعرا حضرات نے اردو نظم میں طبع آزمائی ہی نہیں کی بلکہ اسے فکری اور معنوی اعتبار سے اور بھی تابدار بنا دیا۔ اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اردو نظم پر آزاد کے بہت احسانات ہیں جنہیں اردو شاعری کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

Inspecting Authority
Maulana Azad Education Foundation
(Ministry of Minority Affairs, Govt. of India)
C-36/5 Lane No.2, R.K. Marg, Chauhan Banger, Delhi-53
Email : nadeemahmad_126@yahoo.co.in
Mob. 09136162160

کوائف

پروفیسر قمر رئیس

نام: مصاحب علی خاں

قلمی نام: قمر رئیس
تاریخ پیدائش: ۱۲/جولائی ۱۹۳۲ء
تاریخ وفات: ۲۹/اپریل ۲۰۰۹ء
مقام پیدائش: شاہ جہاں پور یوپی
والد: مولوی عبدالعلی خاں
والدہ: مختار بیگم
شریک حیات: رئیس بانو
تعلیم: ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول، شاہجہاں پور
میٹرک: حسین آباد گورنمنٹ ہائی اسکول، لکھنؤ، ۱۹۴۸ء
انٹرمیڈیٹ: گاندھی فیض عام انٹرمیڈیٹ کالج، شاہجہاں پور، ۱۹۵۰ء
بی اے: آگرہ یونیورسیٹی، آگرہ، ۱۹۵۲ء
ایل ایل بی: لکھنؤ یونیورسیٹی، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء
ایم اے (اردو): فرسٹ پوزیشن، ناگپور یونیورسیٹی، ۱۹۵۵ء
پی ایچ ڈی: علی گڈھ مسلم یونیورسیٹی، علی گڈھ، ۱۹۵۸ء
موضوع: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحیثیت ناول نگار
زیر نگرانی: پروفیسر رشید احمد صدیقی
فیلوشپ:: فیکلٹی فیلوشپ، علی گڈھ مسلم یونیورسیٹی، علی گڈھ
ملازمت: لکچرر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسیٹی، ۱۹۵۹ء
ریڈر: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسیٹی، ۱۹۶۸ء
پروفیسر: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسیٹی، ۱۹۸۴ء
صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسیٹی: پہلی مرتبہ: جون ۱۹۷۶ء تا مئی ۱۹۷۹ء
دوسری مرتبہ: جنوری ۱۹۸۷ء تا جنوری ۱۹۹۰ء
دہلی یونیورسیٹی کی ملازمت سے سبکدوشی: جولائی ۱۹۹۷ء

تصانیف: (اردو)

۱۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار (پہلا ایڈیشن: ۱۹۵۹ء) بعد میں اس کے تین

ایڈیشن اور شایع ہوئے۔

۲۔اصناف ادب اردو بہ اشتراک ڈاکٹر خلیق انجم (ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ)۔

۳۔تلاش وتوازن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) خرم پبلیکیشنز، دہلی، ۱۹۶۸ء

۴۔تنقیدی تناظر (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ، ۱۹۷۷ء

۵۔اقبال کا شعور فن، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسیٹی، دہلی، ۱۹۷۹ء

۶۔پریم چند: فکر وفن (مونوگراف) پبلیکیشنز ڈویژن، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء

۷۔ پریم چند: ایک مطالعہ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء

۸۔اردو میں تنز ومذاح کی روایت اور ہم عصر رجانات (کتابچہ) اردو کادمی، دہلی، ۱۹۸۶ء

۹۔ تعبیر وتحلیل (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۵ء

۱۰۔ازبکستان : انقلاب سے انقلاب تک (ایک ادبی ڈائری) تخلیق کار پبلیشرز نئی دہلی، ۱۹۹۷ء

۱۱۔ ظہیر الدین محمد بابر: شخصیت اور شاعری، ایجوکیشنل پشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۲ء

۱۲۔اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۳ء

۱۳۔سجاد ظہیر: حیات اور ادبی خدمات (مونوگرافی) ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی ۲۰۰۵ء

تخلیق: شامِ نوروز (شعری مجموعہ) کتابی دنیا، ترکمان گیٹ دہلی، مارچ ۲۰۰۵ء

ترتیب وتدوین ومقدمہ

☆ مضامین پریم چند، علی گڑھ ۱۹۶۰ء

☆ اردو ڈراما: انتخاب مع مقدمہ، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ ۱۹۶۱ء

☆ فسانۂ آزاد (تلخیص) مع مقدمہ، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی

☆ منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے (مضامین کا مجموعہ)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء

☆ ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر، نیا سفر پلی کیشنز، دہلی ۱۹۸۷ء

☆ آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ، اردو اکادمی، دہلی، مارچ ۱۹۹۰ء

☆ پریم چند کے نمائندہ افسانے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۱ء

☆ نیا افسانہ: مسائل اور میلانات، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۲ء

☆ شعلۂ آوارگی (تدوین: نیاز حیدر کا مجموعہ کلام) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۲ء

☆ جوش ملیح آبادی: خصوصی مطالعہ، جوش انٹرنیشل سمینار کمیٹی، دہلی، جون، ۱۹۹۳ء

☆ نمائندہ اردو افسانے (انتخاب)، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۴ء

☆ معاصر اردو غزل: مسائل ومیلانات، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۴ء

☆ نغمۂ جمال زمیں (نیاز حیدر کی غزلیات مع مقدمہ) نیاز میموریل سوسائٹی، دہلی، ۲۰۰۲ء

☆ ترجمے کا فن اور روایت، ایجوکیشنل بل ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۳ء

☆ ترقی پسند ادب کے معمار (جلد اول)، نیا سفر پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۰۶ء

☆ ہندوستانی اساطیر اور فکر وفلسفہ کا اثر اردو زبان وادب پر، اردو اکادمی، دہلی ۲۰۰۹ء

ہندی کتاب

☆ پریم چند کی وچار یاترا، پبلی کشنز ڈویژن، نئی دہلی، ۱۹۸۰ء

انگریزی کتابیں

☆ Impect of October revolution on Indian literature editing with a critical introduction starling publishers, New Delhi-1977.

☆ Encyclopaedia of Indian literature.

(a) Two articels contributed to comparative Indian literature, Vol-1 Kerala Sahitya Academy-1984.

(i) Modern Poetry, (ii) Novel.

(b) Six articels contributed to Encychopaedia of Indian Literature. Sahitya Academy New Delhi, Vol- 3, 1989 Vol -4

SALIS MANIA (Noida)
JAN-18
CEO : Salis Afaque Editor : Shafaque Eqbal
Page : 16
www.salismania.com/print

1991.

تراجم:

☆ نغمۂ کشمیر، ادبِ لطیف اشاعت گھر، تاشقند ۱۹۶۴ء
☆ ارمغانِ تاشقند (ازبکستان کے قومی شاعر غفور غلام کی نظموں کا ترجمہ) تاشقند ۱۹۶۸ء
☆ شعرائے ازبکستان (دوجلدیں) (۲۵ سو دیت فشعرا کی ۷۰ نمائندہ نظموں کا ترجمہ)
غفور پبلشنگ ہاؤس تاشقند، ۱۹۷۳ء
☆ ازبکستان اور علی شیر نوائی (معاون مترجم: رحمان بیرومی محمد جانوف) ہریانہ اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء
☆ بیسویں صدی کی ازبیک شاعری، ہند۔ازبکستان دوستی سوسائٹی، دہلی، ۲۰۰۱ء
قمر رئیس کے ادبی وعلمی خدمات پر کتب ورسائل:
کتب:
☆ قمر رئیس ایک زندگی، مرتبہ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، تخلیق کار پبلشرز، دہلی، ۱۹۹۸ء
☆ ترقی پسند تنقید اور قمر رئیس، مصنف ڈاکٹر محمد شہاب الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،
۲۰۰۴ء
☆ قمر رئیس کی علمی وادبی خدمات (تنقیدی جائزہ) مصنفہ ڈاکٹر مسرت جہاں، مولانا آزاد
نیشنل اردو یونیوسیٹی، حیدرآباد، ۲۰۰۴ء
☆ تخلیق کار: قمر رئیس، مرتب: پروفیسر علی احمد فاطمی، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی،
۲۰۰۷ء
☆ قمر رئیس: علمی ادبی شناخت، مصنفہ خوشنودہ نیلوفر، تخلیق کار پبلشرز، دہلی ۲۰۰۷ء
☆ قمر رئیس کے ماہ وسال، مرتبین ڈاکٹر نگار عظیم وڈاکٹر راشد عزیز، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، دریا
گنج نئی دہلی، ۲۰۰۹ء

رسائل:

☆ ماہنامہ ''انشاء'' کلکتہ، قمر رئیس نمبر، مدیر ف۔س۔اعجاز دسمبر ۱۹۹۱ء
☆ ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی قمر رئیس پر گوشہ، ممبئی ۲۰۰۸ء
ادبی رسائل وجرائد کی ادارت:
☆ مدیر ماہنامہ ''علی گڑھ میگزین''، مسلم یونیوسیٹی علی گڑھ، ۱۹۵۷ تا ۱۹۵۸ء

☆ مدیر ماہنامہ ''ادیب'' جامعہ اردو، علی گڑھ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۹ء
☆ مدیر ماہنامہ ''عصری آگہی'' دہلی ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۳ء
☆ مدیر سہ ماہی ''عصری آگہی'' دہلی ۱۹۹۱ تا ۱۹۹۳ء
☆ مدیر سہ ماہی ''آب وگل'' دہلی
☆ مدیر سہ ماہی ''نیا سفر'' دہلی ۱۹۹۲ء تا وفات
بین الاقوامی خطبات:
☆ اکیڈمی آف لیٹرز، پاکستان
☆ جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری (کناڈا)، ۱۹۸۴ء
☆ جوش لٹریری سوسائٹی، کیلگری (کناڈا)، دوسری بار ۱۹۹۱ء
☆ جشن فیض، لندن، ۱۹۸۴ء
☆ اردو مرکز، لندن، ۱۹۸۵ء
☆ جشن احمد فراز، دبئی ۱۹۸۷
☆ تاشقند اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر جنوب ایشائی زبانوں کے شعبہ میں 'جدید اردو
ادب اور علامہ اقبال' پر خطبہ، ۱۹۹۵ء

اعزازات وانعامات

☆ اعلیٰ میرٹ ایوارڈ، برائے پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، حکومت اتر پردیش، ۱۹۶۰ء
☆ اتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ، برائے ''تنقیدی تناظر'' اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء
☆ امتیاز میر ایوارڈ، برائے تنقید، آل انڈیا میر اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء
☆ بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ، برائے ''پریم چند: فکر وفن'' (تنقید) بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ ۱۹۸۱ء
☆ ہندی اردو ادب ایوارڈ، ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء
☆ نیشنل لکچرر (اعزاز) یونیورسیٹی گرانٹس کمیشن، نئی دہلی ۱۹۸۶ء
☆ سید احتشام حسین میموریل ایوارڈ، برائے تنقید، عالمی اردو کانفرنس، نئی دہلی ۱۹۸۷ء
☆ پریم چند ایوارڈ، انڈین کلچر سوسائٹی، نئی دہلی ۱۹۸۹ء
☆ نیاز فتح پوری ادبی ایوارڈ، بزم نیاز، کراچی، ۱۹۸۹ء
☆ بھارتیہ انوواد پریشد ایوارڈ، برائے ترجمہ، ۱۹۹۴ء

☆ مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ ۱۹۹۵ء
☆ غالب ایوارڈ، برائے اردو نثر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء
☆ اردو اکادمی، دہلی ایوارڈ، برائے تنقید و تحقیق، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۲ء
☆ ظہیر الدین بابر ایوارڈ، برائے مطالعات بابر بابر شناسی، انٹرنیشنل فاؤنڈیشن، تاشقند، ۲۰۰۴ء
☆ کل ہند پرویز شاہدی ایوارڈ، اردو اکیدمی، حکومت مغربی بنگال

رکنیت

سکریٹری

☆ یونیورسیٹی اساتذہ وفد برائے جامعات ہند، دورۂ جامعات پاکستان و دیگر تعلیمی ادارے، نومبر ۱۹۷۹ء
☆ ترقی پسند مصنفین (ہند) کے نیشنل فیڈریشن کی کانفرنس، جبل پور، اکتوبر ۱۹۸۰ء
☆ پریم چند صد سالہ تقریبات نیشنل کمیٹی ۱۹۸۰ء

جنرل سکریٹری ۱۹۷۲ء (کل چار دفعہ)

☆ کل ہند انجمن اساتذہ اردو، ۱۹۷۲ تا ۱۹۸۲ء (کل چار دفعہ)
☆ کل ہند جشن فیض کمیٹی، دہلی لکھنؤ، بھوپال، الہٰ آباد اور رانچی، ۱۹۸۱ء
☆ انڈو ازبیک فرینڈشپ سوسائٹی، دہلی
☆ ہندوستان اور ازبکستان کے مابین دوستی برائے معاشرہ ۱۹۹۴ء
☆ نیاز حیدر میموریل سوسائٹی، دہلی ۱۹۹۵ء تا وفات

نائب صدر

☆ انڈو سویت کلچر سوسائٹی، دہلی ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۶ء
☆ اردو اکادمی دہلی ۲۰۰۶ء تا وفات۔

چیئرمین

☆ تخلیقی و اشاعتی سب کمیٹی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۷ء

◀◀ ● ▶▶

● پروفیسر قمر رئیس

غزل کی بے خزاں شادابی

اپنی تاریخ کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے صنفِ غزل کا جو وصفہ، قائم و دائم رہا وہ اس کی سدا بہار مقبولیت اور دلربائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اعتراضات کا ہدف نہ بنی ہو۔ اس پر حملے نہ ہوئے ہو۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض وقفوں میں وہ ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی اور اربابِ ادب کے مخصمانہ کرتبوں پر چپکے چپکے ہنستی رہی۔ ہنستی اس لیے رہی کہ اسے اپنے کردار کی سچائیوں پر اعتماد تھا۔ اپنے اس جمالیاتی جوہر اور توانائی پر اس کا ایمان تھا جس کی جڑیں آریائی تہذیب میں دور تک پھیلی تھیں۔ جس کا بنیادی وصف عوام دوستی کا پاکیزہ جذبہ تھا اور ہے۔ جس کی نزاکتوں میں انسان کے داخلی اور نفسی نگارخانوں کی آنچ روشن رہی ہے اور جس کی لطافتوں میں فنِ موسیقی کے کتنے ہی گہواروں کی رنگ سمانی زندہ ہے۔ اس لیے اس کے وجود میں یہ یقین روشن تھا کہ اس کا سفر جاری ہے اور جاری رہے گا۔

طویل فیوڈل عہد کی مصنوعی رنگینیوں سے آگے بڑھ کر اور اس عہد سے باہر نکلتے نکلتے وہ اپنی حریف ہمجولیوں قصیدہ، مثنوی، مرثیہ کا حشر دیکھ چکی تھی کہ کس طرح وہ عوام اور خواص کی نظر سے گریں۔ کیوں کر دیگر اصناف جہد للبقا کی کشاکش میں بچھڑ گئیں۔ جیسے ان کا تاریخی رول ختم ہو چکا ہو اور کس طرح عوامی تہذیب کی ناز پروردہ غزل اپنی روایتی دلربائی اور شادابی کے ساتھ زندہ رہ سکی۔ انحطاط کے گرم جھونکوں کے بجائے موسم بہار کی سبک رو، نرم ہواؤں نے ہر دور میں اسے نئی زندگی بخشی اور روح عنصر کا نیا خون دیا۔

اصل مسئلہ آج یہ نہیں ہے کہ صنفِ غزل کے ماضی اور حال کی کڑیاں جوڑ کر ہم اس کے ارتقا کی تاریخ مرتب کریں۔ یہ کام تو اردو کے نقاد اور محقق اور طلبا برسوں سے لگا تار کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

مسئلہ یہ ہے کہ کسی جذباتی ثنا خوانی کے بغیر معروضی اور علمی ڈھنگ سے ہم اس کی دوامی مقبولیت اور ہمہ گیر شہرت کے اسرار سمجھنے کی سعی کریں۔ اس کے وجود میں وہ کون سا جوہر چھپا ہے جو اسے زوال سے بچاتا رہا ہے۔ وہ کون سا آہنگ ہے جس کے زور سے ہر دور میں، مدھم سروں میں سہی، اس کا جل ترنگ بجتا رہا ہے۔

ہندوستان کی اور دنیا کی دوسری زبانوں کے شعری سرمایہ میں بھی ایسی اصناف رہی ہیں جو عوام و خواص میں مقبول رہی ہیں جیسے Ballad یا ''دوہے'' لیکن وہ بھی سامنتی اور فیوڈل عہد کے بعد سفاک صنعتی تہذیب کے دور میں اس کے طمانچے برداشت نہ کرسکیں اور رفتہ رفتہ انحطاط سے دور چار ہوئیں۔ نئی شعری اصناف کی مقبولیت نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ یہ عمل شاید فطری تھا۔ پھر آخر غزل کی رعنائی اور برنائی ان اشوبی حالات میں کیسے برقرار رہ سکی؟ یہی نہیں اس کی انوکھی مقبولیت کی وجہ سے دوسری زبانوں کے شعراء نے بھی اپنی زبان میں اسے اس طور متعارف کریا کہ وہ ان زبانوں کے نظامِ شعری کا ایک حصہ بن گئی جیسے ہندی، پنجابی، سندھی، اور گجراتی وغیرہ۔ مزہ کی بات یہ ہے کہ ان زبانوں میں غزل اپنی شعری لفظیات، بے موز وعلائم اور اپنا تہذیبی حسن بھی ساتھ لے گئی۔ کم از کم ایک حد تک ان کا نفوذ ضرور ہوا۔

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ غزل کے ثنا خوانوں کو شاید اس پر غور کرنا ہوگا، کہ آخر اردو غزل کس سماجی جوہر Ethos کی نمائندگی کرتی ہے؟ اور اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ عام طور پر اس کی نشاندہی کرتے ہوئے سرسری طور پر ہند ایرانی تہذیب یا ہند اسلامی تہذیب کا نام لیا جاتا ہے اور اس تصور کو گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کے مبہم تصورات سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ مجھے اس طرح کے سرسری اور غیر علمی فارمولوں کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ تامل رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کوئی دوسرا متبادل اور سائنٹفک فارمولہ میری جیب میں ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تاریخی شواہد کی روشنی میں رواداری والا یہ رویہ استناد نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ کئی ہزار سال کی تاریخ میں ایران اور ہندوستان کے درمیان آبادی کی بڑی ہجرتوں، بڑے فوجی حملوں اور تہذیبی رابطوں (Interaction) کا کوئی نتیجہ خیز سراغ نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ ۱۷۳۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تحریک اور کمک سے نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر کے مغلیہ اقتدار کی آخری نشانی کو تاراج کر دیا، جس کے نتیجہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو شمالی ہند پر تسلط جمانے میں آسانی ہوگئی۔ البتہ گذشتہ ڈھائی ہزار سال کے عرصہ میں ایران کے بجائے افغانستان، ترکمانستان اور وسط ایشیا کے سارے خطے سے ہندوستان کے وسیع اور گہرے تعلقات بنے رہے۔ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی تک یہ سارا علاقہ بدھ دھرم اور کشان حکمرانوں کے زیر تسلط رہا۔ اور اس کے بعد وسط ایشیا کے اسلامی دور میں بھی وسط ایشیاء اور ہندوستان کے درمیان تہذیبی، عسکری اور تجارتی رابطہ Interaction مسلسل جاری رہا۔ بے

شک اس علاقہ میں کاروباری اور اعلیٰ طبقہ کی تہذیبی زبان فارسی تھی لیکن اس پر لسانی اور تہذیبی طور پر ترکوں کا گہرا اثر تھا۔ اس لیے ہندوستان میں جس مشترکہ تہذیب کا خمیر اٹھا اس میں وسط ایشیا کا حصہ زیادہ تھا۔ یہاں یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ غزل کی صنف کا نشو نما صرف ایران یا ہماری ملک کی اردو زبان کا رہینِ منت نہیں۔ وسطی ایشیا میں ترکی خاندان کی زبانوں میں بھی یہ صنف صدیوں سے پرورش پا رہی ہے۔ دراصل یہ بحث تفصیلی گفتگو کا تقاضا کرتی ہے اس لیے میں پھر اصل موضوع کی طرف لوٹ رہا ہوں اور یہ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہو کہ وسطی ایشاء میں جس Ethos کی تشکیل عمل میں آئی اس میں ترکوں، منگولوں، چینیوں، ہندستانیوں، گرجستانیوں، عربوں اور ایرانیوں سب کا حصہ رہا ہے۔ وہاں کی غزل میں بھی یہی ثقافتی جوہر نمایاں رہا ہے۔ وسطی ایشیا اور ہندوستان کی عوامی اور شہری موسیقی میں بھی، جیسا کہ ماہرین کا خیال ہے۔ بہت سے عناصر مشترکہ ہیں۔ ہمارے راگ راگنیاں اور وسط ایشیا کے مقام ایک خاص مشابہت رکھتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ افغان، تاجک اور ازبیک عوام ہندوستان کی موسیقی کے دیوانے ہیں۔ غزل وہاں وہی جگہ بنالی ہے جو ہمارے ملک میں بنی ہے۔ غزل کے بیشتر اوزان دونوں ملکوں کے عوام کے احساسِ آہنگ کا حصہ بن کر ان کے ذوق میں رچ بس چکے ہیں۔ دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ وسطی ایشیا افغانستان اور ہندوستان (اردو) کی غزل کے رموز وعلائم کا سارا نظم مشترکہ ہے۔ عروض کے علاوہ علم بیان و بدیع اور ردیف وقوافی کے ضابطے بھی بڑی حد تک ایک جیسے ہیں۔ ظہیر الدین محمد بابر کی ایک ترکی غزل کے چند اشعار کے ترجمہ سے شاید اس کی کچھ وضاحت ہو سکے۔

زلف ولب و رخسار کی اب سر میں ہوا ہے — جس سر میں ہوا ہے، وہ مصیبت ہے بلا ہے
وہ تیر جو ابروئے کماں سے تری نکلیں — اتریں نہ وہ عشاق کے دل میں، تو خطا ہے
یہ سچ ہے سیہ چشم مرا آہوئے چیں ہے — خط اس کا خطا کار نہیں، مشکِ خطا ہے
بابرؔ جو اسے چاہے ہے، اتنا بھی سمجھ لے — اس عشق میں آگے بھی بہت جور و جفا ہے

غزل بحر ہزج میں ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اصل ترکی غزل بھی اسی وزن میں کچھ ارکان کی تبدیلی کے ساتھ تھی۔ غزل میں جملہ قافیے وہی ہیں جو بابر نے استعمال کیے ہیں۔ 'سر میں ہوا ہونے' کا محاورہ بھی ترکی اور اردو میں مشترکہ ہے۔ بابر کی غزل میں جو رعایت لفظی اور ذو معنویت ہے اردو ترجمہ میں بھی وہ اسی طرح قائم ہے۔ سیہ چشم کی رعایت سے مشک خطا آیا ہے۔ خط اور خطا کار میں بھی یہی صوتی مناسبت ہے۔ الغرض لفظیات، ضائع اور موز وعلائم کی ساری فضا وہی ہے جو اصل ترکی غزل میں ہے۔ یہی صورت حال نوائیؔ، مقیمیؔ، نادرہؔ اور دوسرے ترکی شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے۔ اردو غزل میں ہندی کے

سبک الفاظ اور افعال کے گھل مل جانے سے شاید مزید شیرینی اور موسیقی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی نہج پر مرزا غالبؔ کے اردو کلام کا ترجمہ جب ایک اردو عالم رحمان بیروی نے چغتائی ترکی میں کیا تو ان کے ترجمہ کے متن میں بھی بہت کم تبدیلیاں کرنا پڑیں اور وہ بے حد مقبول ہوا۔

وسط ایشیا کے بزرگانِ دین خصوصاً صوفیا کے جو مسلک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رائج ہوئے اور ان کے مرشدوں کے ہزار ہا مریدوں اور پیروکاروں کا جو وسیع حلقہ بنا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان میں احمد یسوی، بہاء الدین نقشبندی، خواجہ احرار ولی جیسے بزرگ بھی تھے۔ ان کے متصوفانہ خیالات وسط ایشیا کی خانقاہوں میں بھی صوفیانہ غزلوں کی شکل میں موسیقی کے ساتھ پیش ہوتے تھے۔ ہندوستان میں بھی درگاہوں میں یہ سلسلہ جاری رہا اور ہزاروں قوالوں اور غزل گائکوں نے صوفی شعرا کا کلام گا کر پیش کیا۔ افسوس کہ صوفیانہ موسیقی، قوالی اور غزل گائیکی کی کوئی مستند تاریخ مرتب نہ ہو سکی، لیکن یہ روایت تسلسل کی مضبوط کڑیوں میں بندھی رہی ہے۔ اب یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی خوش ذوق عالم اس میدان میں تحقیق کرے تو اس کے نتائج سے غزل کی ہمہ گیر مقبولیت کے کئی راز اور پہلو روشنی میں آ سکیں گے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ جب کئی نسلوں کا خون کر اس ہوتا ہے تو زیادہ دلنشیں اور انوکھے خدوخال وجود میں آتے ہیں۔ اردو غزل کے سدا بہار حسن کا راز شاید یہ بھی ہے کہ کئی زبانوں اور تہذیبوں کے اختلاط سے اس کا خمیر اٹھا ہے۔

اس سے قطع نظر غزل میں اخلاقی اور انسانی رشتوں کی شاعری بھی خاص اپیل رکھتی ہے۔ الطاف حسین حال کی اجتہادی کوششوں سے بھی اس رجحان کو تقویت ملی اور غزل کی خذباتی دنیا میں عشقِ بلا خیز کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی۔ (مراد ہے جنسی یا مجازی عشق، اگر چہ وہ بھی غزل کی بسیط مقبولیت کا موثر وسیلہ رہا ہے۔) یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صوفیانہ فکر و عمل کی اقدار اور انسانی اقدار میں کوئی بڑی مغائرت نہیں ہے۔ دونوں جمہوری اور سیکولر رویوں پر زور دیتی رہی ہیں۔ دونوں انسان کو انسان کی حیثیت سے مقتدر اور معتبر جانتی ہیں۔ دونوں دین و مذہب اور رنگ و نسل کی تفریق سے بلند ہو کر بنی نوع انسان کے درمیان محبت اور اخوت کا وظیفہ پڑھتی ہیں۔ دونوں کو ملائیت اور برہمنیت گوارا نہیں۔ دونوں کسی نہ کسی شکل میں ظلم و استبداد اور تنگ نظری کے ہر مظہر کے خلاف احتجاج کرتی رہی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ غریبوں اور بے سہارا انسانوں کے خلاف حکومت کے جبر و استبداد کے خلاف انھوں نے اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر سرکشی کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ غزل میں کہیں کہیں انسان کی بے بسی اور بے چارگی کی پکار کے طور پر اداسی اور محزونی کا لہجہ بھی حاوی ہو گیا ہے۔ غزل کا یہ وہ انداز ہے جو ہزاروں مظلوم

انسانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ ان کی تسلی کا وسیلہ بھی بنا۔ صیاد، گلچیں، محتسب، شیخ، واعظ، غزل کے یہ سارے کردار ظالموں کی صف میں ہی کھڑے نظر آتے ہیں۔ وہ Establishment کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح غزل کے معشوق کا ظلم و ستم بھی ہمیشہ معشوق کا نہیں ہوتا۔ اس پردہ میں کوئی اور بھی ہوتا ہے۔ ادھر اُدھر سے چند اشعار دیکھیے۔

باوجودے کہ پرو بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
(درد)

سرکشی ہی ہے جو دکھلاتی ہے اس مجلس میں داغ
ہو سکے تو شمع ساں دیجے رگِ گردن جلا
(میر)

ہر حکم پر ہوں راضی، ہر حال میں رہیں خوش
حصہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
(حالی)

دست صبا بھی عاجز ہے، کف گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زبان ٹھہری ہے
(فیض)

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
(مجروح)

ہمارا کفر ہی شاید نجات ایماں ہے
بلا رہا ہے بہت جادۂ حرم ہم کو
(وحید اختر)

اسی رنگ کے صدہا اشعار نقل کیے جا سکتے ہیں۔

غزل کو نیم وحشی کہنا اس کی مذمت نہیں اس کی فطرت کے ایک خاص رخ کی پردہ کشائی ہے۔ عشق کا جنون، نسوانی حسن کی سحر کاری، حسد اور رقابت کی آگ، ہم آغوشی اور وصل کا ارمان، ہجر کا عذاب، معشوق کی بے وفائی کا کرب، ان کا تعلق انسان کی ان بنیادی جبلتوں سے ہے، جن کو وحشی یا نیم وحشی کہا گیا ہے۔ تہذیب کا لبادہ تو انسان نے دس بارہ ہزار سال قبل ہی پہننا شروع کیا اس سے قبل لاکھو برس تک، وحشت اور بربریت کی دلدل میں اس نے زندگی بسر کی ہے۔ اس لیے باوجود کوشش کے اس عہد کی ان جبلتوں اور ان جذبوں سے وہ نجات نہیں پا سکا جو اس کے وجود کو جنوں انگیز اور لذت آفریں ہیجان Sensation سے معمور کر دیتے ہیں۔ عرب، افریقہ، وسط ایشیا اور ہندو پاکستان کے قبائلی یا نیم قبائلی فرقوں میں ان جذبوں کا اظہار اب بھی بڑے برہنہ شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تہذیب یافتہ قومیں بھی ان

جبلتوں کو اپنے بشری وجود کا حصہ مان چکی ہیں۔ مشرق کے ان بشریاتی مظاہر کو سمجھنے کے لیے کسی فرائڈ یا ینگ کی تحقیق کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں میر وغالب جیسے ذی شعور بڑے شعرا کے کلام میں بھی اس کی بڑی شفاف تصویریں ملتی ہیں۔ رزمیہ نظموں میں بھی نیم وحشی سروکاروں کی کمی نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر عشق کا جنوں کیز جذبہ ہے جو غزل کے موضوعات میں جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزل کے دواوین میں اس کے ہزار ہا پہلو بکھرے ہوئے ہیں۔ بقول فراق ؎

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا　　اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

عام اور عامیانہ سے کر عشق کی انتہائی پر پیچ اور ارتقائی صورتیں اردو غزل کے وسیع اور رنگا رنگ دامن میں سمائی ہوئی ہیں۔ جو ہر سطح اور ہر طبقہ کے انسانوں کو اپیل کرتی ہیں اور خوش ذوق لوگوں کی طلب اور غزل کی جمالیات کے ہر تقاضا کو پورا کرتی ہیں۔ اس کا نظارہ دیکھنا ہو تو پندرہ بیس ہزار سامعین کے بڑے مشاعروں کی جوشیلی واہ واہ کو دیکھیے۔ حسن وعشق کی واردات کو جس کثرت سے اور جس والہانہ شیفتگی کے ساتھ غزل گو شعار نے برتا ہے اس کی مثال دوسری زبانوں کی شاعری میں کم ہی ملے گی۔ عشق کا بے اماں جذبہ رنگ ونسل اور دین دھرم کی ہر قید سے مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے۔ ہندی کی عشقیہ شاعری میں عشق ومحبت کی واردات کو کرشن کی عشق پروری سے جوڑ کر نیم مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے۔ اس کا انوکھا حسن اپنی جگہ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اردو کے مسلمان غزل گو شعرا نے کرشن جی کی عشقیہ کہانیوں سے اسی لیے دامن بچایا ہے۔ کرشن جی بلاشبہ مثالی عاشق ہونے کے علاوہ اوتار بھی تھے۔

میں یہاں اردو غزل کی مقبولیت میں اس کے شعری زبان کا ذکر نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ چند لسانی اور آرائشی تجربوں سے قطع نظر دکنی دور سے دورِ حاضر تک غزل کی زبان عوامی زبان اور لہجہ سے قریب رہی ہے۔ میر تقی میر نے اپنی غزل کی تفہیم کے لیے دلی کی جامع مسجد کے محاورہ سے آشنائی کی شرط یونہی نہیں رکھی تھی۔ پھر یہ کہ زبان کی تبدیلی کے ساتھ شعرا نے غزل کی شعری زبان میں بھی ترسیل وابلاغ کی خاطر مناسب تبدیلی کی ہیں۔ عصرِ حاضر کی غزل بندی زبان کے محاورہ اور تراکیب کے قریب آ گئی ہے۔ اس عمل کے پیچھے ایک نمو پذیر ملی جلی ہندوستانی زبان کے وجود میں آنے کی نشانیاں بھی بروئے عمل رہی ہیں۔ یہ چند اشعار دیکھیے۔ ؎

زلفوں کے بادل بکھرائے تم جانے کس دیس　　غم کی دھوپ اتر آئی ہے جیون کی انگنائی میں بسے

(بیکل اتساہی)

درشن جل کے پیاسے نینا ملن کی پیاسی دیہہ　　پاس بجھے نہ میری چاہے پورا تال پیوں

(ندا فاضلی)

نیل گگن میں تیر رہا ہے اجلا اجلا پورا چاند　　کن آنکھوں سے دیکھا جائے چنچل چہرے جیسا چاند

(ندا فاضلی)

کیوں گری پاتال میں بے حال ہو کر　　آتما میری گگن کی گامنی تھی

(کرشن موہن)

صاف لگ رہا ہے کہ آنے والے دور میں بھی ملی جلی زبان کا یہ روپ ہی غزل کو راس آئے گا۔

ترقی پسندوں نے بھی اردو شاعری کو لوک ادب اور عوامی زبان سے قریب رہنے کا احساس دلایا تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ شاعری کو جاگیردارانہ تہذیب کے بجائے جمہوری اور عوامی تہذیب کے زندہ مظاہرہ کا آئینہ دار بنایا جائے۔ ان کے مسائل سے ہم آہنگ کر کے غزل کو حقیقت پسندانہ آب ورنگ بخشا جائے۔ ترقی پسند غزل گو شعار کو اس مقصد میں محدود کامیابی ہی مل سکی۔ اس لیے کہ غزل کی اپنی جو صنفی پہچان ہے اس کا جو فنی کینڈا ہے اس میں کسی بڑی تبدیلی کے لیے وہ تیار نہیں ہوتی۔ اس میں الفاظ کی تقلیل، ایجاز، رمزیت، تہ داری اور خصوصاً ذو معنویت یا کثیر معنوں کی ترسیل ایسے پہلو ہیں جن کے بغیر وہ اپنی پہچان ہیں نہیں اپنا حسن بھی کھو دیتی ہے۔ ان اوصاف سے ہی وہ دوسری شعری اصناف کے مقابلہ میں زیادہ مقبول و محبوب بن سکی۔ اپنے علامتی اور فکری نظم میں وہ کوئی بھی تصرف یا تبدیلی اسی شرط پر قبول کرتی ہے کہ اس کے اشعار کی رمزیت یا کثیر معنویت کو صدمہ نہ پہنچے اسی وصف کی بنا پر وہ ہر مذاق اور ہر فکر وخیال کے سخن شناس لوگوں میں، ہر دل عزیزی حاصل کر سکی۔ وہ کسی غیر متحرک تہذیب اور جامد نظریۂ حیات کی پابند نہیں رہی۔ اسی کی بقا اور فروغ کا راز اس کی سچائی میں ہے کہ وہ انسانی وجود کے فطری نہاں خانوں کے اسرار اور خارجی عوامل کے تحرک سے پیدا ہونے والے تہذیبی تسلسل کی معتبر نقاشی پر قادر رہی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام رسالہ: شیرازہ (سری نگر، جموں) مدیر اعلیٰ : محمد اشرف ناک مدیر : محمد سلیم سالکؔ صفحات : ۲۷۰ قیمت : ۵۰/روپے		نام رسالہ: تفہیم (راجوری) مدیر : عمر فرحت صفحات : ۱۶۲ زرسالانہ : ۵۰۰/روپے
نام رسالہ: استفسار (جے پور) مدیران : ش۔ک۔نظام، عادل منصوری صفحات : ۱۶۰ قیمت : ۷۵/روپے		نام رسالہ: سبق اردو (گوپی گنج) مدیر : دانش الٰہ آبادی صفحات : ۸۰ قیمت : ۲۵/روپے

● **ڈاکٹر نگار عظیم**

قمر رئیس کی شاعری میں رومان پرور جزیرے

تقریباً نصف صدی سے اپنے تحقیقی تنقیدی اور فکری رویوں سے اردو دنیا میں اپنی دانشوری کا لوہا منوانے والے اشتراکی نظریات کے حامی پروفیسر قمر رئیس اپنے شعری مجموعے ''شام نوروز'' کے ذریعہ اپنی شاعری کے بال و پر کھولتے ہیں اور کچھ اس ادا سے کھولتے ہیں کہ دل کی ہلچل سے لے کر دنیا کے ہنگاموں تک پے در پے بہت سے دریچے کھل جاتے ہیں جن سے آنے والے پر کیف، دلنواز اور سرد و گرم ہواؤں کے جھونکے ہمارے وجود میں ایسے سرایت کرتے ہیں کہ حیات کے رنگا رنگ مظاہر سے روبرو ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہی نہیں بہت سے سوال بھی ذہن پر دستک دینے لگتے ہیں۔

قمر صاحب کی اردو ادب سے والہانہ محبت، بے پناہ تخلیقیت، تحریکوں اور تنظیموں سے ان کی وابستگی اور محویت کو میں نے ہمیشہ شفاف پایا لیکن یہ ان کی شخصیت کا مکمل تعارف نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مخلص،

سچے، خوش گفتار، باوقار قمر رئیس کی ظاہری شخصیت اور بود و باش کے جادو نے اس سے آگے سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان کی تہہ در تہہ پرت در پرت شخصیت اتنی سہل نہیں۔ اس کا وہ موقع بھی نہیں دیتے۔ ہمیں ہی کیا یہ موقع تو انہوں نے خود کو بھی نہیں دیا۔ لکھتے ہیں:

> ''حیرت اس کی ہے اور یہ بات میرے لیے اب تک ایک معمہ سا ہے کہ اپنی شاعری سے ایسی جذباتی وابستگی کے باوجود میں نے اس کے ساتھ بے اعتنائی کا سلوک کیوں روا رکھا؟ کیوں اسے ثانوی درجہ دیا؟ شاید آئندہ کبھی اس کا تجزیہ کر سکوں اور اس کا راز سمجھ سکوں۔''

یہ بے اعتنائی قمر صاحب کے عارفانہ مزاج کی ہلکی سی جھلک ہے۔ میڈیکل اصول کے مطابق مرض جسم کے اسی حصہ پر اثر انداز ہوتا ہے جو کمزور ہو۔ ایسا لگتا ہے قمر صاحب کے علمی اور تدریسی انہماک اور عملی سرگرمیوں نے ان کے رومانی اور جذباتی وفور کو جامد سا کر رکھا تھا کمزور بنا دیا تھا لیکن سبکدوشی کے بعد تخلیقی تزک نے اس پر حملہ کیا اور وہ بیدار ہو گیا۔

زندگی کے تئیں ان کے مثبت رویوں نے انہیں بے انتہا اعتماد، قلبی تشفی اور فراوانی بخشی ہے۔ زندگی کے ایک ایک لمحہ کو وہ پوری طرح جینا جانتے ہیں۔ تاشقند میں ان کے مزاج کی لطافتوں نزاکتوں اور رنگینیوں کو دیکھا اور محسوس کیا۔ حسن و شباب کے ساغر میں ڈوبی ان کے دل کی دھڑکنوں کو حسینوں کے جھرمٹ میں ڈوبتا اور ابھرتا بھی پایا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت کے ہمہ رنگ پہلوؤں نے ان کے شعری وجدان کو قوس قزح کے رنگ عطا کیے۔

قمر صاحب کے شعری نگار خانے پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ادبی سفر ابتدا سے ہی دو دھاری تلوار رہا۔ ان کی پیدائش کا زمانہ ۱۹۳۲ء ہے۔ ظاہر ہے ان کے شعور کی بیداری سے طالب علمی تک سماجی سیاسی اور ادبی طور پر کچھ کم آشوب نہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی بدلتی تصویر، برطانوی سماج کے ظلم و استبداد کی انتہا، تقسیم برِّصغیر کا خونریز المناک منظر نامہ اور پھر لاتعداد قربانیوں کے بعد آزاد ہندوستان میں نئے نظام کے روشن ہوتے چراغ پُر امید حوصلے اور آرزوئیں اور ایک نیا ایشیاء؟؟

دوسری طرف ادب کا بدلتا منظر نامہ۔ تصوراتی تخیلاتی داستانوں، عشقیہ مثنویوں اور رومانوی ادب کی جگہ حقیقت پسندانہ ادب یعنی ادب برائے زندگی کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ ان کے شعری ادراک کی پرورش بڑے بھائی مبارک شمیم کی اور شہر کی شاعرانہ ادبی محفلوں میں خود بہ خود ہو رہی تھی۔ لکھنؤ کا ادبی ماحول اس وقت خاصا پُر شباب تھا۔ حسن و عشق کی مہمات کے واسطے بھی فضا سازگار تھی۔ حسن عابد، سبط اختر، اقبال مجید، عابد سہیل، احمد جمال پاشا، ثریا جبیں،

عثمان غنی، رتن سنگھ جیسے ادبی دوستوں کی صحبتوں نے ان محفلوں کو مزید رنگ حیات عطا کیا۔ قمر صاحب خود لکھتے ہیں:

''ان کی دوستی اور ادب دوستی میں ایک طرح کی گرویدگی اور کیف و سرور تھا۔ محمد حسن ہمارے مرشد اول تھے۔ اس زمانہ میں اس شہر نگاراں کی فضا بھی بہت رومان پرور تھی۔''

اس ادبی پُرفضا ماحول میں کچھ یارِ غار اور بھی تھے۔ فدا بھائی، ذکی، طارق، ذوالفقار اور دلدار۔ ان میں سے کئی شاعر بھی تھے۔ بس قمر صاحب کے اندر پنپتے اور کلبلاتے عشقیہ اور شعری تخم کو اور نمو ملی۔ محبت کے دیپ جلے عشق پروان چڑھے تو اس کی سوغاتیں بھی ملیں۔ قمر رئیس کے شعری وجدان کو ایک حرکی کیفیت میسر آئی۔ قبول کرتے ہیں:

''ابتدا میں سب سے بڑا محرک تو عشق ہی تھا۔ بڑے طوفانی اور بلاخیز عشق کیے ہیں میں نے۔''

کیے ہوں گے۔ لیکن عشقیہ شاعری کے نگارخانے میں صرف اتنا سا اثاثہ، چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط اور بس۔ اس کاروبار الفت میں خرچ زیادہ کیا اور جمع کم۔ عشق کی کیفیتوں کے سوز و گداز درد و غم، سیرابی اور تشنگی، تنہائی اور جدائی غمِ جاناں ان تمام سوغاتوں کے نقوش شعری پیکر میں ڈھلے لیکن بڑی سنجیدگی اور معنویت کے ساتھ۔ ایک غزل کے چند اشعار حاضر ہیں:

متاعِ فکر نشاطِ عمل، فروغ حیات
تمہارا درد تمہاری یہ آخری سوغات
حریف سارا زمانہ رقیب سارا جہاں
چرا نہ لے کوئی ڈرتا ہوں ان کا رنگ حیات
کہاں چھپاؤں اسے کس طرح بچاؤں اسے
چراغ ایک ہوا تیز اور اندھیری رات

عاشق کے لیے جدائی اور تنہائی کا درد و کرب چاہت وصل میں اور شدت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ خود ہی سامان قتل مہیا کرتا ہے اور تڑپ کر دعوت قتل بھی دیتا ہے جو وصل کی ہی صورت ہے۔ شعر کا ہر لفظ قاری کو بھی کوچۂ جاناں میں پہنچا دیتا ہے۔ غور کیجیے:

آجاؤ! یہ کوچہ بھی، رہِ گیسو و لب ہے
زنجیر بھی، خنجر پہ لہو بھی، یہاں سب ہے

لفظ 'آجاؤ' میں عاشق کی تڑپ کسی مرغ بسمل سے کم نہیں۔ شعر کا حسن بھی اس ایک لفظ میں سمٹ آیا ہے۔ خالص عشقیہ شعر ہے۔ اس کے برعکس کئی جگہ لطیف سرور آمیز، بھیگے بھیگے احساسات بھی ایک انجانی لذت سے آشنا کراتے ہیں، مثال کے طور پر:

شرارت ہی سہی، چھیڑیں تو اس نے، عنبریں زلفیں
مشامِ شوق سے ملنے، ہوائے ناز آنے دو

قمر صاحب کا بچپن کھلی فضاؤں ہرے بھرے کھیتیوں باغوں اور ندی تالابوں میں کھیلتے کودتے گزرا۔ اپنے آبائی گھر کے نزدیک کھنوت ندی کی لہراتی باہوں میں انہیں اپنے بڑے ہونے کا احساس ہوا۔ ماں کی محبت بھرے لمس کے بعد کسی کو چھونے کا پہلا احساس یہیں جاگا تھا۔ جیٹھ کی تپتی دھوپ اور لو کے گرم تھپیڑوں کے باوجود اس چھُوَن کا احساس کسی جنت سے کم نہ تھا۔ نظم کا ایک مکھڑا پیش ہے:

جیٹھ کی تپتی دھوپ میں اک دن
یاد ہے تجھ کو
تیرے ہی پہلو میں، میں نے
اک میلی سی بھیگی بھیگی ساڑی پہنے
ایک سلونی سی لڑکی کے
تن کو ہاتھ لگایا تھا
لو کے تیز تھپیڑوں میں محسوس ہوا تھا
ہم دونوں پر جیسے
سُورگ کا سایہ تھا

نظم کا راوی یہاں عشق کے اس احساس کو پیش کر رہا ہے جب عنفوانِ شباب میں نوخیز لڑکے لڑکیاں جانے انجانے اس تجربہ سے گزرتے ہیں۔ یہاں 'ہاتھ لگانا' جیسا محاورہ کا استعمال اسی پراسرار جنسی تجربہ کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ بحرکیف محبت کا یہ ابتدائی احساس قمر صاحب کو نو دس برس کی عمر میں ہی ہوا تھا۔ کھلی فضاؤں کے آزادانہ ماحول میں یہ احساس جلدی ہی جوان بھی ہو گیا۔ لیکن اس احساس پر دوسرے احساسات غالب آ گئے اور یہ احساس کئی شعبوں میں بٹ گیا۔

کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ قمر صاحب نے صرف اپنے آپ سے عشق کیا ہے کیونکہ جو خود سے عشق کرتا ہے وہ اپنی ہر چاہت، ہر مقصد اور ہر اصول سے عشق کرتا ہے اور ان کی چاہتیں ان کے اصول اور

ان کا مقصد انسانی محبت اور مساوات سے جڑا ہے۔ اس زمانہ میں پروفیسر آل احمد سرور کے گھر انجمن ترقی پسند مصنّفین کے جلسے اور نشستیں ہوتی تھیں۔ قمر صاحب بھی اپنی تازہ تخلیقات پیش کرتے اور داد و تحسین حاصل کرتے۔

قمر رئیس نے اپنے خاندان سے اخلاقی مذہبی اور علم دوستی کے تمام سبق پڑھے تھے اور ان کے مثبت اور تعمیری اثرات بھی قبول کیے اور جو نہیں کر سکے خاندان کی پرواہ کیے بغیر حاصل کرنے کے بعد بھی واپس لوٹا دیے۔ اپنے قلندرانہ مزاج کا سب سے بڑا ثبوت انہوں نے یہ دیا کہ آبائی پیشے وکالت کو خیر باد کہا۔ جرأت عشق قمر رئیس کے باغی مزاج کا پہلا قدم تھا اور وکالت کا پیشہ ترک کرنا ان کی بغاوت یا احتجاج کا دوسرا قدم۔ مزاج یا ذہن کی یہ بغاوت تخلیقی سرگرمیوں کے لیے غذا کا کام کرتی ہے۔ پہلے قدم نے قمر رئیس کی رومان پروری کو بے انتہا زرخیزی بخشی۔ انہوں نے ایک نہیں کئی کئی عشق کیے۔ عاشقانہ راہوں میں کیسی کیسی قندیلیں روشن کیں۔ یادوں کے چراغ سے احساس تنہائی میں اجالے محسوس کیے تو گیت اور سنگیت اور پھولوں کی نازک قباؤں سے خوابوں کے طلسماتی پیکر کو تھرتھراہٹ عطا کی۔ نظم ''شبِ وعدہ شبِ وعدہ'' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

شب وعدہ
نہ خلوت خانۂ شب میں
بدن کی دھیمی دھیمی آنچ سے
آتش کدے دہکے
نہ سرگوشی کے دھیمے دھیمے سُر میں
تم نے باتیں کیں
نہ مدہوشی میں پنچم سُر لگا کر
جسم و جاں حرف و زباں بہکے
ہر اک پل خالی خالی
دل کی ہر دھڑکن سوالی تھی
شب وعدہ

لاشعوری احساسات کی امیجری کو اس ترکیب سے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے کہ ہجر کی راتوں میں بھی لذتِ وصل کا میٹھا میٹھا درد جاگتا محسوس ہوتا ہے۔

شب کی نوعیت اور اہمیت ہر انسان کی زندگی میں مختلف ہے۔ وقت اور حالات کے ساتھ اس

میں تبدیلی بھی رونما ہوتی رہتی ہے۔ ہجر، وصال، تڑپ، تنہائی، غم، خوشی اداسی اور چراغاں، یادیں اور وعدے یہ سب شب کی سوغاتیں ہیں اور عشق کی سانسیں ہیں۔ عاشق ہجر کی راتوں میں آتش جاں سوز سے یادوں کے سینکڑوں دیے روشن کرتا ہے۔ قمر صاحب کی شاعری میں شب زندگی کی مثبت علامت بن کر ابھرتی ہے، صبح کی طرح روشن اور شفاف۔ قمر صاحب نے اس لفظ کو عنوان بنا کر تین نظمیں پیش کی ہیں۔ ''شبِ وعدہ شبِ وعدہ''، ''شب چراغ'' اور ''نیم شب'' — ان نظموں کا وژن ان کے شیڈس اور ان سے پیدا ہونے والے احساسات بھی ہر قاری کے لیے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ آٹھ بند کی نظم ''شب چراغ'' میں کشاکش حیات کے مختلف شیڈس بے انتہا لطافت سے نمایاں کیے گئے ہیں۔ کبھی ماضی سے حال کو روشن کیا ہے تو کبھی حال میں ماضی کے نقوش تلاش کیے ہیں تو کہیں محبوب کی یادوں کے نقوش نئے محبوب کے دلنشیں پیکر حسن میں دھڑکتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

وہی عارض وہی آنکھیں، وہی زلفیں کہ جنہیں
میں ابھی بھول نہ پایا تھا کہ پھر یاد آئے
خم ابرو بھی وہی سایۂ مژگاں بھی وہی
پھر وہی لب جنہیں دیکھو تو نہ دیکھا جائے

''نیم شب'' بھی عاشق کی تنہا خاموش اور اداسی میں ڈوبی رات کا منظرنامہ ہے لیکن یہ تنہائی اکیلے پن کی تنہائی نہیں ہے یہ تو بھیڑ میں بھی تنہا رہنے کا کرب ہے:

کتنی سنسان ہے یہ رات، گزرگاہِ حیات
کیسی خاموش ہے ناظورۂ فطرت کی برات
ایک وادی کہ جہاں رقص، نہ رومان نہ گیت
کوئی آہٹ نہیں، آواز نہیں دور و قریب

پہلے عشق کی دلفریب وارداتیں اور پہلے عشق میں ناکام ہونے کا درد کوئی عشق والوں سے پوچھے، بھولتے نہیں بھولتا۔ یہ بھی محبت کا ایک رنگ ہے کہ محبوب ہتھیار ڈال کر سارے جرم سارے گناہ اور تمام بے وفائیاں اپنے سر لے لیتا ہے۔ اس جذبہ کے تحت کہ تم خوش رہو آباد رہو بس میری یادوں میں بسے رہو۔ کس قدر جذباتی، روایتی عشق؟؟ لیکن بے پناہ والہانہ پن کے باوجود ایک ٹھہراؤ ہے جس نے شعر کے حسن میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

چلو یہ بھی اپنا ہی جرم ہے، یہ گناہ بھی مرے سر گئے

میں نہ چل سکا تو ٹھہر گیا، وہ گزر سکے تو گزر گئے
وہی مرحلے مری یاد ہیں، وہی مشغلے مرا خواب ہیں
شب و روز، جب ترے گیسوؤں، تیرے عارضوں میں ٹھہر گئے
وہ ندی کا ساحل دل ربا، ہمیں یاد سب ہے ذرا ذرا
ترے رخ پہ جب، مری اک طلب پہ، شفق کے رنگ بکھر گئے

ان تین اشعار میں غزل کی رومان آفرینی، سبک روی، ٹھہر گئے اور گزر گئے کا تضاد، احساسات کا خاموش مدوجزر اشعار کے اسلوب کو انفرادیت عطا کرتا ہے اور معشوق کی دلربائی کو حیات جاودانی۔

قمر رئیس کا زندگی کو دیکھنے اور برتنے کا سلیقہ فکری، عقلی اور معروضی ہونے کے ساتھ ساتھ احساس محبت کے ہمہ گیر جذبات کی شدت اور توانائی سے پُر ہوتا گیا۔ یہ اگر ہنر ہے! تو بہت مشکل ہنر ہے۔ قمر صاحب نے اس ہنر کو اپنی زندگی میں تو برتا ہی نثر اور شاعری میں بھی اس کی پاسداری اور آبیاری کی۔

وقفے وقفے سے قیام تاشقند کے طویل عرصہ میں قمر صاحب شاعری سے بھی جڑے رہے۔ روس، سوویت اور ازبیک شاعروں کے کلام کا اردو ترجمہ کیا۔ شعری ادب میں ان کی اس شمولیت نے ان کے چراغوں میں تیل کا کام کیا۔ تاشقند کی روپہلی نقرئی فضاؤں اور نشیلی ہواؤں نے حسن و عشق کی رنگینیوں نے منفرد جمالیاتی پیکر عطا کیے۔ یکم مئی کو شام جشن مئی کے تہوار پر ایک سیم تن رقاصہ اپنی بے ساختہ اداؤں کے جلوے بکھیرتی ہے تو بوالہوس نظریں اس کے جسمانی نشیب و فراز کا تعاقب کرتی ہیں۔ کیف اور لطف و نشاط حاصل کرتی ہیں لیکن جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک کارخانہ کی مزدور ہے، ماں ہے، تب وہی نگاہیں شرمسار ہو کر عقیدت بھرا رشتہ قائم کر لیتی ہیں۔ اشاریاتی علامتی اور استعاراتی طرزِ بیان اس نظم کی جان ہے۔ منظر کشی بے مثل ہے۔ اس نظم میں کچھ ایسا سرور اور وجد ہے جسے بیان کرنا ناممکن بھی ہے مشکل بھی۔ عورت کی پاکیزگی اس کی محنت مشقت اس کے حسن و نفاست اور ماں کے مرتبہ کو تقدیس عطا کی گئی ہے۔ عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس طویل نظم کا کچھ حصہ میں اس لیے بھی پیش کرنا چاہوں گی کہ قمر رئیس نے بہکتے بکھرتے جذبات کو غزل کی آبرو کا فن بنا کر ایک منفرد ڈائمنشن دیا ہے:

لرزشیں جسم کی
موج مے کی طرح
کیف بن کر

نگاہوں پہ چھانے لگیں
فرش پر وہ قدم
گل کترنے لگے
سرو صحرا میں پہلو بدلنے لگے
میں سراپا نظر تھا کہ پہلو سے اک
ہم نشیں نے کہا
''جانتے ہو کہ یہ کون ہے نازنیں؟
یہ مرے کارخانے کی مزدور ہے
تمغۂ ناز محنت ملا ہے اسے
تین بچوں کی ماں
تم یہ پوچھو گے پھر کیوں ہے اتنی حسیں؟
کیوں ہے اتنی جواں؟
دست محنت نے دی ہے فراغت اسے
اور فراغت سے روحِ لطافت ملی
فن نے اس کو دکھائی رہِ سرخوشی
مامتا نے متاعِ وفا بخش دی
سن کے یہ گفتگو
میری چشم ہوس جھک گئی
شام جشن مئی

ذاتی واردات کی یہ خوبصورت نظم اعلیٰ تہذیبی ثقافت اور سچے جذبوں کی بولتی تصویر ہے۔ نگاہوں کی شرمساری کو شیریں انداز بیان نے ایک طرح کی تمکنت پیدا کر دی ہے۔

غزل یا نظم میں اگر ذاتی واردات کا بیان ہے تو داستانوں کو اپنے اندر سمونے کا فن آنا بہت ضروری ہے۔ قمر رئیس کی شاعری اس فن سے مالا مال ہے۔ قمر رئیس کے یہاں عشق و محبت اور حسن و جمال کے بغیر زندگی کا ہر تصور ادھورا ہے لیکن وہ اس کے مثبت اور صحت مند احساس کی سنجیدہ روی کے بھی قائل ہیں۔ وہ زندگی کے حقیقی نشیب و فراز اس لیے انگیز کرتے ہیں کہ اس میں رومانس شامل ہے۔ عشق دراصل ایک قدرتی جذبہ

ہے۔ یہ احساس کی فراوانی پر منحصر ہے۔ عشق سچے جذبوں کی صداقت کا امین ہے۔ یہ قوت بخشتا ہے۔ ذہنی توانائی عطا کرتا ہے۔ نڈر اور بیباک بناتا ہے۔ ایک طرف لذت لمس سے سرور و کیف و مستی کی جنت آباد ہوتی ہے تو دوسری طرف جدائی کی درد بھری سوغاتیں بھی حصہ میں آتی ہیں۔ یہ قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جو میسر آجائے تو خالق کائنات کو سمجھنے کا محرک بن جائے۔ عشق کی تپش میں جل کر انسان کندن بن جاتا ہے۔ عشق اور حسن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ حسن آپ کی حسنِ نظر پر منحصر ہے۔

قمر رئیس اپنے چہرے مہرے خط و خال اور آنکھوں کی شہابی رنگت کے سبب کافی پُرکشش ہیں۔ ان کی پیشانی پر پڑی باغی آوارہ لٹ بالکل ان کے عاشقانہ دل کی مانند ہے۔ اپنی تاریخ پیدائش اور نام کے اعداد و شمار سے وہ بے انتہا عاشق مزاج ہیں۔ سیاروں کے سفر نے ہی انہیں چھکن+مصاحب علی+ قمر رئیس بنایا۔

بہت پہلے میں نے قمر رئیس کی شخصیت سے متاثر ہو کر ایک مضمون لکھا تھا جس میں ایک جملہ تھا ''پروفیسر قمر رئیس صنفِ نازک کی توجہ کا مرکز رہے ہوں گے'' لیکن تاشقند میں جب میں نے انہیں عمر کے اس حصہ میں خوبصورت مہ جبینوں کی نگاہِ التفات میں بسا پایا تو اپنے اس ناقص جملے پر سخت شرمندگی ہوئی۔ وہاں لڑکیاں ان کی دیوانی تھیں اور ان کے اردگرد تتلیوں کی مانند منڈلاتی تھیں۔ تاشقند کی دلنواز فضائیں قمر صاحب پر ہمیشہ اثر انداز ہوئیں۔ مناظر قدرت سے انہیں والہانہ لگاؤ ہے۔ وہاں کے البیلے قدرتی حسن نے ان کے دل میں نئی جوت جگائی ہے۔ محبت کے شعلے حسن کی تپش سے بھڑکے تو سینکڑوں دیپ جل اٹھے۔ وصل جاناں کی تڑپ میں شدت آئی تو آرزوؤں اور امیدوں نے انگڑائیاں لے کر کمندیں ڈال دیں۔ قمر رئیس حسن و عشق کی راہ و رسم سے بے خوف و خطر گزرے ہیں۔ واردات قلب کی بے قراریاں، جلوۂ رخ یار کی سرمستیاں، وصلِ جسم و جمال کی تمام رنگینیاں رعنائیاں ان کی شاعری میں منفرد اسلوب کے ساتھ آشکار ہیں۔ ''دھوپ بدن کی'' انہیں لطیف احساسات کی چاندنی ہے۔ عشق کی وادی میں نئی جہتوں کی تلاش میں قمر رئیس نے نئے آسمانوں کی اڑانیں بھری ہیں اور نئے نئے جزیرے آباد کیے ہیں۔ اس نظم کا آغاز موسم کے دلکش قدرتی مناظر سے ہوتا ہے لیکن وصل جاناں کے انتظار اور ناامیدی میں اس موسم کی خنک اور کٹیلی ہوائیں خنجر کا کام کرتی ہیں۔ وجود کو سواد سرما کی یخ بستہ فضا میں ٹھٹھرا ٹھٹھرا کر سمٹنے پر مجبور کر رہی ہیں لیکن اچانک:

عروسِ خوشبو، نگارِ گل رو بنا
کوئی سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا
قدح سے وہ چشم و لب کہ گویا

لطیف سی مے پلا رہا تھا

مادی سطح پر چاہت محبوب کی دیوانگی، وصل کے پُرکیف سرور آمیز سحر انگیز لمحوں کا انداز بیاں تمام جلوؤں کو پردۂ شرم و حیا سے باہر لے آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کھلی جو زلف سیاہ اس کی
کھلے جو شانے
کھلی جو باہیں
تو شبستانِ شب کے پہلو سے
آگ کے آبشار پھوٹے
کھلے جو بند قبا
تو زرتشت کے حرم میں اسیر
آتش کدے بھی چھوٹے
شعائیں اس کے بدن سے چھن کر
جو آ رہی تھیں
دمکتے شانوں پر، میکدہ ساتھ لا رہی تھیں
تپش لہو میں رواں دواں تھی
تو حشر سانسیں اٹھا رہی تھیں

اس نظم پر رومانوی دور کے شعراء کے اسالیب کا اثر ہے۔ جہاں شاعر اعضائے جسم کو متکلم بنا دیتا ہے۔ نظم پڑھتے وقت خود بہ خود محبوب کے خط و خال قاری کے سامنے ابھرنے لگتے ہیں۔ انداز بیان کی ہوش ربا روانی، سمندری لہروں کی طرح ایک مد و جزر کے تحت پورے وجود کو سیراب کرتے ہوئے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔

قمر صاحب کی یہ نظم ۱۹۸۲ء کی تخلیق ہے جب وہ تیسری مرتبہ تاشقند گئے تھے اور قلب کے شدید حملے پر ان کے ارادے اور اعضا کی قوت نے فتح پائی تھی۔

ماسکو کے گورکی پارک میں نوعمر عاشقوں کو حسن و شباب و مستی میں ڈوبے عیش کرتے جام چھلکاتے ایک دوسرے کی باہوں میں جھولتے قمر رئیس صاحب دیکھتے ہیں تو اپنی نوعمری کے عشق یاد آتے ہیں۔ دو تہذیبی نظریات کو بڑے خوبصورت انداز سے اس نظم میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک بند دیکھئے:

ایک ہم تھے کہ درِ چلمن سے
یا دریچے کے نیم وا پٹ سے
اک جھلک اس کی جب بھی پاتے تھے
جھوم اٹھتے تھے اور کئی دن تک
فرش پر پاؤں پڑ نہ پاتے تھے

حقیقت نگاری کی ایسی جاندار مرقع سازی قمر صاحب کی شاعری کی جان ہے۔ اسی نظم کے آخری بند میں مشرقی تہذیب کے پروردہ عشق میں گرفتار ہو کر پھر وہی لمحے جینے کی خواہش اور حسرت ہے۔ بندش پر غور کیجیے:

اس دردِ آشنا کو مگر
جو ملا روزگار الفت میں
یعنی دشت جنوں کی وحشت میں
اب بھی جیتے ہیں اس کی حسرت میں
بس یہی ہوسکا محبت میں

ہر تخلیق کار کی نفسیات ہر زمانہ میں اپنا ایک منفرد دائرۂ فکر و عمل رکھتی ہے اور یہی فکر و عمل اس کی پہچان قائم کرتا ہے اور منزل کے اگلے پڑاؤ تک پہنچانے میں مدد بھی۔ قمر رئیس کے دائرۂ فکر و عمل میں انسان کی بے بسی، بے چارگی اور ناپائیداری یا بے وجہ کی یاسیت کا رونا نہیں ملتا۔ مایوسیاں محرومیاں اور زندگی کے تئیں اس سے پیدا ہونے والے منفی اثرات ان کی سوچ اور دائرۂ فکر و عمل میں نہیں آتے۔ انہوں نے واردات زندگی کے فطری اور حقیقی عناصر کو قبول کیا اور اسی سے اپنے شعری چمن کو سینچا۔ حوصلہ، امید، سرخوشی اور سرمستی سے زندگی کی اور کرنے کی ترغیب دی۔ ادب اور زندگی میں تغیرات زمانہ کو بڑی فراخدلی سے قبول کیا۔ وقت کے انقلابات ان کے پردۂ فکر پر گردش کرتے ہیں تو ان کی شاعری کا محور فرد واحد سے عالم زیست پر مرکوز ہو جاتا ہے تو کبھی خود احتسابی اور انکشافِ ذات پر۔ 'نکوکاری' اور 'سراب دشت امکاں' قمر صاحب کی ایسی ہی بے مثل نظمیں ہیں۔ قمر رئیس کے شعری وجدان میں نمو اور بیداری ہے۔ عشقیہ موجوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا ان کی زندگی کے چمن کو پُر بہار بنائے رہی:

بال چاندی سے ہیں پھر بھی اکثر
دل پہ اک نقش جواں، اٹھتا ہے

یہ بالوں کی چاندی خود عاشق کی تو ہے ہی معشوق کی بھی ہوسکتی ہے کیونکہ ہم نے خود اس شعلۂ

حسن پری پیکر کو تاشقند میں دیکھا ہے۔

قمر صاحب کو دیکھ کر یقین کرنا پڑتا ہے کہ زندگی کسی پڑاؤ کا نہیں چلتے رہنے کا نام ہے۔ آرزومندیوں کا شیرازہ ہے۔ خوابوں کے تعاقب کا حسین راستہ ہے۔ تاشقند کے کلچرل سینٹر کی کتھک رقاصہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اپنے نینوں کے کجرے سے
اپنے ہونٹوں کی لالی سے
تن کی جھومتی ہریالی سے
ہاتھوں کی نازک ڈالی سے
نام اپنا ایسے لکھ جاؤ
موسم بدلیں
برف پڑے یا بادل برسیں
صدیاں گزریں یا جگ بیتیں
کوئی اس کو مٹا نہ پائے

یہ طویل نظم ''ایک آرزو'' قمر صاحب نے ۱۹۹۹ء میں سینٹر کی رقاصہ منگلا بھٹ کی رخصتی پر ایک تقریب میں ہمارے ہی سامنے پیش کی تھی۔ تو یقین ہو گیا تھا تن کی جھومتی ہریالی اور ہاتھوں کی نازک ڈالی کو اپنی طرف جھکانے کا ہنر قمر صاحب کو بہت اچھی طرح آتا ہے۔ اپنے سفر نامہ 'گردِ آوارگی' میں اس طرح کے کئی واقعات قمر صاحب کے تعلق سے میں نے تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

قمر رئیس کی شعری کائنات کے عشقیہ جزیروں کی سیر اگر قاری کے لیے خود احتسابی کا سبب بن جائے تو جذبوں کی صداقت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی؟

◀◀ ● ▶▶

H-3, Batla House, Okhla,
New Delhi110025
9968097929

نام کتاب : اماوس میں خواب (ناول) مصنف : حسین الحق صفحات : ۳۴۷ قیمت : ۳۵۰/روپے سن اشاعت: ۲۰۱۷ء		نام کتاب: خزاں کے بعد (ناول) مصنفہ: نوشابہ خاتون صفحات : ۱۲۸ قیمت :۲۵۰/روپے سن اشاعت: ۲۰۱۷ء
نام رسالہ: سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز (دربھنگہ) جنوری ۱۸ء تا مارچ ۱۸ء مدیر :منصور خوشتر صفحات: ۲۸۸ قیمت : ۳۰۰/روپے		نام رسالہ: سہ ماہی اردو (امراوتی) اکتوبر ۱۷ء تا دسمبر ۱۷ء مدیر :حسین فرحت (علیگ) صفحات:۱۰۰ قیمت : ۱۰۰/روپے
نام رسالہ: سہ ماہی ادب سلسلہ جنوری ۱۸ء تا مارچ ۱۸ء مدیر :محمد سلیم (علیگ) صفحات: ۹۶ قیمت : ۸۰/روپے		نام رسالہ: سہ ماہی محفل فنکار (گوالیار) اکتوبر ۱۷ء تا دسمبر ۱۷ء مدیر : ڈاکٹر قمر گوالیاری صفحات: ۴۰ قیمت : ۲۰/روپے

● ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

ناول کی تنقید اور قمر رئیس کی تنقیدی بصیرت

اُردو تنقید پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فکشن کی تنقید پر کافی بعد میں توجہ دی گئی۔ اس سلسلے میں اولین کاوش پروفیسر وقار عظیم اور ممتاز شیریں کی سامنے آتی ہے۔ ممتاز شیریں نے منٹو شناسی میں اساس کا کردار ادا کیا جب کہ وقار عظیم نے فکشن کے تقریباً ہر پہلو پر بے لاگ لکھا۔ وقار عظیم نے افسانہ، ناول، داستان، ڈراما وغیرہ کی تعریف اور Nominclature کے تعلق سے چھائی دُھند کو کسی حد

تک صاف کیا۔ ان کی کتب نیا افسانہ، فن افسانہ نگاری، داستان سے افسانے تک، ہمارے افسانے، فن اور فن کار وغیرہ نے اردو فکشن کی تنقید کو بنیاد فراہم کرنے کا کام کیا۔ ممتاز شیریں کی کتابیں، معیارِ تنقید اور منٹو نوری نہ ناری، بھی اس سمت ایک مستحکم پیش رفت تھی۔

اِکا دُکا مضامین سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ فکشن کی تنقید میں شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر قمر رئیس کی تثلیث نے نئی راہیں ہموار کیں۔ ان تینوں میں بھی پروفیسر قمر رئیس کو اولیت حاصل ہے کہ ان کی پریم چند پر تحقیقی و تنقیدی کتاب 1959ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف پریم چند کے فکشن پر اردو میں تحریر کردہ پہلی کتاب تھی وہیں ممتاز شیریں، وقار عظیم وغیرہ کے بعد فکشن کی تنقید پر سیر حاصل کتاب تھی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' کے پہلے ایڈیشن کے تعارف میں تحریر کیا ہی:

> ''اُردو میں شاید یہ پہلا مقالہ ہے، جس میں پریم چند کے تصورات اور ان کی تخلیقات کا اس تفصیل سے مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کے محرکات، بعض ناولوں اور کرداروں کے ماخذوں، موضوعات اور ناول کی فنی ساخت و پرداخت کو تنقیدی زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

پروفیسر قمر رئیس کی تنقیدی نگارشات کو دو حصوں میں منقسم کر کے بہ آسانی پرکھا جا سکتا ہے۔

ناول کی تنقید میں پروفیسر قمر رئیس کا تحقیقی مقالہ ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب پریم چند پر پہلی تنقیدی کتاب تو ہے ہی، ناول کی تنقید میں بھی اس سے قبل کوئی باضابطہ، تحقیقی و تنقیدی کام نہیں ملتا۔

پروفیسر قمر رئیس نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں پریم چند کے سوانحی حالات، پریم چند کی ناول نگاری، ناولوں کا جائزہ، ماقبل ناول، پریم چند کے عہد کا سیاسی، سماجی اور ثقافتی منظر نامہ، پریم چند کی تخلیقی بصیرت کا عمدگی سے جائزہ لیا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کی فکری بالیدگی اور سماج کے تئیں حساسیت کا محاکمہ ان الفاظ میں کیا:

> ''دراصل یہ حقیقت پریم چند پر ابتدا ہی میں روشن ہو گئی تھی کہ ہندوستان جیسے زراعت پیشہ ملک کی حقیقی زندگی، دیہات کی زندگی ہے اور اس زندگی کی فلاح ہندوستان کی فلاح ہے۔ وہ جانتے تھے کہ کسی ملک کی ترقی اور بہبودی کا راز اس ملک کی اقتصادی خوشحالی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کی غالب

اکثریت زراعت پیشہ رہی ہے اور وہ جس معاشی بحران اور ابتری سے دو چار تھی،
پریم چند نے اس کا مطالعہ بہت قریب سے کیا تھا۔''

[پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار، قمر رئیس ص 63]

قمر رئیس نے اپنے مطالعے میں پریم چند کے فکشن کے محرکات اور سماجی و سیاسی اسباب و علل کا پتا لگایا تھا۔ انہوں نے پریم چند کے عہد کے ہندستان اور پریم چند کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے نتیجہ اخذ کیا تھا کہ دراصل ہندوستان کی ترقی اور فلاح، دیہی زندگی کے مسائل کا حل ہے اور یہی سبب تھا کہ پریم چند کے فکشن کا محور دیہات اور قصبات رہے۔ انہوں نے گاندھی جی کی باعمل اور متحرک زندگی، ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ان کی عملی جد و جہد اور کاوشوں کو قریب سے دیکھا، ان سے متاثر ہوئے اور اُنہیں اپنے قلم کے ذریعہ ادب کا حصہ بنا کر دوام عطا کیا، ساتھ ہی ملک و قوم کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کیا۔ یہی نہیں پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کے فکشن کے محرکات کی کلید کا پتا لگا لیا تھا، کہ پریم چند نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی بدحالی، عوام کے بنیادی مسائل اور وقت کی ضرورت کا فن کارانہ اظہار اپنے ناولوں اور افسانوں میں کیا۔ پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''پریم چند کے ناول اپنے عہد کے ان ہمہ گیر اور نو بہ نو تغیرات کی تاریخ ہیں۔ وہ اس عہد کی سماجی گھٹن، سیاسی اضطراب اور اقتصادی بد حالی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ پریم چند پہلے عوامی فن کار ہیں جنہوں نے اُردو ادب کو سماجی حقیقت نگاری سے روشناس کرایا۔ انہوں نے شعوری طور پر اپنے عہد کی زندگی کے بنیادی مسائل تک رسائی حاصل کی۔''

پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں کا عمیق مطالعہ کیا ہے، انہوں نے پریم چند کے تقریباً ہر ناول پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ناولوں کی کہانی، پلاٹ، کردار، موضوعات، سماجی محرکات کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے ایک اچھے ناقد کی طرح پریم چند کے ناولوں کے معائب اور محاسن کا بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ متعدد جگہ وہ دوسرے ناقدین کی آرا کی تردید بھی کرتے نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ پریم چند کے بعض بیانات سے بھی صد فی صد اتفاق نہیں کرتے اور اپنی بات، اپنا نظریہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس کی پریم چند کے ناولوں پر بے باک رایوں کو دو زمروں میں منقسم کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔

ا۔ ناولوں کے معائب:

قمر رئیس کو پڑھتے وقت اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی شخصیت کے

رعب میں نہیں آتے اور تخلیق کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیتے ہیں۔ جائزہ کے بعد خامیوں کو چھپاتے بھی نہیں بلکہ ان کا تخلیقی اظہار کرتے ہیں:

I- یہ (اسرار معابد) ادھورا ناول رتن ناتھ سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' کے طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے۔

II- فنی اعتبار سے اس ناول (ہم خرما و ہم ثواب) میں کوئی حسن و خوبی نہیں ہے بلکہ اگر کردار نگاری کو ناول کا بنیادی وصف مانا جائے تو اُسے ناول کہنا بھی درست نہ ہوگا۔

III- پریم چند کے یہ مختصر ناول (جلوۂ ایثار اور بیوہ) ان کی فنی کاوشوں کے ابتدائی نمونے ہیں۔ یہاں سے ان کی ناول نگاری کا چوبیس سالہ سفر شروع ہوتا ہے۔ ان ناولوں میں پلاٹ کی تعمیر، شخصیت نگاری اور زبان و بیان کی بہت سی کوتاہیاں موجود ہیں اور اس کا سبب یہ کہ اس وقت اردو میں فنی حیثیت سے ناول کا کوئی ایسا مکمل اور معیاری نمونہ Pattern موجود نہیں تھا جو پریم چند کے لیے مشعلِ راہ کا کام دیتا، اس لیے انہوں نے اپنے ہی غور و فکر کے سہارے اپنے فن کی راہوں کا تعین کیا۔

IV۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ناول 'بازارِ حسن' کے بیشتر کردار، واقعات اور مکالموں کے آئینے میں جس طرح نمودار ہوتے ہیں ان کی رومانیت اور غیر فطری انداز فنی اعتبار سے ناول کی وقعت بہت کم کر دیتا ہے۔ سمن کو جلد سے جلد طوائف بنانے اور اس کے نتائج کو سامنے لا کر پلاٹ میں پیچیدگی اور کلائمکس پیدا کرنے کی دُھن میں مصنف حادثات اور اتفاقات کا سہارا لیتا ہے۔

درج بالا چاروں نکات میں پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کے ناول ''اسرار معابد''، ''ہم خرما و ہم ثواب''، ''جلوۂ ایثار''، ''بیوہ''، ''بازارِ حسن'' کے تعلق سے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ان کے یہ جملے جہاں پریم چند کے ناولوں میں موجود خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، وہیں صنفِ ناول کے پوری طرح ترقی یافتہ نہ ہونے اور تشکیلی دور سے گذرنے کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں۔ پریم چند کے معائب کا ذکر کرتے وقت انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ پریم چند سے قبل اردو ناول کی کوئی بہت مستحکم روایت نہیں تھی۔ ناول فنی اعتبار سے تشکیلیت کے دور سے گذر رہا تھا۔ ''امراؤ جان ادا'' کی صورت میں ایک سماجی ناول ضرور موجود

تھا، جو کامیاب ناول بھی لیکن فنی اعتبار سے اس میں چند خامیاں موجود تھیں۔ اسی لیے پریم چند کے تعلق سے وہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں وراثت میں ناول کا مضبوط و مستحکم نمونہ نہیں ملا تھا، یہی سبب تھا کہ پریم چند نے اپنی راہیں خود متعین کیں۔ ناول کے خدوخال خود ڈھالنے کی کوشش کی۔ ایسے میں کوتاہیوں کا درآنا عین فطری امر تھا۔

۲۔ ناولوں کے محاسن:

پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت کسی جانبدارانہ رویے کا اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے معیارِ نقد کا خیال رکھا اور تنقید کے تقاضوں کے پیشِ نظر تخلیق کے سمندر میں غوطہ لگایا کہ جواہرات، بیش قیمت پتھر، معمولی سنگ ریزے اور سیپیاں تک نکال لائے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ناول تشکیلی دور سے گذر رہا تھا، ایسے میں ناول نگار کی غلطیوں کو پسِ پشت بھی ڈالا جا سکتا تھا لیکن تنقیدی فریضے کو نبھاتے ہوئے انہوں نے جہاں معائب کی نشاندہی کی وہیں محاسن پر بھی نگاہ ڈالی۔ ان کی ناول نگاری کے اوصاف کو بھی عمدگی اور ایمانداری سے بلاکم وکاست تحریر کیا۔

I۔ فنی اعتبار سے یہ ناول (نرملا اور غبن) پریم چند کے کامیاب ناولوں میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ان ناولوں میں پریم چند کی مثالیت کم سے کم نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے پلاٹ کا نشوونما مصنف کے اشاروں پر نہیں، اشخاص کے عمل اور ردعمل سے ہوتا ہے۔ ان کے بیشتر کردار بدلتے ہوئے حالات میں اپنے مزاج کی خاص افتاد کے تحت سوچتے سمجھتے اور حرکت کرتے ہیں۔

II۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زندگی کے جتنے مسائل اور خود زندگی کی جتنی وسیع تصویر اس ناول (چوگانِ ہستی) میں ہے وہ ''گؤدان'' کے علاوہ اردو کے کسی اور ناول میں نہیں ملتی۔

III۔ ناول کے فن پر پریم چند کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ زبان و بیان اور جمالیاتی تکمیل کے اعتبار سے بھی ''پردۂ مجاز'' کے کچھ حصے موثر اور دل آویز ہیں۔

IV۔ پریم چند نے فکری اعتبار سے اس ناول (میدانِ عمل) میں ایک نئی منزل کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ اس ناول میں ''گوشۂ عافیت'' کے بعد پہلی

بار قومی سیاست کا طبقاتی کردار نمایاں ہوا ہے۔

V۔ دیہات کی سادہ اور فطری زندگی، کسانوں کی معاشی بدحالی، ان کی وضع داری، قسمت پرستی اور مذہبی عقیدت مندی، ان کے فرسودہ رسم و رواج، اخلاقی برائیوں میں ملوث ہونے کے باوجود ان کی سادگی اور سادہ لوحی اس ناول (میدانِ عمل) میں پریم چند نے ان تمام پہلوؤں کی مصوری کرتے ہوئے حقیقت نگاری کا ایک اعلیٰ معیار پیش کیا ہے۔

VI۔ اس (گؤدان) میں ان کی حقیقت نگاری اور صناعی درجہ کمال پر ہے۔ فکر و شعور کے اعتبار سے بھی وہ آگے بڑھے ہیں اور عصری زندگی کے بارے میں ان کا تنقیدی زاویۂ نظر بدلا ہے۔ ان کی عوام دوستی میں ایک نکھرا ہوا طبقاتی شعور بھی بروئے کار نظر آتا ہے۔

VII۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ ناول (گؤدان) پریم چند کی ساری عمر کی مشق و مہارت، مشاہدات، تجربات اور غور و فکر کا ماحصل ہے۔

پریم چند کے مختلف ناولوں کے اوصاف، فکری شناخت اور فنی پختگی کے حوالے سے یہ چند اشارے ہیں، جو پروفیسر قمر رئیس کے پُرمغز مقالے سے ماخوذ ہیں۔ ان اشاروں کی روشنی میں وہ بہ آسانی باور کرا دیتے ہیں کہ پریم چند کا فن بتدریج ارتقا کے مراحل سے گذر کر پختگی، عمدگی اور تکمیلیت کی منزل پر ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری کے ان مدارج کا عمیق مطالعہ قمر رئیس کی ژرف نگاہی، دور بینی اور معیارِ نقد کا بھی پتا دیتا ہے۔ انہوں نے پریم چند کو جس معروضی انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قمر رئیس سے قبل، یہ کوشش نہیں ہوئی۔ اس لیے پریم چند شناسی میں قمر رئیس کی اولیت قائم ہوتی ہے۔ در اصل قمر رئیس متن پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ ناول ہو یا افسانہ، لفظ کے باطن میں اتر کر معنی کی سطحوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور اپنے مخصوص لب و لہجے میں صفحۂ قرطاس پر اتارتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں کے علاوہ افسانوں کا بھی شاندار تجزیہ کیا۔ لیکن بات صرف ناول ہی کی، کی جائے تو ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے پریم چند کے علاوہ ناول نگاروں پر کام نہ کیا ہو۔ ناول کے فروغ، سمت و رفتار، ہیئت، تکنیک اور بتدریج ارتقاء پر قمر رئیس کے دو خاص مضامین ''جدید اردو ناول (تشکیل سے تکمیل تک) اور ''جدید اردو ناول میں اظہار و اسلوب کے تجربے'' خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ان کے دو اور اہم مضامین ''اردو ناول کا تشکیلی دور'' اور ''ترقی پسند تحریک اور

اردو ناول'' کو بھی شامل کرلیا جائے تو تقریباً ایک صدی کا اردو ناول اپنے تمام تر رموز اور نشیب و فراز کے سامنے آجاتا ہے۔ ان چار مضامین کے مطالعے سے قاری اور طالب علم کو بہ آسانی 1869ء سے 1970ء تک اردو ناول کا بتدریج ارتقاء اور فنی اعتبار سے ناولوں کا جائزہ مل جاتا ہے۔ قمر رئیس کی ناول پر کی گئی تنقید زبان و بیان کی ثقالت سے بھی پاک ہے، وہ بہت سہل پسندی سے اپنا نظریہ رکھتے ہیں اور قاری کو بہ آسانی ناول کی کلید تک رسائی حاصل ہوجاتی ہے۔ ناول کی سمت و رفتار اور کچھ ناولوں پر ان کی تنقید پر مبنی نکات پر غور کرتے ہیں:

- ناول میں واقعہ نگاری کا یہ تصور اتنا ہی ناقص ہے جتنے کہ سرشار کے ناول۔ وہ مدا ری کی طرح زندگی کا تماشا دکھانے ہی کو ناول کا فن سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ علم نہیں تھا اور نہ ہوسکتا تھا کہ ناول زندگی کی مصوری ہی نہیں اس کی فلسفیانہ تعبیر اور تعمیر بھی ہے۔
- اس میں شک نہیں کہ پہلی جنگ عظیم سے 1936ء تک اردو ناول نگاری کا دوسرا دور، پریم چند کا دور کہا جائے گا۔ اس عہد میں ان کے ناول اس فن کا بلند ترین معیار ہیں۔
- 1936ء کے بعد ادیبوں کی جس نئی پود نے ناول اور افسانے کو اظہار کا ذریعہ بنایا وہ پریم چند کے مقابلے میں جدید تر ذہن، سائنسی فکر اور احساس تازہ کی مالک تھی۔ اس کے عرفان و آگہی کی بنیاد جدید سائنسی علوم تھے۔ اس کے پاس بشریت اور عقلیت کی نئی کسوٹی تھی۔ اس کے ذہن و شعور کی تعمیر میں اگر ایک طرف مارکس اور اشتراکی سرمایۂ ادب تھا تو دوسری طرف فرائڈ، ڈی ایچ لارنس، برناڈ شاہ اور جیمس جوائس جیسے مفکر اور ادیب تھے۔
- اس مدت (1950 سے 1970 تک) میں چند ایسے ناول بھی لکھے گئے جو اس یاس انگیز فضا میں اُمید کی نئی شمعیں روشن کرتے ہیں اور اُردو ناول کے ارتقاء میں تکمیل فن کے نئے معیار دیتے ہیں۔ ''آگ کا دریا''، ''خدا کی بستی''، ''آنگن''، ''اداس نسلیں'' اور نسبتاً مختصر ناولوں میں ''ایک چادر میلی سی'' اور ''شب گزیدہ۔'' گذشتہ دس سال کی یہ فصل پچھلی کئی فصلوں پر بھاری ہے۔ ان ناول نگاروں نے مغرب کی تقلید یا خوشہ چینی سے نہیں بلکہ اپنے تجربات، اپنی بصیرت اور ان میں فنی روایات کے تخلیق احساس سے اردو ناول کی فنی سطح کو بلند کیا ہے۔

- اردو ناول میں اسلوب و اظہار کے نئے تجربوں کا آغاز پریم چند کے بعد چوتھی دہائی کے آخر سے ہوتا ہے۔ جب احساس و فکر کا نیا پن اور فن کا نیا شعور لے کر کچھ نو جوان اس میدان میں آئے۔ افسانہ میں ''انگارے'' اور ''شعلے'' سے اس کا آغاز ہو چکا تھا۔ ناول میں سجاد ظہیر، عزیز احمد، کرشن چندر اور عصمت چغتائی نے ایک نئی عصری بصیرت کو سمونے کی طرح ڈالی۔

متذکرہ نکات سے واضح ہے کہ پروفیسر قمر رئیس کے انہماک، دیانتداری اور تنقیدی نظر سے ناول کے فن، اسلوب، تکنیک کے علاوہ موضوعات، سماجی محرکات اور مرکزی خیال تک قاری کی آسان رسائی ہوجاتی ہے۔ انہوں نے ناول کے ابتدا میں ناول نگاروں کے اسلوب، فنی دسترس اور تکنیک پر بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔ پریم چند کے ناولوں پر تو ان کا خاصا اہم کام ہے لیکن پریم چند کے ہم عصر اور بعد کے ناول نگاروں پر بھی قمر رئیس نے عمدہ تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے سجاد ظہیر، عزیز احمد، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، شوکت صدیقی، راجندر سنگھ بیدی، خدیجہ مستور، عبداللہ حسین، قرۃ العین حیدر اور قاضی عبدالستار کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ موضوع، زبان و بیان اور فنی نقطۂ نگاہ سے کیا ہے۔ یہ اردو ناول کی تاریخ کے ایسے نام ہیں، جن سے ناول کی دنیا نہ صرف روشن ہے بلکہ اس کی قدر و منزلت میں اضافے کا سبب ہے، لیکن قمر رئیس کی تنقید کا مطالعہ کرتے ہوئے کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ طرفداری یا ضرورت سے زیادہ تعریف و تحسین کے مرتکب ہوئے ہوں۔ انہوں نے بارہا ان ناول نگاروں کے فنی عیوب کو طشت از بام کیا ہے۔ قصہ پن کے جھول، کردار نگاری، مکالمہ نگاری میں پائی جانے والی اغلاط کا اپنی تحریر میں احاطہ کیا ہے۔ تاریخی ناول نگاری، ناول کا ایک شعبہ ہے۔ ہمارے یہاں اس کی پوری مستحکم روایت موجود ہے۔ پروفیسر قمر رئیس مصطفی کریم کے تاریخی ناول ''طوفان کی آہٹ'' کا تجزیہ کرنے سے قبل تاریخی ناول نگاری پر بحث کرتے ہیں:

> ''تاریخی ناول لکھنے میں ادیب کی مشکلات اور ذمہ داریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں یعنی اگر وہ رومانس نہیں بلکہ سنجیدہ تاریخی ناول لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اُسے تاریخ اور فن ناول نگاری دونوں کے ساتھ انصاف کرنا ہوگا اور دونوں کی ضرورتوں میں جہاں ٹکراؤ ہو وہاں ہم آہنگی پیدا کر کے تخلیقی بصیرت سے آویزش یا اختلاف کا حل نکالنا ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں اس ٹکراؤ کو اس طرح Resolve کرنا ہوگا کہ ناول ایک تخلیقی پیکر میں ڈھل کر تاریخ کی سچائیوں کو زندہ یا اُجاگر کر سکے۔ دوسری جانب

تاریخ، تخلیقی تخیل کی مدد سے فکشن کے نگار خانے میں اپنی ایک دائمی پہچان بنا سکے۔
یہ کام غیر معمولی ریاضت، محنت اور فنی رموز پر قدرت تو چاہتا ہی ہے اس کے ساتھ
ایک غیر تخلیقی مشغلے یعنی تاریخی دستاویزوں کی تلاش و تحقیق کے طریق کار سے
واقفیت کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔''

[بیسویں صدی میں اردو کا افسانوی ادب، قمر رئیس، ص ۳۴۳]

تاریخی ناول نگاری پر قمر رئیس کی بحث حق بجانب ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ تاریخی ناول نگاری پُل صراط کے سفر کے مصداق ہے۔ ذرا سی لغزش آپ کو یا تو تاریخ کے سنگلاخ ویرانوں میں پہنچا دے گی یا پھر قصے کی پُر پیچ راہیں اسلوب کی دلکشی کے فریب میں ایسا گرفتار کریں گی کہ تاریخی ناول نگاری کے نام پر کیا سامنے آئے گا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس طرح کے ناولوں میں قصہ کا ایسا بیان ہونا چاہیے کہ تاریخ میں واقعاتی پھیر بدل نہ ہو، شخصیت کا کردار مجروح نہ ہو اور کہانی میں تحیر، تجسس، تصادم اور دلچسپی کے عناصر بھی موجود ہوں۔ ناول نگار کا تاریخ کا مطالعہ اور ناول کے فن پر دسترس کا ہونا لازمی ہے۔

پروفیسر قمر رئیس مصطفی کریم کے ناول کو کامیاب تاریخی ناول قرار تو دیتے ہیں لیکن ناول میں موجود نقائص کی طرف بھی واضح اشارے کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر مصطفی کریم نے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اشعار میں وزن کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے نہ صرف اشعار کی صحت کی طرف توجہ دلائی ہے بلکہ ناول میں جن مقامات پر تذکیر و تانیث کی اغلاط ہیں، ان کو بھی نشان زد کیا ہے۔

پروفیسر قمر رئیس جہاں عصمت چغتائی کے کئی ناولوں ضدی، ٹیڑھی لکیر وغیرہ کی کافی تعریف کرتے ہیں وہیں وہ عصمت کی ایک دکھتی رگ پر بھی ہاتھ رکھتے ہیں۔ بقول قمر رئیس عصمت متوسط طبقے کے اسی ماحول اور گھریلو فضا کو عمدگی سے پیش کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں جس میں وہ خود پلی بڑھی ہیں، جسے انہوں نے بچپن اور جوانی میں دیکھا ہے۔ اُس سے پرے جب بھی وہ کسی تصویر میں رنگ بھرتی ہیں تو ان کے برش کی لغزش کو تصویر کے خدوخال میں بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ معصومہ ان کا ایسا ہی ناول ہے جو ان کے دوسرے ناولوں کے مقابلے معمولی ناول کہا جا سکتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح وہ کرشن چندر کے کئی ناولوں پر اپنا اعتراض درج کرانے سے خود کو روک نہیں پائے، جب کہ کرشن چندر ترقی پسند ناول نگاروں میں الگ مقام کے حامل تھے۔ دوسرے ناقدین کی طرح قمر رئیس بھی کرشن چندر کے خوبصورت استعاراتی اسلوب کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں سماجی محرکات اور پسماندہ طبقات کی زندگی کی عکاسی کی بھی داد دیتے ہیں لیکن جہاں ان کو جھول نظر آتا ہے وہ برمحل

اظہار کر دیتے ہیں:

''طوفان کی کلیاں'' میں جو کشمیر کے ڈوگرہ شاہی مظالم کی سرگذشت ہے، رومان اور
حقیقت کا وہ حسن کارانہ امتزاج اور کردار نگاری کا وہ اعلیٰ معیار بھی برقرار نہ رہ سکا جو
'' شکست'' میں نظر آیا تھا۔ اس کے بعد کے ناولوں، ایک وائلن سمندر کے
کنارے، ایک عورت ہزار دیوانے، برف کے پھول اور زرگاؤں کی رانی وغیرہ
میں یہ معیار اور بھی پست ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ''درد کی نہر'' جیسے حقیقت پسندانہ
ناول میں بھی فلمی کہانی جیسے ملو ڈرامائی واقعات قاری کو بے مزہ کر
دیتے ہیں۔''

[بیسویں صدی میں اردو کا افسانوی ادب، قمر رئیس، ص ۲۵۴]

پروفیسر قمر رئیس نے ناول کی تنقید میں اپنے مخصوص انداز نقد اور رویے سے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انہیں صرف ماہر پریم چند ہی تسلیم نہیں کیا جاتا ہے بلکہ ناول کی تنقید کے ماہرین میں بھی ان کا شمار صفِ اول میں ہوتا ہے۔

ناول کی تنقید کرتے وقت پروفیسر قمر رئیس اپنے متعدد مضامین میں کئی مقامات پر ناول کی سمت و رفتار اور ترقی سے مایوس بھی نظر آتے ہیں۔ ان مقامات پر ان کی مایوسی پر مارکسی نظریے کا اثر بھی نمایاں ہے۔ ویسے بعض مقامات پر ان کی تشویش حق بجانب ہے۔ ان کے مضامین کے ایسے چند جملے ملاحظہ ہوں:

- ایسے سنجیدہ اور قابلِ ذکر ناول جن میں عصر حاضر کی زندگی کو بڑے کینوس پر موضوع بنایا گیا ہو، خال خال ہی نظر آتے ہیں۔
- پریم چند کے بعد اردو ناول شہری سماج کے حلقے تک محدود ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستانہ عوام کی اکثریت یعنی محنت کش کسان اور مزدور ابھی تک اردو ناول میں اپنا حقیقی مقام حاصل نہیں کر سکے ہیں۔
- ہندوستانہ زبانوں میں ناول میں فن اور تکنیک کی تبدیلیوں اور تجربوں کا دائرہ بھی محدود رہا اور ہندوستانی عورت کی مصوروں میں بھی ایسی گہرائی، اتنی تہہ داری اور تنوع کا رنگ پیدا نہ ہو سکا جو مغرب کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔
- جن ادیبوں نے اس دور کے کسان اور دیہی معاشرے کے بارے میں لکھا ہے ان کی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے گاؤں کے محنت کش طبقے کی زندگی کو

ایک کسان یا مزدور کے نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ زمیندار یا متوسط طبقے کی نگاہ سے دیکھا ہے۔اس لیے ان کی انسان دوستی، محنت کش انسانوں سے ان کی حقیقی محبت اور احساسِ یگانگت کے بجائے ان کی حالت پر رحم یا ہمدردی کے جذبات کی غمازی کرتی ہے۔

یہاں پر پروفیسر قمر رئیس ناول کی جن خامیوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اس میں کسی حد تک تو سچائی ضرور ہے خاص کر آزادی کے فوراً بعد تقریباً ایک دہائی تک ایسے ناولوں کا فقدان تھا، جن میں عوامی زندگی کا عمدہ تجزیہ ہو۔تقریباً یہی معاملہ سن ستر کے بعد بھی کئی سال تک دکھائی دیتا ہے۔لیکن درج بالا اقتباسات کے مطالعے سے یہ نتیجہ بھی بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قمر رئیس اپنے ایک مخصوص نقطۂ نظر کے حوالے سے بھی ناول میں بعض اوصاف تلاش کر رہے تھے، جہاں انہیں مایوسی نظر آتی ہے۔لیکن قمر رئیس کی فکر مندی اور تشویش بے سبب نہیں ہے۔وہ اس کے اسباب وعلل کی تلاش کرتے ہیں اور آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ ناولوں میں پائی جانے والی کجی کا باعث زمانے کے برق رفتار تغیرات اور پل پل بدلتے انسانی رشتوں اور رویوں کو ٹھہراتے ہیں:

''پریم چند اور ان سے قبل کے ادیبوں کے لیے ناول لکھنے کا کام جتنا آسان تھا، دورِ جدید میں یہ اتنا ہی دشوار اور پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نذیر احمد سے پریم چند تک اگرچہ ہندوستانہ معاشرے کا اوپری ڈھانچہ بدل رہا تھا لیکن فرد کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں تغیر کی رفتار سُست تھی۔اس لیے ان کا مطالعہ اور ناول میں تخیل کی مدد سے ان کی تشکیل اور تعمیر کا کام نسبتاً آسان تھا۔''

قمر رئیس کے یہ جملے، ناول پر کیے گئے خود ان کے اعتراضات اور خامیوں کے ازالے کے لیے کافی ہیں۔ یہاں انہوں نے ناول میں پائے جانے والے خلا یعنی عوامی زندگی کی بہترین تحلیل نفسی کی بتدریج کمی کا سبب سماج میں تغیر کی رفتار کا قبل کے زمانے سے نسبتاً تیز ہونا ہے۔یہ قمر رئیس کا ایک منفرد انداز ہے کہ جب وہ سوال قائم کرتے ہیں تو صرف سوال قائم کر کے اپنی بات پوری نہیں کرتے بلکہ سوال کے جواب کی طرف بھی اپنی تحریروں میں اشارے کر دیتے ہیں۔اس سے قاری جہاں سوال سے واقف ہوتا ہے وہیں جواب کی تلاش میں تخلیق کے اصل جوہر تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

ناول پر قمر رئیس کی تنقید، کسی کی تقلید نہیں ہے بلکہ ان کا اپنا انداز واسلوب ہے۔ان کا یہ اسلوب انہیں اپنے ہم عصروں میں انفرادیت بخشتا ہے اور اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم انہیں ناول کی تنقید کا ایک اہم ستون تسلیم کر لیں۔

Head, Dept: of Urdu
Chaudhry Charan Singh University
Meerut(U.P)

نام کتاب : مفتیانے (افسانے) مصنف : ممتاز مفتی صفحات : ۱۳۰۰ قیمت : ۱۵۰۰/روپے ملنے کا پتہ: الفیصل ناشران، لاہور		نام کتاب: دہلیز (افسانے) مصنفہ: ڈاکٹر نرگس جہاں باروی صفحات : ۱۸۰ قیمت : ۱۵۰/روپے اشاعت : ۲۰۱۶ء
نام کتاب : آنسوؤں کی سوغات (افسانے) مصنفہ : نزہت نبیلہ صفحات : ۲۰۸ قیمت : ۱۷۵/روپے سال اشاعت: ۲۰۱۷ء		نام کتاب : اردو ناول کی پیش رفت (تنقید) مرتب : منصور خوشتر صفحات : ۳۸۴ قیمت : ۳۵۰/روپے سال اشاعت: ۲۰۱۷ء

● پروفیسر محمد ظفر الدین

قمر رئیس: ترجمہ اور فن ترجمہ

قمر رئیس کا نام آتے ہی ایک ایسے قد آور ادیب کی شبیہ اُبھرتی ہے جس نے ترقی پسند تحریک کو

اُس کے بالکل آخری دور میں منظم اور متحرک رکھا۔نوجوان نسل کی تربیت کی اور اس اعتراف کے ساتھ کہ ترقی پسند تحریک روبہ زوال ہے' بلکہ ختم ہوگئی ہے لیکن ترقی پسندی' اُس کے اجزا' تعلیمات' نظریات اور فکری رویہ ہمیشہ باقی رہے گا۔یہ امر مسلمہ ہے کہ تحریکیں ختم ہوجاتی ہیں لیکن اُس کے اثرات صدیوں قائم رہتے ہیں۔یہ اثرات آنے والی نسلوں کی غیر شعوری طور پر ذہن سازی کرتے رہتے ہیں۔قمر رئیس نے اپنے معاصرین' نوجوان ادیبوں و دانشوروں اور طلبہ و اسکالروں کو عمر کے آخری ایام تک جوڑے رکھا اور اُنہیں ترقی پسند نظریات وخیالات کے سانچے میں ڈھالتے رہے۔

ترقی پسندی کے علمبردار ہونے کے علاوہ بھی قمر رئیس کی شخصیت کے مختلف نمایاں پہلو رہے ہیں۔وہ دلنواز شخصیت کے مالک تھے۔زندہ دل' مخلص وملنسار' کشادہ قلب اور انسان دوست تھے۔انتہائی مقبول اور ہر دلعزیز استاد تھے۔ادارہ ساز تھے۔مختلف پرچوں کے ایڈیٹر تھے۔ماہر پریم چند تھے۔فکشن کے ممتاز ناقد تھے۔شاعر تھے۔مترجم تھے۔اور میرا سروکار اُن کی اِسی آخرالذکر خصوصیت سے ہے۔کہا جاتا ہے کہ ترجمہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ترجمے میں سب سے زیادہ مشکل ادب کے ترجمے میں پیش آتی ہے اس لیے کہ اُس میں صرف ظاہری متن نہیں بلکہ اُس کے پیچھے بکھری ہوئی تہذیبی وثقافتی دُنیا کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ادبی تراجم میں بھی شاعری کے ترجمے زیادہ دشوار گزار ہوتے ہیں اس لیے کہ شاعری میں معنی کی ایک تہہ در تہہ دُنیا آباد ہوتی ہے۔شاعری کا ترجمہ اگر منظوم کیا جائے تو گویا وہ ترجمے کا مشکل ترین مرحلہ ہوتا ہے۔قمر رئیس نے نثری تراجم کے ساتھ ساتھ اس مشکل ترین قسم کو اختیار کیا اور کافی بڑے پیمانے پر منظوم تراجم کیے۔

ایک مترجم کی حیثیت سے قمر رئیس نے ان ادبی شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا' جو تاریخی حیثیت کے حامل کارنامہ ہیں۔قمر رئیس کو کم وبیش بارہ سالوں تک تاشقند (ازبکستان) میں استاد کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کا موقع فراہم ہوا۔اس دوران انھوں نے ازبکی زبان سیکھی اور ازبکی زبان میں موجود ادبی شہ پاروں کا بغور مطالعہ کیا۔ازبکی شاعری کے قریب ہوئے اور وہاں کے نامور شعراء کا کلام اردو میں منظوم ترجمہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔قمر رئیس نے اولین مغل حکمراں ظہیر الدین محمد بابر شخص شخصیت اور شاعر کے عنوان سے کتاب لکھی' جس میں بابر کے منتخب کلام کا اردو زبان میں منظوم ترجمہ پیش کیا ہے اور ایک طویل مقدمہ لکھا جو بابر کی زندگی اور کارنامے پر مشتمل ہے۔بابر کی شاعری کا اردو میں منظوم ترجمہ کرنا نہایت مشکل مرحلہ تھا لیکن قمر رئیس نے اپنے مضبوط ارادوں سے اسے پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ان کا یہ ترجمہ ایسا ہے کہ اصل شعری عبارت معلوم ہوتا ہے۔ان کے ترجمے پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔

قمر رئیس جب ازبکستان میں مقیم تھے' اس دوران تاشقند' ماسکو' لینن گراڈ اور دوشنبہ جیسے شہروں کی بڑی

بڑی یونیورسٹیوں میں اردو ادب پر لکچر دیے اور ممتاز انقلابی شاعر منصور غلام کی نظموں کے اردو تراجم پیش کیے۔انھوں نے ازبکستان کے پچیس اہم شاعروں کے کلام انتخاب کر کے اس کا منظوم ترجمہ کیا اور یہ دو جلدوں میں 1973 میں ''شعرائے ازبکستان'' کے نام سے شائع ہوئی جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔اس سے قبل تاشقند سے ہی اُن کے دو تراجم نغمہ کشمیر ((1964 اور ارمغان تاشقند ((1968 شائع ہو چکے تھے۔بعد میں اُنہوں نے ''ازبکستان اور علی شیر نوائی'' کا ترجمہ رحمان بیروی محمد جانوف کے تعاون سے کیا جسے ہریانہ اُردو اکیڈمی نے 1994ء میں شائع کیا۔ہند ازبکستان دوستی سوسائٹی دہلی نے 2001ء میں اُن کا ترجمہ ''بیسویں صدی کی ازبیک شاعری'' شائع کیا۔

دراصل قمر رئیس طویل عرصے تک ازبکستان میں مقیم رہے۔اس دور سے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے میں وہ ازبیک زبان سے واقف ہوئے اور اس کے ادبیات سے بھی وسط ایشیا کی تاریخ وتہذیب سے ان کی روشناسی ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ تعارف گہری جذباتیت اور وابستگی سے بدل گیا۔انھوں نے ازبکی کے کلاسیکی شعراء کا بطور خاص مطالعہ کیا اور اپنے معاصرین کا ترجمہ بھی کیا۔ (تخلیق کار قمر رئیس مرتب علی احمد فاطمی' ایم آر پبلی کیشنز دہلی ص 23)

ازبیک زبان سے اُردو میں شاعری کا ترجمہ کرنے سے متعلق خود قمر رئیس کہتے ہیں:

> ''ہر زبان وادب کے کچھ بنیادی تہذیبی اور جمالیاتی عناصر اس کی تہذیب وتمدن سے جڑے ہوئے ہیں۔اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شمالی ہندوستان کی ملی جلی تہذیب' اردو زبان اور اس کی ادبی وشعری روایت' ازبکستان کی تہذیب' زبان اور شعری روایت سے غیر معمولی مماثلت رکھتے ہیں۔یہ اسی قربت کا نتیجہ ہے کہ ازبیک زبان میں اردو شعراء مثلاً غالب' اقبال اور فیض کا ترجمہ نسبتاً آسانی اور کامیابی سے ہوسکا۔اسی سہولت کا احساس ترجمہ کرے کے عمل میں مجھے بھی محسوس ہوا۔''

(قمر رئیس۔مقدمہ بیسوی صدی میں ازبیک شاعری' صفحہ 16)

منظوم ترجمے کے حوالے سے قمر رئیس کا عظیم کارنامہ ان کی کتاب ظہیر الدین محمد بابر شخص شخصیت اور شاعری ہے۔کتاب کی ابتداء میں قمر رئیس نے 70 صفحات پر مشتمل پیش گفتار کے عنوان سے ایک

مبسوط اور تحقیقی مقدمہ لکھا ہے جس میں بابر کی زندگی، شاعری اور اس کے کارناموں پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔ بابر کے مختلف آزمائشوں سے گزرنے کے واقعات اور اس کے فتوحات پر قمر رئیس نے تفصیلی گفتگو کی ہے بابر کی شاعری کا ترجمہ کرنے کا خیال کیسے قمر رئیس کے دل میں پیدا ہوا اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''ظہیر الدین محمد بابر کی دل آویز شخصیت اور شاعری سے میری دلچسپی کا آغاز کم وبیش بیس سال قبل اس وقت ہوا جب میں نے علی شیر نوائی جیسے باکمال کلاسیکی ازبیک شاعر اور ہم عصر شعراء کے کلام کا مطالعہ شروع کیا۔ ساتھ ہی ان کی جو تخلیقات پسند آئیں ان کا ترجمہ بھی کرنے لگا۔ تاشقند میں اپنے دس بارہ سال کے قیام کے دوران میں نے کچھ راست اور کچھ شعر وادب کے واسطے سے ازبیکستان کی تہذیب وثقافت کے ورثہ سے شناسائی حاصل کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ البیرونی، امام بخاری اور حکیم بوعلی سینا کی طرح بابر بھی اسی سرزمین اور اس کی تہذیب کا ایسا فرزند ہے جس کے کارناموں کو نہ صرف وسطی ایشیا و ہندوستان بلکہ ساری دنیا نے سراہا ہے اور ان سے فیض اٹھایا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ صدیوں سے ازبیکستان کے عوام بابر کو ایک حکمراں اور فاتح سے کہیں زیادہ ایک غنائی شاعر، نامور ادیب اور دانشور کی حیثیت سے جانتے اور پسند کرتے آئے ہیں۔ سوویت دور میں بھی جب مطلق الحکم بادشاہوں سے رشتہ جوڑنے پر پابندیاں عائد تھیں، لوگوں کے گھروں اور ایوانوں میں جواں عمر بابر کی ایک ایسی تصویر آویزاں نظر آئی جس میں وہ ہاتھ میں کتاب لیے استغراق سے شعر خوانی کرتا نظر آرہا تھا۔'' (پروفیسر قمر رئیس۔ پیش گفتار مشمولہ ظہیر الدین محمد بابر: شخص اور شاعر۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 2002ء)

ظہیر الدین محمد بابر کی شاعری کا منظوم ترجمہ کرنا بظاہر مشکل کام تھا لیکن قمر رئیس نے اس مشکل مرحلے کو آسانی سے سر کرلیا۔ قمر رئیس نے اپنے دوستوں اور ازبیکستان میں موجود اپنے خیر خواہوں سے اس ترجمے میں ضرور مدد لی ہے تاہم اس کے ترجمے میں تخلیق کا پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے ترجمے میں

سلاست، روانی اور شعریت بھرپور طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ کہیں بھی جھول پا سکنے والی کیفیت نظر نہیں آتی ہے ۔ یہ ترجمہ نہایت سلیس، رواں اور دلکش ہے، جس میں معنویت کے ساتھ ساتھ تہہ داری بھی ہے اور مفہوم کی مکمل ادائیگی کے ساتھ شعریت کے محاسن سے آراستہ بھی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے:

آسمان نے جو کیا جورو وفا کیسے کہوں
دل پہ ٹوٹا کس طرح سیل رواں کیسے کہوں
چارہ گر اب موت ہی شاید دوائے عشق ہو
ڈوبتا جاتا ہے دل کا حوصلہ کیسے کہوں

.....

اس جاں کے کے سوا کوئی وفادار نہ پایا
اس دل کے سوا محرم اسرار نہ پایا
کرنے کو تو ہر عیش کیا بزم جہاں میں
اس دل کو مگر میں نے گنہگار نہ پایا

ان اشعار کی قرات کے بعد بالکل گمان نہیں ہوتا ہے کہ یہ منظوم ترجمہ ہے بلکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم شعری تخلیق پڑھ رہے ہیں، جس میں شعری محاسن کے ساتھ ساتھ معنویت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ شاعری کا ترجمہ وہی شخص زیادہ اچھا کرسکتا ہے جو خود شاعر ہو یا وہ شعری ذوق رکھتا ہو۔ شاعری کے اوزان وبحور، لفظیات اور محاسن ومصائب سے بخوبی واقف ہو۔ اس معاملے میں قمر رئیس کی خوش نصیبی رہی کہ وہ خود ایک اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جن منظومات کا منظوم ترجمہ کیا ہے اس میں تخلیقیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ سلاست اور روانی پائی جاتی ہے اور شعری نغمگی سے ان کے تراجم پُر نظر آتے ہیں۔ بعض لوگ کا خیال ہے کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر زبان کی اپنی اصطلاحات، مترادفات اور محاورات ہیں، جو دوسری زبانوں میں من وعن موجود نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بعض لفظوں کے تراجم کے لیے دوسری زبانوں میں ایسے الفاظ موجود نہیں ہیں جو ہو بہو اول الذکر زبان میں موجود لفظوں کی ترجمانی کرسکیں۔ مگر اس کے باوجود ہر دور میں مترجمین شاعری کے ترجمے کرتے رہے ہیں۔ قمر رئیس بھی اُنہیں میں سے ایک ہیں۔

مذکورہ بالا حوالوں سے قمر رئیس کی شخصیت بحیثیت ترجمہ نگار بہت واضح اور صاف ہو جاتی ہے لیکن فنِ ترجمہ سے متعلق اُن کا ایک ایسا کارنامہ بھی ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اُنہوں نے 1976ء میں''

ترجمہ کا فن اور روایت'' عنوان سے ایک کتاب ترتیب دی جس کے طویل مقدمے میں ترجمے کی روایت اور ترجمے کے دوران پیش آنے والی مشکلات سے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں ترجمے کے فن کے ذیل میں دس اور ترجمے کی روایت کے تحت آٹھ مضامین شامل تھے۔ بعد میں اُنہوں نے مزید تین مضامین کا اضافہ کر دیا جس سے یہ 21 اہم مضامین پر مشتمل ایک وقیع کتاب ہوگئی۔ اس کتاب میں اصول وضع اصطلاحات' تراجم اور اصطلاح سازی کے اصول' ترجمہ نوعیت اور مقصد' ترجمے کے بنیادی مسائل' ترجمہ اور لسانیات' منظوم ترجمے کا عمل' آزاد اور لفظی ترجمہ' ترجمہ کی اہمیت' اردو میں ترجمہ کی روایت کے علاوہ اور دیگر موضوعات پر متعدد مضامین شامل ہیں۔ ماہرین ترجمہ کے قلم سے لکھے گئے یہ مضامین نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ایک اہم ترین کتاب ہے۔ قمر رئیس کے ادبی اور علمی کارناموں میں یہ بھی ایک عظیم کارنامہ ہے۔ قمر رئیس نے اس کتاب کے مقدمے میں ترجمے اور اس کے فن سے متعلق بعض اہم نکات کی جانب اہل علم کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جہاں تک اردو زبان میں ترجمہ کے آغاز و ارتقا' اس کے اصولوں اور نظریوں' اس کی مشکلات اور فتوحات اور اردو زبان و ادب پر ترجمہ کے نتیجہ خیز اثرات کا تعلق ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس صدی کے ابتدائی دہوں میں وحید الدین سلیم' مولوی عبدالحق' ظفر الرحمن دہلوی اور میر حسن جیسے چند بزرگوں کے علاوہ اردو کے کسی ادیب اور عالم نے اس موضوع کو سنجیدہ مطالعہ اور علمی تحقیق کے قابل نہیں سمجھا۔ قدیم کلاسیکی عہد میں اردو شاعری کے سرمایہ سے قطع نظر نثر کی بیشتر کتابیں فارسی ادب کا ترجمہ ہیں۔ سب رس' کربل کتھا' نوطرز مرصع' باغ و بہار' گنج خوبی' آرائش محفل اور انیسویں صدی کی بے شمار داستانیں' سب ترجمہ ہی سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ کس نوعیت کا ہے؟ اس کے پیچھے اگر کچھ اصول کچھ مقاصد کارفرما رہے ہیں تو وہ کیا ہیں؟ مترجم نے کہاں تک اس سے دیانت داری برتی ہے۔ کہاں متن سے انحراف کیا گیا ہے؟ اگر آزاد ترجمہ ہے تو مترجم کے ذہن میں آزادی کا کیا مفہوم اور مقصود تھا؟ ان ترجموں نے کس طرح اور کس حد تک اردو زبان اور اردو نثر کے اسالیب کو متاثر کیا؟ اور اس طرح کے دوسرے سوالات پر کسی عالم نے سنجیدگی سے غور و خوض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ نہ ہی اس مقصد سے اصل متن اور ترجمہ کی عبارت کا

تقابلی مطالعہ کیا گیا۔ یہ کام ملک کی دوسری زبانوں میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن اردو میں کیا افراد اور کیا ادارے کسی نے بھی اس موضوع کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔''

(قمر رئیس۔ ترجمہ کا فن اور روایت۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ' 2004' صفحہ 22)

ترجمہ کو بعض لوگ فن کے طور پر تسلیم کرتے ہیں اور بعض بالکل انکار کرتے ہیں کہ ترجمہ فن کے زمرے میں نہیں آتا ہے۔ ترجمہ خواہ کتنا ہی شستہ اور بہتر ہوا سے تخلیق کے خانے میں نہیں رکھا جاتا ہے اور اسے دوسرے درجے کا ادب تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس میں مترجم کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ علمی صلاحیت کا مالک ہو کم از کم دو زبانوں پر دسترس رکھتا ہو اور وہ مختلف ادبی تحریکوں اور پیش رفت سے واقف ہو۔ ساتھ ہی اس کے لیے یہ بات بھی لازمی تصور کی جاتی ہے کہ وہ تاریخ و جغرافیہ کی بھی حتی المقدور معلومات رکھتا۔ پروفیسر قمر رئیس ترجمہ کے متعلق اپنی رائے اظہا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ترجمہ فن ہو یا نہ ہو' ترجمہ ضرور ہے۔ ماضی میں ترجمہ کے نام پر کچھ بھی ہوتا رہا۔ لیکن ڈاکٹر جانسن نے مدتوں پہلے جو بات کہی تھی اسے آج عالمی سطح پر تسلیم کیا جا رہا ہے کہ ترجمہ کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کی طرح مستحسن نہیں۔ مترجم کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ کسی تصنیف کی معنوی یا فنی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنی یا ترجمہ کی زبان میں پوری دیانت سے منتقل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن چونکہ کسی بھی تصنیف یا تخلیق کے تار و پود Texture میں صرف معنوی نہیں بلکہ تہذیبی تخیلی اور لسانی عوامل باہمی طور پر شیر و شکر ہوتے ہیں۔ اس لیے دیانتدارانہ ترجمہ کا کام تخلیق کے مقابلہ میں زیادہ نازک پیچیدہ اور ذمہ دار ہوتا ہے اس میں دو رائیں نہیں کہ ہر تخلیقی فن پارہ میں کچھ ایسے عناصر ہوتے ہیں جو دوسری زبان (خاص طور پر ایک مختلف تہذیبی ماحول کی پروردہ زبان) پر بجنسہٖ منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ اس معذوری کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک مواد اور نفس موضوع کا تعلق ہے۔ اصل تصنیف کے تخلیقی جوہر کو دوسری زبان میں قابل لحاظ کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کہ قارئین ترجمہ کے آئینہ میں اصل تصنیف کی فکری اور فنی اہمیت کو نہ صرف محسوس کر سکیں بلکہ محفوظ بھی ہوں اور یہ افسانوی ادب' ڈرامہ اور شاعری کسی بھی صنف میں ممکن ہے۔''

(مقدمہ ترجمہ کا فن اور روایت۔ قمر رئیس صفحہ 18)

قمر رئیس اس بات کے قائل ہیں کہ ترجمہ ایک دقت طلب کام ہے جس میں مترجم کو مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن مترجم ان مسائل کو اپنی فکری و ذہنی استعداد کی مدد سے حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ترجمہ تخلیق کی معنویت کی بازآفرینی کا نام ہے چاہے وہ نثری ترجمہ یا شاعری کا ترجمہ' دونوں میں اظہار مدعائے مصنف ہی اولین ترجیح ہوتی ہے۔لیکن ان دونوں میں شعر کا ترجمہ دقت ترین امر ہے۔ فن ترجمہ نگاری پر قمر رئیس نے یوں تو متعدد جگہ لکھا ہے۔ وہ مختلف پرچوں کے ایڈیٹر بھی رہے تھے جن کے اداریوں میں گاہے گاہے کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا کرتے تھے۔لیکن ''ترجمہ کا فن اور روایت'' کے مقدمے میں اُنہوں نے بہت ہی مبسوط انداز میں لکھا۔کسی ترجمے کی تعریف میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اصل سے بھی بہتر معلوم ہوتا ہے یعنی مترجم نے لسانی اعتبار سے وہ جوہر دِکھائے جہاں تک صحیح معنوں میں تخلیق کار بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔لیکن ماہرین ترجمہ کا ماننا ہے کہ ترجمے کو کبھی اصل سے بہتر نہیں ہونا چاہیے بلکہ یوں کہا جائے کہ اصل سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔اگر ترجمے کے دوران اصل مواد کے مفہوم کے ساتھ کیفیت کی منتقلی نہ ہو پائے تو وہ بہت اچھا ترجمہ نہیں کہا جا سکتا۔قمر رئیس نے بھی ''ترجمہ کا فن اور روایت'' میں لکھا ہے:

> ''ترجمہ کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کسی طرح مستحسن نہیں۔مترجم کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ کسی تصنیف کی معنوی یا فنی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنی یا ترجمہ کی زبان میں پوری دیانت سے منتقل کرنے کی کوشش کرے..... ہر تخلیقی فن پارہ میں کچھ ایسے عناصر ہوتے ہیں جو دوسری زبان (خاص طور پر ایک مختلف تہذیبی ماحول کی پروردہ زبان) میں بجنسہٖ منتقل نہیں کیے جا سکتے۔اس معذوری کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک مواد اور نفس موضوع کا تعلق ہے اصل تصنیف کے تخلیقی جوہر کو دوسری زبان میں قابل لحاظ کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔اس طرح کہ قارئین ترجمہ کے آئینہ میں اصل تصنیف کی فکری اور فنی اہمیت کو نہ صرف محسوس کر سکیں بلکہ محظوظ بھی ہوں اور یہ افسانوی ادب' ڈرامہ اور شاعری کسی بھی صنف میں ممکن ہے۔''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قمر رئیس کا ترجمہ نگاری سے گہرا لگاؤ رہا ہے۔اُنہوں نے ترجمے کی اہمیت و افادیت کو محسوس کیا۔خود بھی ترجمے کیے اور اپنے حلقہ احباب اور شاگرد کو بھی ترجمے کی جانب متوجہ کیا۔ترجمہ کے بارے میں ترجمے کے مشرقی و مغربی ماہرین کے حوالوں سے فن ترجمہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔اُن کے مطابق ترجمے کا فن کوئی آسان نہیں بلکہ انتہائی توجہ کا متقاضی ہے۔دونوں زبانوں

سے وابستہ تہذیبی و ثقافتی پس منظر کی معلومات کے بغیر اچھا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔وہ ایسے بیانات اور نتائج کے قطعی منکر ہیں کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا یا یہ کہ تخلیقی ادب کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔اُن کا یہ بھی ماننا ہے کہ مترجم کو تخلیق کار کے متن اور فکر کی ہو بہو منتقلی کرنی چاہیے اُس سے آگے نکل جانے کی کوشش قطعی مناسب نہیں۔ترجمہ نگار کو خواہ traitor کہا جائے یا Imitator۔لیکن اُسے اپنا کام جاری رکھنا چاہیے' اس لیے کہ ترجمے نے ہی قوموں کے درمیان دوریاں ختم کی ہیں اور پُلوں کا کام کیا ہے۔

حواشی:

1. پروفیسر علی احمد فاطمی۔تخلیق کار قمر رئیس۔ایم آر پبلی کیشنز' نئی دہلی 2007ء
2. پروفیسر قمر رئیس۔ازبیکستان اور علی شیر نوائی۔ہریانہ اُردو اکیڈمی' پنچکولہ ہریانہ۔1994ء
3. پروفیسر قمر رئیس۔بیسویں صدی کی ازبیک شاعری۔ہند ازبکستان دوستی سوسائٹی دہلی 2001ء
4. پروفیسر قمر رئیس۔ترجمہ کا فن اور روایت۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ' 2004ء
5. پروفیسر قمر رئیس۔ظہیر الدین محمد بابر: شخص اور شاعر۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس' دہلی۔2002ء
6. پروفیسر محمد ظفر الدین۔ پروفیسر قمر رئیس: آثار و احوال' مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی' حیدرآباد 2010ء
7. ڈاکٹر سلمٰی شاہین۔قمر رئیس ایک زندگی۔تخلیق کار پبلشرز' دہلی 1998ء
8. ڈاکٹر مسرت جہاں۔قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات: تنقیدی جائزہ۔ناشر خود مصنفہ' حیدرآباد 2004ء

◀◀ ● ▶▶

Director
Directorate of Translation and Publications
Language Buildind,2nd Floor
Maulana Azad National University
Gachibowli
Hyderabad-5000032E.Mail: zafaruddin65@gmail.com,
Mobile: 09052607590, 09347690095

● پروفیسر قمر رئیس

متاعِ فکر، نشاطِ عمل، فروغِ حیات

تمہارا درد ،تمہاری یہ آخری سوغات

حریف سارا زمانہ،رقیب سارا جہاں
چُرا نہ لے کوئی،ڈرتا ہوں، اس کا رنگِ ثبات

کہاں چھپاؤں اِسے،کس طرح بچاؤں اِسے
چراغ ایک،ہوا تیز،اور اندھیری رات

فراغ جسم کا،دل کا سکوں،نظر کا قرار
تمہارے درد کے دشمن ہیں،یہ سبھی حالات

میں اُس مقام پہ پہنچا ہوں،ان دنوں کہ جہاں
نہ کاہشِ غم دوراں،نہ کاوشِ غم ذات

بس اک خلش کے سوا،ایک آرزو کے سوا
عجیب شہرِ خموشاں ہے، شہر احساسات

تمہی بتاؤ کہ ایسے میں ،اک تمہارے سوا
کہوں تو کس سے کہوں،اب تمہارے درد کی بات

◀◀ ● ▶▶

مرنے کی کوئی راہ، نہ جینے کا سبب ہے
جینا بھی یہاں قہر ہے، مرنا بھی غضب ہے

کیا تجھ سے کہوں پیرِ مغاں ،سوئے ادب ہے
اک پیاس کا دریا یہ تری بنتِ عنب ہے

آجاؤ! یہ کوچہ بھی ،رہِ گیسو و لب ہے
زنجیر بھی، خنجر پہ لہو بھی،یہاں سب ہے

سنتے ہوئے جُگ بیت گیا ،قصۂ جمہور
اب اس کو حقیقت بھی بنا ڈالیے، تب ہے

یہ آج فضا میں، جو گھٹن ہے،جو اُمس ہے
کہتے ہیں، یہ طوفاں کے لیے حسنِ طلب ہے

پہچان ہی لے گا یہ لہو،دامنِ قاتل
ہاں حشر کا ہنگام،بتا دے،کوئی کب ہے؟

◀◀ ● ▶▶

● پروفیسر قمر رئیس

چلو یہ بھی اپنا ہی جرم ہے، یہ گناہ بھی مرے سر گئے
میں نہ چل سکا تو ٹھہر گیا، وہ گزر سکے تو گزر گئے

وہی ساعتیں ہیں فروغِ جاں، مری راہِ شوق میں آج بھی
مری منزلوں کے نصیب جب ترے نقشِ پا سے سنور گئے

وہی مرحلے مری یاد ہیں ، وہی مشغلے مرا خواب ہیں
شب و روز، جب ترے گیسوؤں، ترے عارضوں میں ٹھہر
گئے

وہ ندی کا ساحلِ دلربا، ہمیں یاد سب ہے ذرا ذرا
ترے رُخ پہ جب، مری اک طلب پہ، شفق کے رنگ بکھر
گئے

میں جو چپ رہا، تو یہ بات تھی کہ کسی کا راز نہ کھل سکے
میں جو رو پڑا تو یہ راز تھا کہ مری وفا سے وہ ڈر گئے

میں کہاں ہوں ساغرِ مے کہاں، شب ماہ کیوں ہے دھواں دھواں
یہ بتا خمارِ سحر گئی، مرے عقل و ہوش کدھر گئے

● پروفیسر قمر رئیس

شمعِ جاں ہو گی، نہ فانوسِ نظر رہ جائے گا
یہ بھی کیا کم ہے، کہ خوابوں کا سفر رہ جائے گا

اے ہوائے زر گری، اے کوچۂ سودا گری!
کیا نواحِ دل میں کوئی شیشہ گر رہ جائے گا

داغ دامن کے تو دھل جائیں گے سب اک دن، مگر
ایک دھبّہ ہے، جو خونِ دل میں تر رہ جائے گا

اے فسونِ آگہی، یہ بد دعا کس کی لگی
آدمی ہی، آدمی سے، بے خبر رہ جائے گا

ہجرتیں کیسی بھی ہوں، جب بھی پلٹ کر آؤ گے
گھر تو کیا پاؤ گے، بس دیوار و در رہ جائے گا

اے فصیلِ شہر جاں! تو نے ہمیشہ دی اماں
اب جو ہے تو سرنگوں، کیا یہ نگر رہ جائے گا

● پروفیسر قمر رئیس

عبادت

مرے بچپن کے ساتھی، ہم جماعت
مہرباں اور دوست، حاجی یوسفی
اکثر تاسف سے یہ کہتے ہیں
'عجب بندے ہو خالق کے
کہ اس کا نام لیتے ہو
نہ پڑھتے ہو منا جاتیں
نہ پابندِ صلاۃ وصوم ہوتے ہو'
کہا میں نے، مرے بھائی
مجھے دعویٰ نہیں پرہیز گاری، پاکبازی کا
میں عصیاں کار ہوں، بے شک
(ابھی توبہ کا در وا ہے)
مگر میں مغفرت پر خلق کی ایمان رکھتا ہوں
جو سچ کہہ دوں، عجب عبرت کا لمحہ ہے
رہے تم مدتوں، ہم مشرب و ہم ذوق و ہم پیالہ
طوافِ کعبہ و یثرب سے جب لوٹے
بحمد اللہ، فنِ موعظمت بھی ساتھ لائے ہو
عصائے محتسب بھی ہاتھ میں اپنے اُٹھائے ہو
سنو بھائی! عبادت کے بھی کچھ اوقات ہیں لیکن
عبادت، وقت کے حجروں کی زندانی نہیں ہوتی
وہ اک لامنتہا سا سلسلہ ہے
بِنا قصد و ارادہ، شیوۂ پرہیز گاری کا بنا محق عمل کی اضطراری جہد کاری کا
کہ ہم کیا سوچتے ہیں، صبح دم اُٹھ کر؟
کہ ہم کسبِ زر و روزی کا کیا خاکہ بناتے ہیں؟

کہ ہم رزقِ حلال و پاکئی داماں کی
ہر کوشش میں کیا جوکھم اُٹھاتے ہیں؟
کہ ہم کیا دیکھتے ہیں، چشمِ بینا سے؟
اُسے کیا دیکھنے سے باز رکھتے ہیں
کہ ہم ذہنِ رسا سے، سوچتے کیا ہیں
اُسے کیا سوچنے سے باز رکھتے ہیں؟
کہ محسوسات اور جذبات کے طائر
مچلتی خواہشوں کے وحشی آہو
حریمِ دل پہ، دستک کے بِنا
چپ چاپ جب آتے ہیں
بطنِ معنیٔ ہستی میں
کیا طوفاں اُٹھاتے ہیں
کہ ہم طوفاں کو کس حکمت سے
زیرِ دام لاتے ہیں؟
سگانِ حرص و آز و خود پرستی
فرازِ آسماں کی سمت منہ کر کے
جو اکثر بھونکتے ہیں، کوچۂ جاں میں
تو ان کے تیز دانتوں سے
ضمیرِ آدمیت کی قبا کیوں کر بچاتے ہیں؟
عبادت کا عمل
اکثر مجھے لگتا ہے
بسم اللہ کی، خوشیوں بھری تقریب سے لے کر
وداعی قرأتِ یٰسین
اور انفاسِ آخر تک
مسلسل جاری رہتا ہے

کہ یہ لامنتہا سا سلسلہ ہے
جو گھڑیوں اور وقفوں سے جدا ہے
وہ ہر حرفِ صداقت
جو زباں سے
اور قلم کی نوک سے نکلے
جو کاٹے جھوٹ کے سایے
عبادت ہے
وہ ہر لمحہ
دکھی انسان کے دکھ پر
نچوڑے دل کی شریانیں
جو آنکھوں میں نمی لائے
عبادت ہے
وہ نظّارہ
جو ہر بچے کی بھولی مسکراہٹ پر
دلوں کو آسمانی کیف سے بھر دے
نظر کو جگمگا جائے
عبادت ہے
وہ ساعت
جو سحر دم، حسنِ فطرت کے
اُلوہی زمزموں سے
روحِ انساں وجد میں لائے
عبادت ہے
وہ ہر پیشہ
کہ جس کی حرمت و تقدیس کو
انسان، جان و دل سے اپنائے

ہر اک ترغیب سے منہ موڑ کر
جس کو دیانت سے نبھا پائے
عبادت ہے
وہ ایثارِ عمل
جو اس زمیں کے، اور انسانی وراثت کے
جو ہم پر قرض ہیں
ان کو چکا پائے
عبادت ہے
وہ سعیٔ منحرف
جو شہر استبداد میں رہ کر
صدائے جرأتِ انکار کا
پرچم اُٹھا پائے
عبادت ہے

◀◀ ● ▶▶

● پروفیسر قمر رئیس

بزدل

کہا.....کون بزدل ہے؟
آواز آئی.....وہی جو
شکستہ صداؤں کے بن میں کھڑا ہے
جواں سال گیتوں کی میّت اُٹھائے
وہی جو اداسی کی جلتی دوپہری میں
راحت کا ارماں لیے ڈھونڈتا ہے
بلندی پہ پرواز کرتے ہوئے
کچھ پرندوں کے سایے
وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے جو
اس یقیں پر پلا ہے
کہ اجداد کے فیصلوں کی امانت کو
اک حاملہ کی طرح وہ اُٹھائے ہوئے ہے
اندھیرے، اُجالے جو اس واہمہ سے جڑا ہے
کہ ماضی کی سطوت کو
ماتھے پہ اپنے سجائے ہوئے ہے
وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے جو
عسرتِ علم وحکمت کے پاتال میں
بیٹھ کر سوچتا ہے
کہ ہاتھوں میں تہذیب، عرفان اور آگہی کا
پھریرا اُٹھائے ہوئے ہے
کہ بیمار سینے پہ حرفِ صداقت کا
زرکار تمغہ لگائے ہوئے ہے
وہ بزدل ہے

آواز آئی، وہ بزدل ہے جس کی
عزیمت کے آثار واقدار پر
قہر ٹوٹیں اگر
موت اور زندگی دونوں جس کے لیے
طوقِ لعنت بنیں
اور وہ تازہ زخموں سے بہتے ہوئے خون کو
چشمِ نم کے پیالوں سے دھوتا رہے
وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے جو
خوف کے سائباں میں کھڑا
عزم جانباز کی رفعتیں ڈھونڈتا ہے
محبت کی شادابوادی میں جو
گھکروؤں سے بھری نفرتیں ڈھونڈتا ہے
وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے جو
نسل، تہذیب اور خون کے زمزموں کو
عقیدوں کی تلوار سے کاٹتا ہے
رفاقت کے جذبوں نے، صدیوں کے سایے میں
سینچا ہے، جس پیڑ کی ٹہنیوں کو
اسے کُند ہتھیار کی دھار سے کاٹتا ہے
وہ بزدل ہے
آواز آئی، وہ بزدل ہے

◀◀ ● ▶▶

● **محمد جاوید انور**

آخری گجرا

اور پھر ہماری شادی ہوگئی۔

رضیہ میرے خوابوں کی شہزادی تھی۔

میں کیا اور میرے خواب کیا۔

لیکن خواب تو سبھی کے ہوتے ہیں، اور خوابوں کی شہزادیاں بھی۔

میرے پاس تھا کیا اسے دینے کو؟ پھر بھی وہ خوش تھی کہ جو کچھ چھوڑ کر آ رہی تھی وہ بھی کسی کو شہزادی نہیں بنا سکتا، بس خوابوں کی شہزادی ہی بنا سکتا تھا۔

چاچے فضل دین کی رجو میرے ہی نہیں، میرے جیسے بہت سے گئے گزرے شہزادوں کے خوابوں کی شہزادی تھی۔ اور ہم بھی بس شہزادے ہی تھے۔

اپنی ماؤں کے شہزادے۔ تنگ، کیچڑ بھری گلیوں، بدبودار کھلی نالیوں اور ان کے کنارے آوارہ پاخانے پر بھنبھناتی مکھیوں کے ساتھ مانوس، بغیر منہ دھوئے سارا سارا دن آوارہ گردی کرنے والے شہزادے۔

ایک دن سکول اور دو دن بابا شاہ ملنگ کے دربار پر آوارہ گھوم کر گھر لوٹ آنے والے شہزادے۔

ایک ایک جماعت میں کئی کئی سال گزار کر اساتذہ سے مضحکہ خیز القابات حاصل کرنے والے شہزادے۔

ہمیں جیسوں کو لوگ کہتے ہیں، ''اوجا! تو بھی شہزادہ ہی ہے۔''

خیر!

ان حالات میں اگر رجو میرے خوابوں کی شہزادی تھی تو میرے ہی خوابوں کی شہزادی تھی۔ کسی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کوئی مجھے اور رجو کو کیوں جانے گا کہ اعتراض کی نوبت آئے۔

اور جو ہمیں جانتے تھے وہ میرے ہی جیسے شہزادے تھے، جن کے خوابوں کی شہزادیاں بھی بس رجو جیسی ہی تھیں۔

''اوجا! تو بھی شہزادی ہی ہے۔''

ابا کی کھیل مرونڈے کی چھابڑی سے گھر جیسا تیسا چل رہا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔

کسی نے کہا گنے کی گنڈیریوں کے کام میں پیسے زیادہ بچتے ہیں۔ بس ابے نے شام کو چاچے کرم داد سے گنڈیریاں چھیلنا سیکھنا شروع کر دیا۔ ایک ہفتے کی ٹریننگ کافی رہی۔ مضافات سے پونے گنے سے لدی ٹرالیاں ٹریکٹروں کے پیچھے بھاگتی ہرے ہرے، لمبے اور موٹے، گداز گنے لاتیں تو ابا منڈی سے دو گٹھے صبح ہی صبح خرید کر سائیکل پر لاد لاتا۔ چھیل چھال کر گنڈیریاں بنائی جاتیں۔

ابے نے ماسٹر غلام نبی سے لکڑی کی ریہڑی مناسب کرائے پر لے لی۔ میٹھی گنڈیریوں کو ٹوکے سے کٹاک، کٹاک، کاٹ کر ڈھیر لگا لیا جاتا۔ ابا ریہڑی پر لال رنگ کا پلاسٹک بچھاتا، برف کا بڑا سا ٹکڑا جما کر اس کے اوپر میٹھی گنڈیریاں قطار اندر قطار سجاتا۔ اس اہتمام کے بعد شہباز کی دوکان سے خریدی، دیسی گلاب کی خوشبودار، تازہ پتیوں کا چھڑکاؤ سا کر دیا جاتا۔ ترازو باٹ ریہڑی کے نیچے رکھے جاتے۔ پھر چھیلے ہوئے گنوں کے لامبے ٹوٹے ریہڑی کے نچلے خانے میں ٹکائے جاتے۔ گنڈیریوں کی مٹھاس پر مدھ مکھیاں اور بھڑ اُمڈ اُمڈ کر آتے اور مٹھاس چاٹتے، کاٹے بغیر لوٹ جاتے۔

زندگی کے پل، پہر، دن اور ماہ و سال گزرتے چلے گئے۔ عمر ایسے کٹتی گئی جیسے ابّے کی گنڈیریاں۔

کٹ کٹاکٹ، کٹ۔ کٹ کٹاکٹ۔

اور ابے کے ٹوکے کی کٹ کٹاکٹ کے سر پر ہمارا سارا گھر دھمال ڈالتا رہا۔

کٹ کٹاکٹ، کٹ کٹاکٹ۔

دھم دھما دھم۔ دھم دھما دھم۔

ابا جو کماتا لا کر اماں کے ہاتھ پر رکھتا۔

میں نے کبھی ابے کو اماں سے ناراض ہوتے، چیختے چلاتے نہیں دیکھا۔

ابا رات کو ریہڑی دھکیلتا تھکا تھکا یا آتا۔ ابے کی ریہڑی کے ساتھ ہی ساتھ، اس سے آگے ہی آگے چھیلے گنوں کی بوجھل میٹھی خوشبو ہماری کوٹھڑی میں آ گھستی۔

اماں اگر لیٹی ہوتی تو بھی فوراً اٹھ جاتی۔ آگے بڑھ کر ابے کی ریہڑی کا اگلا کنارا پکڑ کر ریہڑی گھر کی دہلیز پار کرانے میں ابے کی مدد کرتی۔ مہکتے کچے آنگن میں ہلکی لکیریں بناتی ریہڑی صحن کے آخری کونے میں اپنی جگہ ٹک جاتی۔ ابا بچی ہوئی برف اور گنڈیریاں سب سے پہلے اماں کے حوالے کرتا۔ اماں اوک بھر

گنڈیریاں مجھے اور اوک بھر میری چھوٹی بہن کو دیتی۔ اگر پھر بھی کچھ بچ رہتیں تو گیلی بوری میں لپیٹ کر کوٹھڑی کے کونے میں بچھے پلاسٹک پر سینت کر رکھتی۔ مجھے یاد نہیں کہ کوئی ایک دن بھی ایسا گزرا ہو جو ابا ہمارے لیے، ہمارے حصے کی گنڈیریاں بچا کر نہ لایا ہو۔

ابا اپنے سر کا پٹکا کھول کر جھاڑتا اور سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے چھدرے بالوں کو چھانٹتا۔

جوتا اتار کر اسے زور زور سے ٹھونک کر اس میں سے دن بھر کی تھکن اور گرد نکالتا پھر چارپائی کے نیچے رکھ دیتا۔

ابا کچھ دیر ننگے پیر پھر کر اپنے پاؤں کو سہلاتا اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر دن بھر کی کمائی رقم اماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔

''لے بھئی بھلی لوک! آج کی ''وٹک۔''

''کل کے گنے کے پیسے مجھے نکال دینا۔''

اماں بسم اللہ پڑھ کر گن کر روپے علیحدہ کرتی اور ابے کو دے کر تھوڑے سے بچے ہوئے پیسے پلو میں باندھ لیتی۔ ان میں سے بجلی، گیس، پانی، دودھ، راشن، دوادارو، ہماری فیس، کتاب کاپی، کپڑا لتا، لینا دینا جانے کیا کیا بھگتانا باقی ہوتا۔

ہم دو ہی بہن بھائی تھے، جو باقاعدہ منصوبہ بندی کا شاخسانہ نہیں تھے بلکہ کسی جسمانی عارضہ کی کارستانیاں تھیں۔ اس بات پر ابا نہ خوش تھا نہ ناراض۔ اماں البتہ کبھی کبھی بہت افسوس کرتی کی میرا کوئی بھائی نہ تھا جو بازو بنتا اور گڈو کی کوئی بہن نہ تھی جو سہیلی بنتی۔ ذاتی طور پر مجھے نہ کبھی بھائی کی کمی کھلی، کہ محلہ میرے یاروں سے بھرا پڑا تھا اور نہ دوسری بہن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گڈو مجھے اتنی پیاری تھی کہ میری ساری توجہ اور سارا پیار بھی اس کے لیے کم تھا۔

اگر میری اب تک کی کتھا کہانی سے کوئی یہ تاثر لے کہ ہم بہت مزے میں تھے اور کوئی خاص مسئلہ تھا ہی نہیں تو یہ سخت غلط فہمی ہوگی۔

امی کی کڑھائی سے اکٹھی کی گئی رقم بھی ختم ہو جاتی تو ہمیں پتا چل جاتا کہ کل ناشتے میں دہی نہیں ملے گا اور پراٹھے کی جگہ خشک روٹی ہوگی۔ وہ بھی شاید رات کی بچی ہوئی، باسی۔

ہمیں اس صورت حال سے سمجھوتہ کرنے کی عادت ہوگئی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ بس یہی کچھ ممکن تھا جو ابا اور اماں جان مار کر ہمیں مہیا کر سکتے تھے۔ وہ نہ ہم سے کچھ چھپاتے تھے اور نہ بچاتے تھے۔ سب دکھ سکھ سانجھا تھا تو گلہ کیا اور شکایت کیا۔

مگر بات تو میری اور رجو کی ہو رہی تھی۔ ہم کدھر اماں اور ابے کی کہانی لے بیٹھے۔ وہ تو پتا نہیں کس مٹی کے بنے تھے۔ لیکن تھے کسی ایک ہی مٹی کے، یہ تو ہم بھی جان گئے تھے۔

میں نے ابے اور امی کو خوب خوب تنگ کیا۔ ابے کی محنت کی کمائی کی فیسیں ضائع کرتے کچھ شرم نہ آئی۔ بس مست تھا۔ اپنے ہمجولیوں میں یوں بھاگا پھرتا تھا جیسے زندگی مذاق ہی ہو۔ ہر افق پر کہکشاں نظر آتی تھی۔ ہر سراب ٹھاٹھیں مارتا دریا، بلکہ سمندر دکھتا تھا۔

گڈو مجھ سے چھوٹی تھی۔ پانچویں پاس کر کے گھر بیٹھ گئی اور ماں کی مددگار بن گئی۔

کہتے ہیں لڑکیاں جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔ گڈو ابھی کچھ زیادہ بھی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ نذیر کی ڈولی میں بٹھا دی گئی۔ نذیر کا قصبہ ہمارے شہر سے بہت دور نہیں تھا، پھر بھی اتنی دور ضرور تھا کہ گڈو چاہتے ہوئے بھی ہمیں چار چھ مہینے سے قبل ملنے نہ آ پاتی۔ اپنے والد کے فوت ہونے کے بعد، اپنی شادی سے پہلے ہی نذیر اپنے والد کا چھوٹا سا سائیکل پنکچر کا اڈہ اکیلا چلا رہا تھا۔ بمشکل گھر کے اخراجات پورے کرتا۔ گڈو کے آجانے سے اسے گھر کی فکر کم ہوگئی کیونکہ گڈو کم عمر ہونے کے باوجود بڑی سگھڑ گرہستن نکلی۔ اس کے ذمہ دارانہ کردار نے اسے اپنی سسرال میں اتنا اہم بنا دیا کہ نذیر اور اس کی ماں کو لگتا گڈو دائیں سے بائیں ہوئی تو ان کا گھر گر پڑے گا۔

مجھے گڈو میں اماں کی جھلک نظر آتی۔

ابے اور امی کو اس بات کی خوشی اور سکون تھا کہ گڈو اپنے گھر میں اتنی اہم بن گئی تھی۔ شادی کے شروع میں ان کی اداسی دیکھی نہ جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ یہ بہت بڑی کمی برداشت کر گئے۔

میری آوارہ گردی اور ابا کی کٹ، کٹا، کٹ..... میں میری زندگی بہت مزے سے گذر رہی تھی۔

چاچے فضل دین کی ابے سے یاری نہ ہوتی اور میری امی کو وہ چھوٹی بہن نہ سمجھتا تو مجھ جیسے لاپروا لڑکے کو رجو کا ایک بال بھی اکھاڑ کر نہ دیتا۔

رجو اماں کی لاڈلی بن گئی۔

گڈو کے حصہ کی اوک بھر گنڈیریاں اب ہر رات رجو کا حصہ بنتیں۔

نہ بنا تو میں کچھ نہ بنا۔

بس ''شہزادے کا شہزادہ'' ہی رہا۔

لاپروا اور کھلنڈرا۔

کسی کے ابا کو مرنا نہیں چاہئے۔

اور پھر میرے ابا جیسے ابے کو تو کبھی بھی نہیں مرنا چاہئے۔

اس لیے کہ جب ایسے ابے مرتے ہیں تو پھر امیاں بھی زیادہ دیر زندہ نہیں رہتیں۔

میرے ابے نے میرے ساتھ یہی کچھ کیا۔

ایک شام کو چنگا بھلا کام سے واپس آیا۔ ہماری چلو بھر گنڈیریاں ہم تک پہنچیں۔ اماں کی معمول کی رسومات ادا ہوئیں۔ رات کا کھانا کھا کر، صبح کی تیاری کر کے ابا چھت پر جا سویا۔

صبح دھوپ چڑھ آئی پر ابا نہیں اُٹھا۔ امی نے مجھے کہا کہ ابے کو جگاؤ۔ اٹھے گا تو وقت پر گنڈیریاں کاٹ کر تیاری کرے گا۔ نہ جگایا تو ڈانٹے گا کہ سارا دن خراب کر دیا۔ شاید زیادہ تھک کر سویا ہے جو سویا ہی پڑا ہے۔ اماں پراٹھے بنانے کی تیاری میں لگ گئی۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا چھت پر ابے کو جگانے گیا۔ دیکھا کہ وہ چارپائی پر چت لیٹا تھا۔ ڈبیوں والا کھیس چارپائی سے نیچے کچی چھت پر گرا پڑا تھا۔

میں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آواز دی تو ابا اٹھا ہی نہیں۔

پھر میرا ابا کبھی نہیں اٹھا۔

کبھی بھی نہیں۔

دیسی گلاب کی پتیوں سے ڈھکا مہکتا جنازہ اٹھا تو اماں، گڈو اور رجو بے اختیار ساتھ ہو لیں۔

محلے کی عورتیں بمشکل انہیں گلی کے نکڑ سے واپس لائیں۔

ان کا بس چلتا تو ابے کے ساتھ ہی قبرستان جا بستیں۔

پھر میں بھی کاہے کو گھر رہتا۔

ابے کو دفنانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔

محلے کا قریبی قبرستان، اردگرد بڑی پرانی آبادی ہونے کی وجہ سے، قبروں سے مکمل بھر چکا تھا۔ میں جب کھیلتا کودتا کبھی قبرستان میں جا نکلتا تو سوچا کرتا کہ مردے اتنی قربت میں کیسے رہتے ہونگے۔ کروٹ تک لینا محال ہوگا۔ آج ابے کے لیے جگہ کی ضرورت پڑی تو مسئلہ کھل کر سامنے آیا۔

نئی قبر کی جگہ باقی ہی نہیں بچی تھی۔ ابے کے یاروں نے گورکن سے ساز باز کر کے ایک جگہ حاصل کر لی۔ جب ابے کو دفن کرنے کا وقت آیا تو مجھے لگا کہ قبر شاید پرانی ہے اور چھیل چھال کر نئی بنائی گئی ہے۔ میں شور مچانے ہی والا تھا کہ مجھے خیال آیا، ابا کونسا پہلے سبھی چیزیں نئی استعمال کرتا تھا۔ کتنی ہی بار اس نے لاتعداد استعمال شدہ چیزوں کے ساتھ بڑی خوشی سے گزارا کیا تھا۔ مجھے لگا ابے کو اتنی مشکل سے حاصل کی گئی استعمال شدہ قبر پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ پھر قریب ترین قبرستان ہونے کی وجہ سے اماں کو بھی زیارت

میں آسانی ہوگی۔

نہ میں نے اعتراض کیا نہ ابا کی میت نے، اور ہم دونوں باخوشی اس جیسی تیسی قبر پر مطمئن ہو گئے۔

ایک فضول سا خیال میرے ذہن میں، اتنے صدمہ کے باوجود بھی، جانے کدھر سے آ گیا۔

میری اماں کی بھی تو میرے ابا سے دوسری شادی ہی تھی۔ بالکل نوعمری میں بیوہ ہونے کے بعد ابا سے جو شادی ہوئی تو کسی کنواری دلہن کو بھی کیا راس آئی ہوگی جو اس بیوہ کو راس آئی۔ ہم یہ فیصلہ نہ کر پائے کہ ابا اماں کے ساتھ زیادہ خوش اور مطمئن تھا یا اماں ابا کے ساتھ۔ ہم نے تو مشکل سے مشکل اور اچھے سے اچھے وقت میں دونوں کو کاندھے سے کاندھا ملائے یک جان و دو قالب، مطمئن اور شاکر، جیون بیتا کھیتے دیکھا۔ دونوں یوں لازم و ملزوم کہ کسی ایک کے بغیر گھر کا تصور، محال نہیں ناممکن۔

اماں شادی کے بعد شاید ہی کبھی میکے گئی ہو۔ ایک بار نانی کے بہت اصرار پر سات دن کے لیے گئی تو ابا تیسرے دن ہی جا کر واپس لے آیا کہ ''ہمارا گھر نہیں چلتا۔''

اگرچہ گڈو اماں کی موجودگی میں بھی کھانا بنا لیتی تھی، جو ابا کو پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ اماں نے بنایا ہے یا اس کی شاگردی میں گڈو نے، لیکن جب اماں کی غیر حاضری میں گڈو نے ابا کو کھانا دیا تو ایسے لگا جیسے نوالے اس کے حلق سے اتر ہی نہیں رہے۔

بولا، ''گڈو برتن لے لو۔ تیری اماں نے تجھے اپنے جیسا کھانا بنانا سکھایا ہی نہیں۔''

میں اور گڈو ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ، مسکرا کر رہ گئے۔

ارے بات پھر اماں اور ابا کی شروع ہو گئی۔

مجھے شاید اور کوئی بات ہی نہیں آتی۔

ابا فوت ہوا تو اماں روئی نہیں۔

بس اماں اماں نہ رہی۔

لگتا کوئی اجنبی روح جانے پہچانے بت کو گھسٹتی پھرتی ہے۔

بے جان سی گڑیا کی طرح ڈولتی، ٹھوکریں کھاتی، بے دھیان چلتی پھرتی۔

صبح اٹھتی، نماز پڑھتی اور قبرستان روانہ ہو جاتی۔ ابے کی قبر پر کھڑی ہو کر فاتحہ پڑھتی، پڑھتی ہی چلی جاتی۔ کھڑی کھڑی تھک جاتی تو بیٹھ کر پڑھنا جاری رکھتی۔ بہت دھوپ چڑھنے پر واپسی کی راہ پکڑتی۔ کھانا بس نہ کھانے جیسا کھاتی۔ کبھی دو لقمے لے لیے اور کبھی وہ بھی نہ لیے۔ دسویں تک اماں آدھی رہ گئی اور چالیسویں تک اماں سے چارپائی چھوڑی نہ جاتی تھی۔

ابے کے جانے کے ٹھیک دو مہینے اور چار دن بعد اماں بھی رخصت ہوگئی۔

اماں کے لیے قبر کا بندوبست ابا کے دوستوں ہی نے کیا۔ ابا کی قبر سے آٹھ دس قبروں کے فاصلے پر ایک قبر کی جگہ بنالی گئی۔

ابا اور پھر اماں کے مرنے پر میں اور رجو بالکل لاوارث ہوگئے۔ ابا تھا تو میں تقریباً بے کار ہی تھا۔ زیادہ سے زیادہ گنے چھیلنے اور گنڈیریاں کاٹنے میں کبھی کبھار ابے کی کچھ مدد کر دیتا۔ ابا ریہڑی لے کر بازار نکل جاتا اور میں آوارہ گردی کو۔ ابے کی عادت زیادہ سختی والی نہیں تھی۔ بس مجھے آرام سے اور بار بار سمجھاتا کہ میری شادی ہوچکی تھی اور مجھے ذمہ دار ہوجانا چاہئے۔ میں سر نیچے کر کے سن لیتا اور کوئی اثر نہ لیتا۔

اماں البتہ زیادہ زور دیتی اور شرم دلاتی کہ شادی شدہ ہوکر بھی میں غیر ذمہ دار تھا۔ کل کو بچے پیدا ہوجائیں گے تو ضروریات بڑھ جائیں گی۔ اماں یہ بھی کہتی کہ ابے کی بوڑھی ہڈیاں کب تک میرا اور میری بیوی سمیت گھر گھرہستی کا بوجھ اٹھائیں گی۔ میں جوان تھا ہٹا کٹا تھا۔ ساتویں سے آگے پڑھ کر نہیں دیا تھا نہ کوئی ہنر سیکھا تھا تو میرا بنے گا کیا۔ مجھے ابے کی بات کا کچھ اثر ہوتا نہ اماں کا۔

میں تو تھا ہی ازلی، مستند ڈھیٹ۔

اماں کا چالیسواں بھی گذر گیا۔ ہمارے ہاں مرگ گھر والوں کے لیے مالی بوجھ ہی بنتی ہے۔ رشتے دار ہاتھ بٹانے کی بجائے اخراجات کا باعث بنتے ہیں۔ کفن، قبر، مولوی صاحب، قُل، دسواں اور چالیسواں۔

پھر جس گھر میں اوپر تلے دو اموات ہوجائیں، اور رخصت بھی وہ ہوں جو بنیادی ستون ہوں، جن پر مکمل گھر ٹکا ہو تو آپ اندازہ لگائیں کہ باقی کیا بچے گا۔

ہمارا پس انداز کچھ زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ جب ہوش آیا تو تقریباً قلاش تھے۔

ماسٹر غلام نبی والی ریہڑی ابے کے مرنے والے دن سے اسی کونے میں کھڑی تھی جہاں ابا اسے کھڑا کر گیا تھا۔ میں جب بھی اسے دیکھتا تو سو منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے۔ کیسے ابا امی کی مدد سے، آخری بار ریہڑی گھر کے اندر لایا تھا۔ مجھے بھول ہی نہیں پاتا تھا کہ اس شام کیسے روز ہی کی طرح کھلی کھلی اماں، بے مقصد ابے کے پیچھے چلتے، صحن سے پار دیوار تک گئی تھی جہاں ابے نے روزانہ کے معمول والی جگہ ریہڑی کھڑی کر کے کرتے کی جیب میں مسکراتے ہوئے ہاتھ ڈالا تھا۔ اس دن ایسے محسوس ہوا تھا جیسے ابا دن بھر کے جمع شدہ پیسے ایک منٹ بھی اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ جو خوشی اسے پیسے اماں کے ہاتھ پر رکھ کر ملتی تھی وہ جلد سے جلد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

بات پھر اماں ابا کی شروع ہوگئی۔ لگتا ہے میری زندگی میں اور کچھ ہے ہی نہیں۔ جیسے مجھے اور کوئی بات آتی ہی نہیں۔ جیسے میری زندگی اماں ابا پر رک گئی ہو۔

لیکن زندگی بھی رکی ہے کبھی۔

جب روٹی کے لالے پڑے تو میں نے سوچا کہ خود تو مانگ تانگ کر کھا بھی لوں لیکن بیوی کا کیا کروں گا۔ پھر ایک جان اور آنے والی تھی۔

زندگی یہ نہیں دیکھتی کہ کون کتنا لاڈ لایا کتنا لاپروا تھا۔ زندگی بے رحمی سے اپنا خراج مانگتی ہے۔

اب جب سر پر کوئی نہیں تھا، جب اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا تو مجھے بہر حال بدلنا تھا۔ اب نہ ابا تھا کہ سارا آسماں ہمارے سر پر تھامے رکھے، نہ اماں تھی کہ دیکھوں تو کلیجہ ٹھنڈا ہوجائے۔

اب میں تھا، رجو تھی اور اک آنے والی روح تھی، بس۔

جب سب بدل گیا تھا تو میں بھی خود ہی بدل گیا۔

اب کون تھا جو میرے لاڈ دیکھتا۔

میں نے اک عزم کے ساتھ ریہڑی صحن کے کونے میں لگے پانی کے نل کے پاس کھڑی کی اور مہینوں کی جمی دھول مٹی کو دھوڈالا۔ لال پلاسٹک کو کپڑے دھونے والے صابن سے دھویا اور ریہڑی کو صحن میں مارچ کی دھوپ میں خشک ہونے کے لیے کھڑا کر دیا۔

اماں کی آہنی صندوقچی سے بچے کھچے پیسے لے کر صبح ہی صبح سبزی منڈی پہنچ گیا۔ دو کی بجائے ایک گٹھا گنے خریدے اور سائیکل پر لاد بمشکل گھر لایا۔ میں نے اور رجو نے مل کر گنے چھیلے اور بڑی دقّت سے ٹیڑھی میڑھی گنڈیریاں کاٹیں۔

صبح ہی صبح میں تراز و باٹ جما، ریہڑی لے کر نکلا تو رضیہ میرے ساتھ باہر گلی تک آئی۔

مجھے رخصت کرنے لگی تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ یقیناً سوچ رہی ہوگی کہ ابا ہوتا تو میں کبھی بھی اس کام میں نہ پڑتا۔ بس آوارہ گرد شہزادہ ہی بنا رہتا۔

وقت بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے اور کیا کیا کروا دیتا ہے۔

ریہڑی دھکیلتے دھکیلتے میں کتابوں کی ان دکانوں کے سامنے جا پہنچا جہاں ابا ریہڑی لگایا کرتا تھا۔

میں یہ دیکھ کر پریشان ہوگیا کہ ایک بڑی مونچھوں اور پھولے ہوئے پیٹ والا فروٹ چاٹ فروش عین اس جگہ ریہڑی لگائے دھندہ کر رہا تھا جہاں ابا کا ڈیرہ ہوا کرتا تھا۔ میری ریہڑی پر نظر پڑی تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور مونچھوں پر تاؤ دے کر لال آنکھیں گھمائیں جیسے کچا چبا جائے گا۔ میں خوف زدہ ہوکر جھینپتے

ہوئے ریہڑی دھکیلتا، کنی کترا کر، آگے نکل گیا۔ بڑی سڑک سے پہلے گلی کے نکڑ پر بجلی کے کھمبے کے ساتھ مجھے ریہڑی کھڑی کرنے کی جگہ مل گئی۔ میں نے ریہڑی وہیں ٹکالی۔ جوں جوں وقت گزرا بازار کی رونق بڑھتی گئی۔ میرا پہلا گاہک آدھ کلو گنڈیری خرید کر لے گیا تو مجھے لگا میں دنیا میں آنے کا مقصد پا گیا ہوں۔

میں نے خیالوں ہی خیالوں میں دن بھر کی "وٹک" رجو کی ہتھیلی پر رکھی اور مسکرا دیا۔

اگلے دو گھنٹے میں دو کلو گنڈیریاں مزید بک گئیں۔ میں نے حساب لگایا تو بکری کی رفتار کوئی تسلی بخش نہیں تھی۔ خود کو دلاسا دیا کہ پہلا دن ہے، نیا اڈہ ہے، رفتہ رفتہ گاہک بڑھ جائیں گے۔

شام تک پانچ کلو گنڈیریاں بک گئیں۔

کٹی ہوئی گنڈیریوں میں سے ابھی بھی کافی بچ رہی تھیں۔

میں نے حساب لگایا کہ دھندہ سمیٹوں تو اسی وقت تک گھر پہنچ جاؤں گا جس وقت رات کو ابا گھر پہنچ جاتا تھا۔

ترازو باٹ سنبھالے، بچی ہوئی گنڈیریوں کو ململ کے کپڑے سے ڈھانپا اور گھر روانہ ہوا۔

گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو رجو بھاگتی آئی، دروازہ کھولا اور ریہڑی کو میرے ساتھ دھکیلتی گھر کے اندر لے گئی۔ میں نے ریہڑی عین وہیں کھڑی کی جہاں ابا کھڑی کیا کرتا تھا اور چلو بھر گنڈیریاں پکڑ کر رضیہ کی طرف دیکھا۔

میرا دل بھر آیا۔

ذرا سنبھل کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دن بھر کی کمائی نکال کر رجو کے ہاتھ پر رکھی۔

"یہ لو بھلی لوک آج کی ''وٹک۔''

مجھے گنوں کے لیے رقم نہیں چاہئے تھی کیونکہ میرے کل کے بچے آدھے گنے ابھی باقی تھے۔

اگلے دن پھر معمول کے مطابق میں ریہڑی لے کر کل والی جگہ پر جا ٹکا۔

ابھی ریہڑی کھڑی ہی کی تھی کہ خاکروب جھاڑو پکڑے آ پہنچا اور پانچ روپے کا تقاضہ کرنے لگا۔ پتا چلا کہ یہ روزانہ کا بھتہ اسے سب ریہڑی والے دیتے ہیں۔ شکر ہے جیب میں دس روپے تھے سو اس سے جان چھڑائی۔

آج گاہکی کل کی نسبت بہتر تھی۔ دوپہر تک تین چار کلو گنڈیریاں نکل گئیں۔ میں خوش تھا کہ کام چل نکلا ہے اور جلد ہی میں ابے جتنی کمائی کرنے لگوں گا۔

سہ پہر تین بجے کے قریب بازار میں ایک غلغلہ اٹھا۔

آناً فاناً دو ٹرک اور درجنوں کارندے غارت گری کرتے آوارد ہوئے۔

فروٹ چاٹ والا مچھندر ریہڑی بھگا کر قریبی گلی میں گھس گیا۔ میں ابھی حیرت زدہ، حواس باختہ صورت حال سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ میری ریہڑی قابو کر کے بڑی سرعت سے گنڈیریوں اور باقی ساز وسامان سمیت ٹرک پر لاد دی گئی۔ میں نے بھاگ کر ٹرک پر چڑھنے کی کوشش کی تو ایک ڈنڈا میرے سر پر پڑا اور ایک تھپڑ میرے منہ پر۔ میں درد اور توہین کے باعث ساکت ہو کر رہ گیا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے میونسپلٹی کا تہہ بازاری کا عملہ اور ٹرک میری ساری کائنات سمیت گھر غائب ہو گئے۔

شام گئے میں لٹا پٹا گھر پہنچا۔

رجو مجھے یوں بدحال دیکھ کر سخت پریشان ہوئی۔ اگلی صبح اور بری ثابت ہوئی۔

ماسٹر غلام نبی صبح ہی صبح آ دھمکا۔ بولا ابا کی شرافت کی وجہ سے اس نے کئی مہینے سے ریہڑی کا کرایہ نہیں لیا تھا اور اب ریہڑی ہی چلی گئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ وہ جرمانہ بھر کر میونسپلٹی سے اپنی ریہڑی واپس لے آئے گا اور باقی کرایہ بھی نہیں مانگے گا لیکن آئندہ کے لیے مجھ نکمے کو ریہڑی نہیں دے گا۔

میں اور رجو اتنے پریشان ہوئے کہ ہمارے منہ سے کوئی دلیل بھی نہ نکلی۔ بس ٹک ٹک اسے غصے سے بھنا کر جاتا دیکھتے رہے۔

نام کتاب: منظر اس پار کا (غزلیں)	نام کتاب: بادصبا (غزلیں)
شاعر: محمد مختار وفاؔ	شاعرہ: طاہرہ مسعود
صفحات: ۱۶۵	صفحات: ۱۸۱
قیمت: ۲۰۰/روپے	قیمت: ۴۰۰/روپے
سال اشاعت: ۲۰۱۷	سال اشاعت: ۲۰۱۷

اس کے جانے کے کافی دیر بعد تک ہم میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔

ہم بس بے حس و حرکت سے ہو گئے۔

ایسے لگا جیسے ابا اور اماں کی محبت کی نشانی کوئی ہم سے چھین لے گیا ہو۔

جیسے ہمارے گھر کی رونق چھن گئی ہو۔

جیسے جینے کی امید مدھم پڑ گئی ہو۔

دو دن تک ہم اس صدمے سے بے حال رہے۔ رجو گھر کے کام کاج میں دل لگانے کی کوشش کرتی لیکن پھر پھرا کے خالی خالی سی میرے پاس آ بیٹھتی۔

میں نے کوشش کی کہ گھر سے باہر کوئی مصروفیت ڈھونڈھوں، کام کی کوئی سبیل سوچوں لیکن کچھ بھی نہ سوجھا۔

اسی خالی کھوکھلے پن کو لیے میں ایک دن سڑکوں پر نکل گیا۔ شام تک آوارہ گھوما کیا۔ تھک گیا تو کٹی پتنگ کی طرح ڈولتا ایک چوک میں بنے فوارے کے گرد بنی فٹ ڈیڑھ فٹ اونچی دیوار پر ٹک گیا۔

چوراہا زیادہ مصروف نہیں تھا۔ جب لال بتی ایک طرف کی گاڑیوں کو روکتی تو اشارہ کھلتے کھلتے پانچ سات گاڑیاں اکٹھی ہو جاتیں۔ دو بھکاری لڑکے اور ایک بوڑھی عورت گاڑیوں کے بند شیشوں پر دستک دے کر بھیک مانگتے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی جس کا ایک بازو کٹا ہوا تھا گاڑیاں صاف کرنے والے کپڑے کے ٹکڑے بیچ رہا تھا۔ اچانک میری نظر پندرہ سولہ سال کے ایک لڑکے پر پڑی جو سر کنڈے پر لال گلاب اور سفید چنبیلی کے پھولوں والے گجرے بیچ رہا تھا۔ اس لڑکے کے کپڑے صاف تھے اور بال تیل لگا کر کنگھی کیے ہوئے تھے۔ اس نے ایک کان میں چنبیلی کا پھول اُڑس رکھا تھا اور چہرے پر معصومیت تیرتی پھرتی تھی۔

میں نے غور کیا تو مجھے یہ لڑکا چوک میں موجود سب کاروباری لوگوں سے بہتر اور دلچسپ لگا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور جانے کتنے دن کے بعد میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں فوارے کی دیوار سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے اپنے محلے کی طرف روانہ ہوا۔

ہماری گلی کے نکڑ پر شہباز پھولوں والا، حسب معمول، اپنی دوکان مہکائے بیٹھا تھا۔

''یار شہباز مجھے گلاب کے پھول اور چنبیلی کی کلیاں چاہئیں۔''

میری بات سن کر وہ چونکا۔

بہر حال میں نے بڑے عمدہ تر و تازہ پھول اور کلیاں خریدیں اور گھر روانہ ہوا۔

رجو نے مجھے آتے دیکھا تو اس کے چہرے پر اطمینان اور آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''رضیہ رانی مجھے گجرے بنا دو۔ میں گجرے بیچوں گا۔''

میں نے پھولوں کا پیکٹ رجو کے حوالے کیا۔

رضیہ نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا لیکن بات کیے بغیر ہی پیکٹ لے کر کمرے میں گھس گئی۔

رات بیٹھ کر بڑی دلجمعی سے رجو نے پچیس گجرے بنائے۔ اتنی نفاست سے کہ دل خوش ہو گیا۔

ہمیں پتا تھا کہ گجرے زیادہ تر شام کو بکتے ہیں اس لیے ہم نے گجروں کو پانی چھڑک کر دن بھر تازہ رکھا۔

شام سے پہلے میں گجرے سر کنڈے پر سجائے گھر سے کوس بھر دور اس چوک پر جا کھڑا ہوا جس کی ایک سمت میں ایک بڑی مارکیٹ کا راستہ تھا اور دوسری طرف بڑے بڑے فلیٹس والی بلند و بالا عمارات تھیں۔

شام تک میرے دو تین گجرے ہی بکے۔

مجھے گھر کی فکر تھی، رجو سے پیار تھا اور آنے والی روح کے لیے میرا دل محبت سے بھرا ہوا تھا۔

مجھے کم از کم اتنی رقم کمانی تھی کہ میں گھر چلا سکوں۔

مجھے سب گجرے بیچنے تھے۔

ایک ایک گجرے کا معاوضہ میرے آنے والے کل کی عافیت کی ضمانت تھا۔

ہر بکتے گجرے کے ساتھ میرے اعتماد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات ہونے پر لوگ جوڑوں کی شکل میں تقریبات کے لیے نکلے تو گجروں کی بکری میں تیزی آئی۔

پھر کافی دیر مجھے بیکار انتظار کرنا پڑا۔

اسی دوران مجھے سب سے زیادہ مزہ ایک ستر پچہتر سالہ جوڑے کو گجرا بیچ کر آیا۔ بوڑھے مرد نے بڑے رچاؤ سے خرید کر اپنے کانپتے ہاتھوں سے گجرا اپنی ہم عمر خاتون کو پہنایا۔ مجھے ابا اور اماں یاد آ گئے اور میں اداس ہو گیا ہے۔

''یقیناً آج اس عمر رسیدہ جوڑے کی شادی کی سالگرہ ہو گی۔''

میرے ذہن میں خیال آیا۔

''پچاسویں شاید؟''

میرا ذہن آوارہ ہوا۔

''لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو پہلی سالگرہ والوں سے زیادہ خوش اور مطمئن لگ رہے تھے۔ اس عمر میں بھی ایک دوسرے میں منہمک۔''

رات بھیگی تو ایک اور طرح کے گاہک آنا شروع ہو گئے۔ وہ جنہیں دیکھنے ہی سے پتا چل رہا تھا کہ شب بھر کا اہتمام کیے پھرتے ہیں۔

گجرے بیچتے بیچتے تقریباً آدھی رات بیت گئی۔ میں نے رجو کے انتظار کا سوچا لیکن پھر فیصلہ کیا کہ میرے کامیاب کاروبار کا پہلا دن ہے، میں رجو کو سمجھا دوں گا کہ اتنی رات گئے کیوں واپس آیا ہوں لیکن سب گجرے بیچ کر ہی جاؤں گا۔

رات ڈیڑھ بجے کے قریب میرے پاس صرف ایک گجرا رہ گیا۔

جیب میں رکھے کرنسی نوٹوں کی حرارت میں اپنے سینے میں محسوس کر رہا تھا۔

اب سڑک پر اکا دکا گاڑی بہت دیر بعد آتی۔

سڑکیں سنسان ہونے لگیں۔ چوک کے اشارے سرخ اور سبز روشنی دکھانے کی بجائے بار بار اور جلدی جلدی مسلسل پیلی روشنی دکھانے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ اب اس چوک میں اشارے کے سبز ہونے کے انتظار میں گاڑی کھڑی کرنا ضروری نہیں۔

میں نے اپنے آخری گجرے پر نظر ڈالی۔

اسی اثنا میں ایک بڑی سی شاندار سیاہ رنگ کی کار آ کر میرے پاس رک گئی۔ پچھلی نشست کا شیشہ کھلا۔ ایک ادھیڑ عمر کا خوش پوش شخص نظر آیا جس کا سرخ و سفید چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ساتھ کی سیٹ پر کوئی بائیس تئیس سال کی نوخیز لڑکی، کہ جس کا حسن نظر ڈالنے کی ہمت بھی چھین رہا تھا تقریباً نیم دراز مرد کے اوپر گری پڑتی تھی۔

''مجھے گجرا دے دو۔''

مجھے مرد کی لکنت بھری لہراتی آواز سنائی دی۔

میں بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

لڑکی نے مدہوشی میں اپنا بازو اوپر اٹھایا اور گورے بازو کی خوب صورت کلائی پر اپنے دوسرے ہاتھ سے دائرہ بنایا کہ گجرا کہاں چاہیے۔

مرد نے دوبارہ ہاتھ باہر نکال کر مجھے اشارہ کیا۔

''گجرا دے دو۔''

میں پھر ویسے ہی کھڑا رہا۔

مرد کا ہاتھ اس کے لباس میں غائب ہوا۔ واپس نکلا تو اس کے ہاتھ میں پانچ سو کا نیا نوٹ تھا جو

اس نے میری طرف بڑھایا۔

''لڑکے یہ سارے پیسے لے لو اور مجھے گجرا دے دو۔''

میں نے ایک لحظہ کے لیے سوچا۔ پانچ سو کا نیا نوٹ سامنے لہرا رہا تھا۔

مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

میں فیصلہ کن انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

کھڑکی کی طرف نظر کی تو حسینہ ابھی بھی اپنی گوری گلابی کلائی پر دوسرے ہاتھ کا ہالہ بناتی خیالی گجرا پہن رہی تھی۔

یہ اشارہ مدہوش مرد کی بے تابی کو دو چند کرتا تھا۔

اچانک مجھے اس گوری کلائی کی جگہ رجو کی کھردری سی سانولی کلائی، ایک لحظہ کے لیے، نظر آئی اور غائب ہو گئی۔

میرا فیصلہ اٹل ہو گیا۔

''گجرے ختم ہو گئے ہیں بابو جی۔''

میں دو قدم مزید پیچھے ہٹا اور اپنے گھر کی طرف منہ کر کے تیز تیز چلنے لگا۔

چند قدم چل کر میں نے مڑ کر دیکھا تو گورا تنومند بازو پانچ سو کا نیا نوٹ ابھی تک میری طرف لہرا رہا تھا۔

میری رفتار میرے گھر کی سمت اور تیز ہو گئی۔

رجو میری منتظر ہو گی اور اماں کی اوک بھر گنڈیریاں میں کسی قیمت پر نہیں بیچ سکتا تھا۔

پانچ سو روپے میں بھی نہیں۔

یہ میری ''شہزادی'' کا گجرا تھا۔

آخری بچا ہوا گجرا۔

◀◀ ● ▶▶

11-D Mayo Gardens
Lahore - 54000 Pakistan
Mob: 0300 4404984

● ناصر بغدادی

اندمال

بارش رکنے کے بعد موسم کتنا نکھر جاتا ہے، اس کا اندازہ تو وہی کر سکتا ہے جس کا دل مسرت و محبت کے دل نواز گیتوں کی دھن پر محو رقص ہو۔ مگر یہاں بات ایک ایسے زخم خوردہ دل کی ہے جو خوشی کی ہر شئے کو بھول چکا ہو۔

بارش ابھی ابھی تھمی ہے۔ چند لمحوں پہلے تک فضا میں جو بوندیں آسمان کے دریچے سے زقندیں بھرتی ہوئیں زمین کی سمت آ رہی تھیں، اب وہ بھی رک گئی ہیں۔ پھر یکا یک ہر شئے اس طرح سرور و مستی میں چُور نظر آنے لگی جیسے زندگی کی تمام تر طرب انگیز بہاریں ان کے دامن میں سمٹ آئی ہوں۔ یہ آسمان کی فراخ پیشانی پر ثبت رنگین دھاریاں، یہ سرمئی بادلوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے آسمان کے نیلے حاشئے، یہ پھولوں اور پتیوں پر جھومتی ہوئی ننھی بوندیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آج دنیا سے غم کا نام و نمود مٹ گیا ہو۔

میں اس وقت برآمدے میں چوکور ستون کے پاس بید کی کرسی ڈالے گم سم بیٹھا ہوں۔ مجھے اس جگہ سے والہانہ عشق ہے۔ ماضی کی بیش تر شامیں میں نے اسی جگہ گذاری ہیں۔ کبھی اخبار ہاتھ میں لیے اور کبھی

کسی ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے۔ مگر اس وقت میری انگلیوں میں اَدھ سلگتی ہوئی سگریٹ میرے اپنے دل کی دھڑکنوں کی طرح لرز رہی ہے۔ میرے قریب ہی ایک کرسی پر مریم خاموش بیٹھی کسی انگلش میگزین کا جائزہ لے رہی ہے۔ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ اس کومل، چھوئی موئی جیسی لڑکی کا ذہن اس وقت خیالات کا ایک ایسا جال بن رہا ہے جس کا شاید کوئی سرا نہیں، کوئی انت نہیں۔ یہ مری شریک حیات ہے۔ مجھے یہ لڑکی بے حد عزیز ہے۔ میری ہر بات پر لبیک کہنا اس نے اپنا فرض اولین سمجھا ہے مگر آج تک اس نے اپنی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کا دل ایک ایسا گنبد بے در بن گیا ہو جہاں سے کسی آرزو کا گذرنا ممکن ہو۔

اس کی طرح میں بھی خاموشی اور کم گوئی کو ترجیح دیتا ہوں۔ ہم دونوں کی اس مشترکہ فطرت کی وجہ سے کبھی کبھی گھر سائیں سائیں کرتا محسوس ہوتا ہے۔ وہ جذبات سے عاری نگاہوں سے چھت کو تکنے لگتی ہے اور میں در و دیوار کو گھورنے لگتا ہوں۔

اس وقت چوبی گیٹ کا بڑا پٹ کھلا ہوا ہے۔ اس کو میں نے ہی کھولا ہے۔ جب بارش ہوتی ہے تو میں برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہوں اور سگریٹ کا دھواں پھونکتے ہوئے کھلے ہوئے پٹ سے سڑک کا نظارہ کرتا ہوں۔ اس وقت سڑک پر پانی ہی پانی نظر آ رہا ہے۔ فٹ پاتھ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ گھٹنوں برابر پانی میں کم عمر، نیم عریاں بچے عجیب و غریب کھیل رچا رہے ہیں۔ کوئی اپنے ساتھی پر چھینٹے اڑا رہا ہے تو کوئی اپنے دوست کے سر کو پانی میں ڈبکیاں دے رہا ہے، اور کوئی پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا ہے۔ ''یا اللہ پانی دے۔'' عین اسی لمحے میرے دل نے چاہا کہ مڑ کر دائیں طرف فرزانہ کے چھت کی طرف دیکھوں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے دل میں کسک سی جاگ اٹھی ہے۔ بارش کی یہ ننھی منی بوندیں بھی کتنی کٹھور تھیں۔ نہ جانے کون سی پتھر دل بوند اپنے ساتھ یادوں کا ہجوم لے کر آ گئی تھی اور میں اپنی کتابِ زندگی کے پارینہ اوراق کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پہلے بھی بارش ہوا کرتی تھی مگر میرا دل یوں بجھا بجھا نہیں رہتا تھا۔ بارش کا ہر قطرہ میرے اندرون میں خوشی اور سرمستی کے جذبے کو بیدار کرتا تھا۔ میرے ذہن میں پراگندگی کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ میں بید کی کرسی لے کر اسی چوکور ستون کے پاس بیٹھا تھا۔ برآمدے کے اگلے حصے کے اوپر چھجہ تھا مگر اس کے باوجود میں جھک کر فرزانہ کی چھت کے ایک حصے کو دیکھ سکتا تھا۔ بارش جب تیز ہو جاتی تو جھونکوں کی آواز سے فرزانہ اور اس کی بہنوں کی سریلی آوازیں بھی ہم آہنگ ہو کر ایک ملکوتی نغمے کو جنم دیتی تھیں۔ چھت پر بارش میں نہاتے نہاتے فرزانہ اپنے بھیگے ہوئے حسین مکھڑے کی ایک جھلک دکھانے کے لیے چھت سے جھانکتی اور اس لمحے اس کے لبوں کے خمیدہ کونوں پر مسکراہٹ کی طلائی جھالر جھل مل کرنے لگتی، اور میں سوچتا کہ

زندگی کس قدر خوب صورت ہے۔

میں نے ایک سگریٹ سلگائی ہے۔ نہ جانے ان دنوں مجھے کیا ہو گیا ہے سگریٹ میری قریبی دوست بن گئی ہے اور جس طرح روح جسم کے کسی گوشے میں رہتی ہے اسی طرح یہ بھی میرے ہونٹوں کے درمیان چپ چاپ دبی رہتی ہے اور میرے دل کی طرح خاموشی سے سلگتی رہتی ہے۔ مجھے اپنی حالت کا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ان دنوں میں سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا ہوں۔ پہلی بار سگریٹ نے اس وقت میرے ہونٹوں کو بوسہ دیا تھا جب فرزانہ نے اپنی شادی کی بابت مجھے خط لکھا تھا۔ اس صبح کو میں منحوس ہی سمجھوں گا۔ آنکھ ملتے ہوئے جب میں بیدار ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا ہوں۔ پہلے تو میری خوشی کی کوئی حد نہیں رہی جب میں نے فرزانہ کو چھت پر کھڑا دیکھا۔ مگر مجھے پتا نہ تھا کہ آنے والا لمحہ اپنے دامن میں صدیوں کی محرومیاں سمیٹ کر انہیں میرے حوالے کر دے گا۔ فرزانہ نے مجھے بجھی بجھی نظروں سے دیکھا اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ میرے صحن میں پھینک دیا۔ اس خط کو پڑھتے ہی میری آنکھوں میں دبیز تاریکیاں پھیل گئیں اور ان اندھیروں میں میرا اپنا وجود ایک شعلہ بن کر سلگنے لگا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کی شادی کی بات پکی ہو گئی ہے۔ اگرچہ خط مختصر تھا مگر اس اختصار میں آلام زندگی سے متعلق بے شمار کتابوں کے اوراق ملفوظ تھے اور اسی لمحے میرے قدم بھائی صاحب کے کمرے کی طرف اٹھ گئے، اور دوسرے ہی لمحے میں نے ان کے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر اس کے دھوئیں میں اپنے مستقبل کے بھیانک خواب کو متحرک ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ پہلا سگریٹ میں نے اسی دن سلگایا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کتنے سگریٹ میرے ہونٹوں کو چوم چکے تھے۔

دوسرے خط میں فرزانہ نے لکھا کہ وہ مرتے دم تک میرا ساتھ دے گی اور کبھی اس شادی پر راضی نہیں ہوگی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ ہم دونوں سول میرج کر لیں۔ کالج ان دنوں بند تھا مگر اس نے لکھا کہ وہ کسی نہ کسی بہانے مجھ سے ملے گی۔ میں اس قت تک سول میرج کے تمام انتظامات مکمل کر لوں۔ وہ جرأت مندی میں اپنی مثال آپ تھی۔ وہ میری خاطر ایک دنیا سے لڑ سکتی تھی۔ مگر میں نے اس کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ دونوں گھرانوں کا ہر فرد ایک دوسرے سے متنفر تھا اور میرا وجود تو جیسے ان کی آنکھوں کا سب سے بڑا کانٹا تھا۔ اگر ان کا بس چلتا تو یقیناً وہ مجھے قتل کر کے کہیں پھینک دیتے۔ حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ میری دلہن بن کر میرے گھر میں قدم رکھ سکتی۔ میرے گھر والے اسے تو کیا قبول کرتے، بلکہ مجھے بھی گھر سے نکالنے میں کسی تامل سے کام نہ لیتے۔ میں ہر چیز کو شرافت سے حاصل کرنے کا

قائل تھا اور شرافت سے فرزانہ مجھے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اس کو لکھ دیا کہ وہ مجھے بھول جائے اور گھر والے جہاں کہیں شادی کر لے۔ جواب میں اس نے مجھے بزدلی کا طعنہ دیا۔ میری محبت کو جھوٹ اور فریب کا نام دیا اور نہ جانے کیا کیا لکھا۔ میں خاموش ہی رہا اس کی اتنی جلی کٹی باتوں کا بس میرے پاس یہی ایک جواب تھا۔ اس واقعہ کے چند ماہ بعد اس کی شادی ہو گئی۔

فرزانہ کی شادی کے بعد تقدیر نے مجھے ایک نئے موڑ پر لا کھڑا کر دیا۔ اب میری زندگی میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ محبت کے جس تاج محل کی چھاؤں میں میرے جذبات مسکراتے تھے اب وہ ایک شمشان بن کر رہ گیا تھا۔ جینے کی خواہش فرزانہ کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ مگر سب کچھ چلے جانے کے باوجود میرے پاس ایک احساس باقی رہ گیا تھا، اور وہ یہ کہ فرزانہ میری ہے۔ نظروں سے پوشیدہ سہی مگر میرے وجود کا ناگزیر حصہ بن چکی ہے۔ اور تب مجھے محسوس ہوا کہ انسانی جسم کی کوئی اہمیت نہیں، کوئی حیثیت نہیں۔ روح ہی اصل شئے ہے۔ ایک ایسی شئے جو فنا پذیر نہیں۔ جس کو ابدیت حاصل ہے، اور شاید میں نے فرزانہ کی روح سے ہی محبت کی تھی۔

اور پھر اس نیم دیوانگی کی حالت میں مریم میری زندگی کے اُجڑے ہوئے ایوان میں سراپا خاموشی بن کر آ گئی۔ اس کو شاید خاموش رہنے کے فن میں یدطولیٰ حاصل تھا مگر اس کی یہ فطری عادت مجھے گراں نہیں گذری کیوں کہ اب میں بھی اس کا خوگر ہو چکا تھا۔ میں نے کبھی اس کو سکون سے ایک جگہ بیٹھے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتی تھی۔ اگر اتفاق سے دن بھر کے کام کی تکمیل قبل از وقت ہو جاتی تو بھی وہ آرام کرنے کے بجائے خاموشی سے گھر کے صاف ستھرے کمروں کو مزید شفاف کرنے کی کوشش کرتی یا پھر کسی کتاب کے مطالعے میں غرق ہو کر رہ جاتی۔ اس کو ایک مشین کہنا شاید زیادہ مناسب ہے۔ دوسری عورتوں کی طرح اس کو اپنے شوہر پر کڑی نگاہ رکھنے کی بری عادت نہیں تھی۔ بسا اوقات میں کسی فلم کا آخری شو دیکھ کر گھنٹہ دو گھنٹہ سنسان سڑکوں پر بے مقصد گھومتا ہوا گھر میں داخل ہوتا تو اس کو مسہری کے قریب ایک کرسی پر بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے پاتا۔ مجھ کو دیکھ کر وہ چپ چاپ اٹھتی اور کچھ دیر بعد گرم گرم خوش ذائقہ کھانے کی ڈشیں میز پر ہوتیں اور میں کھانے میں مصروف ہو جاتا۔ ایسے موقعوں پر بھی اس نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ ''آپ کہاں تھے اتنی دیر سے؟'' کس قدر اعلیٰ کردار کی حامل یہ لڑکی ہے۔

۲

میں یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھے اعلیٰ و ارفع کردار کی لڑکی سمجھتے ہیں۔ اس تعیقن کی

اساس ان کی وہ نظریں ہیں جو ہمہ وقت مجھے دیکھتی ہیں۔ وہ نگاہیں ان کے دل کے مثبت جذبے کی مظہر ہوتی ہیں جو یقیناً مجھے پا کر ان کے دل کی دھڑکن میں بس چکا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ چپ چاپ میری پوجا کیے جا رہے ہیں۔ یقیناً وہ لڑکی خوش نصیب ہے جس کو ان کی طرح کا جیون ساتھی مل گیا ہو۔ مگر کیا میں ان سے محبت کرنے لگی ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو میں کئی بار اپنے دل سے کر چکی ہوں مگر اس کٹھور دل نے میرے سال پر خاموشی سادھ لی ہے میں نے خود کو ذہنی خلجان کے حالات میں پھنسا ہوا پایا۔ میرے دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا ہے، اور میری آنکھیں خلا میں کسی ایسی شئے کو تلاش کرتی ہیں جو کہیں کھو گئی ہے۔ جس کو میں پا سکتی تھی، اپنا سکتی تھی مگر نہ جانے کیوں میں نے اس کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دیا۔ اس کے جانے کا پچھتاوا کبھی کبھی میرے اندرووں میں طوفان برپا کر دیتا ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ سارا کھیت تو چڑیا جگ ہی چکی ہیں۔ اور ویسے بھی گردشِ ایام نہ تو پیچھے کی طرف دوڑا ہے اور نہ کبھی دوڑ سکتا ہے۔

یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں مگر ذہن پر کون پہرے بٹھا سکتا ہے؟ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ کیا میں نے طاہر کو کھو کر غلطی کی؟ جواب میں وہی ازلی خاموشی۔ وہی صدیوں کا سناٹا۔ روح میں انتشار، ذہن میں دھواں، دل میں کسک..... اگرچہ مجھے واضح جواب نہیں ملتا مگر اس کے باوجود میں جان جاتی ہوں کہ جواب کیا ہو سکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ایک ہاتھ سے مجھے اپنا سینہ تھام لینا پڑتا ہے۔ چند لحظوں تک میں گم سم رہتی ہوں، اور پھر جھلاّ سی جاتی ہوں۔ اب میں اس کو کیوں یاد کرتی ہوں؟ یہ تو ایک ایسی ہستی سے بے وفائی ہے جو میری پرستش کیے جا رہا ہے۔ جس نے میری خاموشی اور کھوئے کھوئے رہنے پر بھی کسی شک یا گمان سے گریز کیا۔ مجھ پر کوئی تہمت نہیں لگائی، الزام عاید نہیں کیا۔ ورنہ آج کل کے مرد تو عورت کی ہر ادا کو شک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وفادار بیبیوں کو بھی وفادار نہیں سمجھتے۔

اب میں کیوں اس کو یاد کرتی ہوں؟ میں اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں تو جیسے دنیا کی ہر شئے چیخ اُٹھتی ہے۔ کسی گنبدِ بے در میں بازگشت کرتی ہوئی آواز میں مجھے میرے سوال کا جواب ملتا ہے۔ ''اس لیے کہ تمہیں طاہر سے محبت ہے۔'' جسموں کی جدائی محبت کے ناقلِ تنیسخ رشتے کو نہیں توڑ سکتی۔ اس کو تو ابد تک دوام حاصل ہے۔

طاہر مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی محبت دیوانگی کی تمام حدوں کو عبور کر چکی ہے۔ وہ پہروں اپنی چھت پر چنبیلی کے گملوں کے پاس بیٹھا میری چھت کی طرف دیکھتا رہتا تھا..... صرف اس امید پر کہ ایک بار صرف ایک لمحے کے لیے میرا دیدار ہو جائے۔ میں کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر کے ایک

چھوٹے سے درز سے اس کو دیکھتی تھی۔ انتظار کا دورانیہ جب کافی بڑھ جاتا تو وہ مایوس اور دل شکستہ نظر آنے لگتا اور مجھے اس کی حالت پر ترس آنے لگتا تو میں کھڑکی کے دونوں پٹ کھول کر اس کے سامنے آ جاتی۔ اس کا خزاں رسیدہ چہرہ یوں کھل اٹھتا جیسے اچانک ویرانے میں بہار آ گئی ہو۔ ہم دونوں تقریباً تین سال تک ایک دوسرے کی محبت میں دیوانے رہے مگر اس طویل عرصے میں ایک مرتبہ بھی اطمینان سے جی بھر کر باتیں کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال یونانی المیہ سے زیادہ المناک تھی۔ ہم دونوں کے گھر ایک دوسرے سے ملحق تھے۔ دونوں گھرانوں کے لوگ ذرا سی بلند آواز سن سکتے تھے، چونکہ دونوں گھروں کی چھتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں اور درمیان میں صرف پانچ فٹ کی ایک دیوار حائل تھی لہٰذا غیر متعلق افراد کی عدم موجودگی میں ہم دونوں مختصراً بات بھی کرتے تھے مگر آزادانہ اور روزانہ ملنا ممکن نہ تھا۔ اس کی اصل وجہ میرے گھر کے بزرگوں کی دقیانوسی سوچ تھی۔ بس ہماری باتیں خطوط کے ذریعہ ہی ہوتی تھیں۔ اور یہ بات بھی بعد ازاں میری امی کو معلوم ہو گئیں۔ وہ بڑی شقی القلب تھیں۔ کبھی انہوں نے ہمارے معصوم جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا ذہن اگلے وقتوں کے کہنہ دماغوں کی طرح سوچتا رہتا تھا۔ اس لیے ان کے نزدیک محبت کرنے والے کشتنی، سوختنی، گردن زنی تھے۔ انہوں نے کئی بار دل کھول کر مجھے جلی کٹی سنائیں۔ لعنت ملامت کی مگر میرے دل سے طاہر کی محبت کو نہ چھین سکیں۔ وہ میرے سامنے وقت بے وقت طاہر کی برائیاں کرتی رہتی تھیں تاکہ میں اس کو بھول جاؤں مگر وہ اپنی چال بازیوں میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

طاہر اپنے خطوط میں اپنا دل کھول کر رکھ دیتا تھا۔ جی کرتا کہ اس کے خطوط کے ہر لفظ کو بار بار پڑھتی رہوں۔ وہ مجھ ہی کو اپنی ساری کائنات سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔ جب وہ اپنی معصومانہ خواہشات کو لفظی پیرہن پہناتا تو میری آنکھیں بھیگ جاتیں۔

''مریم! میں چاہتا ہوں کہ تم میرے بچے کی ماں بنو۔''

''کاش وہ زمانہ دیکھ سکوں جب آفس سے گھر لوٹوں تو تمہیں اپنا منتظر پاؤں۔''

''جی کرتا ہے تمہیں دنیا والوں سے چھپا کر ایسی جگہ لے جاؤں جہاں بجز ہمارے تیسرا کوئی نہ ہو۔''

مگر اس کی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی۔ ساری تمنائیں گھٹ گھٹ کر دم توڑ گئیں۔ شادی سے چند روز پہلے ایک مرتبہ رات میں ڈھائی تین گھنٹے ہم دونوں ساتھ رہے باتوں کا سلسلہ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے گھر والوں کے سونے کے بعد میں اس سے مل سکی تھی۔ اس رات اس نے

مجھ سے کہا تھا۔

''آو مریم! ہم یہاں سے بھاگ جائیں اور کہیں جا کر شادی کر لیں۔''

''یہ میرے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔'' میں نے ذرا ترش روئی سے کہا۔ اس پر اس کا منھ اتر گیا۔

''مجھے معاف کر دو مریم۔ واقعی میں یہ بات بھول ہی گیا تھا۔''

اس ملاقات کے بعد میں کبھی اس سے نہیں مل سکی۔ اس کے خطوط کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اب میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ مجھے ایک ایسا شوہر ملا ہے جس پر میں بجا طور پر فخر کر سکتی ہوں۔ وہ بھی کتنے کم گو ہیں، ہمیشہ خیالوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیتے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ میں سوچتی ہوں انہوں نے اپنا سب کچھ مجھے دے دیا ہے مگر اس کے باوجود میں کیوں طاہر کے متعلق سوچتی ہوں؟ کیا مجھ سے ایک شرمناک غلطی سرزد نہیں ہوئی ہے؟ مجھے تو طاہر کی محبت کا ہر نشان مٹا دینا چاہیے تھا۔ اب میں کسی اور کی امانت ہوں۔

۳

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ مریم صوفے پر بیٹھی ایک رسالے کا مطالعہ کر رہی ہے۔ وہ دروازے کے پاس ہی ٹھہر گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے آتش دان پر رکھے ایک خوب صورت عورت کے مجسمے کو دیکھا اور پھر دوبارہ مریم کے چہرے کو دیکھنے لگا اور تب اس کو احساس ہوا کہ اس کی مریم حسن و جمال کا ایک لاجواب، پیکر ہے۔ وہ سنہری زلفوں والی ان کنواری دوشیزاؤں سے بھی زیادہ خوب صورت ہے جو فراعین کے زمانے میں اپنے نازک ہاتھوں میں عود و عنبر کے طلائی برتن لیے عظیم دیوتاؤں کے چرنوں میں چلی جاتی تھیں۔ وہ بہت دیر تک چپ چاپ مریم کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور ایرانی قالین کو کچلتے ہوئے اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

''مریم!'' دو شربتی آنکھیں اس کی جانب اٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ پیار سے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''مریم! آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' مریم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''مریم مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ تمہاری جو حالت ہے، میری اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔'' وہ ایک لمحے لیے رکا مریم کے جسم میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔

''میں نے بھی زندگی میں ایک زبردست ٹھوکر کھائی ہے۔'' وہ پھر بولا۔ ''مگر آؤ۔ آج ہم دونوں

ایک ناقابل شکست عہد کریں..... ایک وعدہ۔ تم اپنے پہلے پیار کی ناکامی کو بھول جاؤ اور میں اپنے پیار کی ناکامی کو حرف غلط کی طرح مٹا دوں گا۔ آؤ آج سے ہم یہی سمجھیں کہ ہماری زندگی میں کوئی داخل ہی نہیں ہوا تھا۔ تم میرا پہلا پیار ہو اور میں تمہارا۔ گذرے وقت کے زخموں کا یہی اندمال ہے۔'' وہ رک گیا۔ مریم نے اس کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چند آنسو تھے مگر چہرے پر نورانی کرنوں کا جال جگمگا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ آتش دان پر رکھی ہوئی عورت کے مجسمے کے لبوں پر مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

◀◀ ● ▶▶

85 ,APARTMENT NO.3905
THORNCLIFFE PARK DRIVE
EAST YORK
TORONTO , ONTARIO M4H 1L6
CANADA
CELL NO. 647 - 343 - 6887

● **نجمہ محمود**

لہر لہر سمندر

مناظر ہر لمحے بدل رہے تھے اور تیزی سے پیچھے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو!''

فضاؤں میں بہار کا حسن بکھر رہا تھا۔ رنگ بدلتا آسمان، سرمئی، نارنجی، کسی طرف سر بہ فلک پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برف کی سی پھوٹتی ہوئی روشنی۔ جا بجا ٹھہرا ہوا آئینہ جیسا پانی جس کے قریب کھجور کے درخت اور ان کا ان پانیوں پر پڑتا ہوا عکس۔ رام گنگا کی ڈوبتی ابھرتی لہریں اور پھر گھاس کا سمندر..... کھیت..... باغات.....

اس کا تجسّس فضاؤں میں جادو جگا رہا تھا۔ فطرت ہمیشہ اسے حیران اور مسرور کرتی تھی۔ وہ ڈوب رہی تھی ان مظاہرِ قدرت میں کہ ان کے ذریعہ وجودِ مطلق خود کو عیاں کرتا ہے۔ وہ ''بابرکت و مسرور کن کیفیت جس میں اسرار کا بوجھ، جو کہ اِس ناقابل فہم دنیا کا پیدا کردہ ہے، ہلکا ہوجاتا ہے۔ یہ وہ لمحے ہیں جب ہمارا جسم سوجا تا ہے اور ہم ایک زندہ روح ہوجاتے ہیں'' سبزہ زار جھاڑیاں مصری درخت سائی کیمر اور دور جھونپڑیاں.....

ٹرین مختلف مقامات پر گھڑی دو گھڑی قیام کرنے کے بعد پھر رواں ہوجاتی۔ وہ کھوئی ہوئی تھی۔ گردوپیش سے بے خبر اسے دھیان ہی نہ رہا کہ کمپارٹمنٹ سے ساری خواتین ایک ایک کر کے اتر چکی ہیں۔ یہ لیڈیز کمپارٹمنٹ تھا فقط ایک دیہاتی نوجوان جو شاید جلدی میں یہاں بیٹھ گیا ہوگا سامنے والی برتھ پر بیٹھا تھا دبلا پتلا جسم، ملگجی قمیص اور دھوتی۔ قطعاً بے نیازی سے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

ڈبّے میں اسے اچانک اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ رابعہ بیگم یہ تمہاری بے خیالی اکثر جس پر نکتہ چینی ہوئی ہے۔

''دیکھو بھئی اگلے اسٹیشن پر دوسرے ڈبّے میں بیٹھ جانا سمجھے۔'' وہ دیہاتی نوجوان اپنی اونگھ سے چونکا اور اس اچانک حملہ سے گھبرا سا گیا۔ پھر معاملہ کی نوعیت کو سمجھ کر بولا ''اچھا بہن جی۔'' انداز میں فرمانبرداری اور سادگی تھی۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی اور وہ فوراً اتر گیا۔ اپنی تنہائی کے خیال سے اس نے دونوں طرف کے دروازے بولٹ کیے اور اطمینان کا سانس لیا۔ گویا اس تنہائی میں وہ زیادہ محفوظ تھی۔ ٹرین کی رفتار تیز ہوگئی۔

اس کے ہاتھ میں کتاب تھی لیکن نگاہیں باہر کی دنیا پر مرکوز۔ وہ پھر کھوگئی۔ درختوں اور آسمانوں کا حسن جاگ رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا وہ اکیلی نہیں ہے ایک عالم اس کے ساتھ ہے۔ اسے لگا کہ اس کے اندر بھی ایک کائنات ہے۔ زندگی کتنی متضاد ہے جس میں لہروں جیسے زیر و بم ہیں۔ جس میں غم بھی ہیں اور خوشیاں بھی۔ اسے یاد آیا ایک دائمی غم جس کا تعلق سرحد سے تھا۔ سرحد جس نے خاندانوں کو تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک پیکر ابھرا۔ معصوم، پیاری سی بچی۔ اس کی انتہائی عزیز بھانجی جو رو رو کر یہاں سے گئی اور کبھی اس سرزمین کو بھول ہی نہ سکی۔ دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو۔

زمان و مکاں کی حدود کو پار کرتی ہوئی وہ جا پہنچی اپنے گھر کے صحن میں، اس کے در و دیوار، عزیز، رشتہ دار، سہیلیاں، سارے تخلیقی کھیل، آم کے باغات میں کوکنے والی کوئلوں کی صدا، اسے محسوس ہوا کوئی اسے پکار رہا ہے۔ کوئی نہیں۔ دور آسمانوں میں پرندوں کا جھنڈ محوِ پرواز۔ اس نے رشک سے پرندوں کو دیکھا۔ اونچی پرواز کی دیرینہ آرزومند۔ اس کے ذہن میں ایک پیکر اُبھرا..... پر بھاشرما۔ صفائے قلب

سے معمور، اک روشن چراغ، کاش صفائے قلب عام ہوجاتا۔ لیکن ہوتا ہی کیوں۔ نفرتیں، اجڑتے گھر، خون کی ندیاں۔ اوہ! اُس نے گھبرا کر گہری سانسیں لینی شروع کر دیں۔

کھڑکی سے باہر گھاس کا ہرا سمندر موجزن تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ اس سمندر کی ایک لہر ہو۔ اُسے سکون کا احساس ہوا۔ فطرت دوست ہے، ساتھی ہے۔ زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ آسمانوں کی صاف، شفاف، نیلگوں، اُلوہی وسعتوں میں اس کا پورا وجود کھو گیا۔

جو حسن کے متلاشی ہیں وہ روشنیوں کے طرف کیوں نہیں دیکھتے؟ اس ارض و سما پر کیوں نظر نہیں کرتے؟؟ ان سب کے پس پردہ جو برتر شعور ہے اس کی جستجو کیوں نہیں کرتے؟؟؟ ٹرین کسی مقام پر رکی۔ لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ایک لہر اٹھتی اور ڈوب کر دوسری ہزاروں لہروں سے جڑ جاتی۔ ایک سمندر تھا انسانوں کا، ایک جمِّ غفیر۔ لہروں نے سمندر کو جنم دے رکھا تھا۔ ''beauteous forms

اُن انسانوں کو بھی جن کے چہرے مطمئن تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور انہیں بھی جن کے ہاتھ میں زندگی نے بھیک کا پیالہ تھما دیا تھا۔ ہونٹ جن کے مسکراہٹ سے عاری تھے۔ جن کے لباس تار تار تھے۔ بال الجھے ہوئے تھے ایک دوسرے سے جُٹے ہوئے گرد آلود۔ اس کا ذہن الجھ گیا۔ آخر کیوں ہے ایسا؟ آخر کیوں؟؟

دروازے پر کسی نے زور سے کھٹکھٹایا۔ چلتی ٹرین میں کون ہوسکتا ہے۔ وہ گھبرا گئی۔ باہر کسی ''شریف نما'' کو دیکھ کر اس نے طے کیا کہ دروازہ نہیں کھولے گی۔

اس ''شریف نما'' نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ ''دروازہ کھولیے بھئی واہ اکیلی بیٹھی ہیں پورے ڈبے پر قبضہ کیے ہوئے۔''

اس ''ہونہار'' کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں۔ ''طالب علم'' تھا شاید۔ اسی وقت ایک دوسرے سَر نے جھانک کر تحکمانہ انداز میں دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔

''آپ ہوش میں ہیں کہ نہیں۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔ یہ لیڈیز کمپارٹمنٹ ہے۔'' ''ہمارے دیس کا مستقبل یقیناً روشن ہے۔ اس نے سوچا۔ دل لرز رہا تھا۔ پسینے چھوٹ رہے تھے۔

ٹرین رینگنے لگی۔ وہی دونوں کھڑکیوں کی سلاخیں پکڑے ہوئے دوبارہ دروازے تک پہنچ چکے تھے جس کی کھڑکی وہ بند ہی کرنے والی تھی۔ وہ دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے۔ ایک بولا۔

''دروازہ کھولو ورنہ۔'' دھمکی آمیز لہجہ۔

وہ ہمت کر کے کھڑکی بند کرنے بڑھی تو وہ ذرا پرے کھسک گیا۔ پھر بڑبڑایا۔ بند کرتے وقت وہ

انتہائی وزنی کھڑکی اس کی انگلی پر آرہی۔ درد کی شدت سے وہ کراہ اٹھی۔ انگلی کی پور آدھی کٹ کے لٹک رہی تھی۔ اور فرش پر خون۔ کٹی ہوئی پور کو جوڑنے کی کوشش کی اور رومال انگلی پر لپیٹ لیا۔ فرسٹ ایڈ کا فقط یہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا۔ پھر وہ مسکرا پڑی کہ آنسوؤں کے ساتھ مسکرا دینا اور ہنس پڑنا اس کی بچپن کی عادت تھی کہ زندگی کو گذارنے کے قابل بنانے کا شاید یہ سہل ترین طریقہ ہے۔ مطمئن سی ہو کر سیٹ پر آ بیٹھی۔ کھڑکی تو بند ہو چکی تھی۔ حبس، گھٹن۔ کتنے ہی آنسو پلکوں تک آئے اُسے کسی ہمدرد کی اشد ضرورت تھی جو اس کی مرہم پٹی کر دیتا، تسلّی کے دو لفظ کہہ دیتا۔ دنیا میں شاید یہی چیز سب سے اہم ہے اسے خیال آیا۔ درد بڑھ رہا تھا، لب متبسم تھے۔ اسے ان لمحوں میں اک روحانی طاقت کا احساس ہوا۔

اچانک اُس واحد، کھلی ہوئی کھڑکی سے ایک ''انسانی سر'' جھانکا۔ وہ سراسیمہ ہوگئی۔ یا اللہ کیسا منحوس دن ہے۔ سفر یوں کبھی نہ کٹا تھا۔ چلتی ٹرین میں، کھڑکی سے جھانکتا سر اُسی نوجوان کا تھا جسے اُس نے دوسرے ڈبّے میں بیٹھنے کو کہا تھا نہ جانے یہ کیا کہہ رہا ہے۔ سوالیہ نظروں سے اس نے اُدھر دیکھا۔ اس نوجوان کی ذرا تیز آواز آئی۔

''سنو تو سہی بہن جی میں کوئی بد ماس وَد ماس ناہیں ہوں بہن جی یو، لڑکے جِتّا دروجہ (دروازہ) کھلوائیں کھولنا نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں ہیں۔''

چہرے پر شرافت اور انسانیت کی جھلک تھی لہجہ میں ہمدردی اور احترام تھا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں نہیں تھیں۔ اس کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں تھی۔ ڈوبتے کو جیسے تنکے کا سہارا مل گیا ''یو کا بھوا (یہ کیا ہوا؟) زخمی انگلی کی طرف اشارہ کر کے اس نے استفسار کیا رومال پر خون کے واضح دھبّے تھے اسکی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ دیہاتی جیسے سب کچھ سمجھ گیا بولا۔

''تم نچنت رہو۔ ایک دم پھِکر نہ کرو۔ جرا نہ ڈرو ہم آہی پاس والے ڈبّے ماہیں۔ یو بد ماس جنو تمہرا کچھ بگاڑنا ہیں سکت ہیں۔'' اس کے چہرے پر غصّہ کے آثار تھے ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''سیتا رام۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ سیتا رام۔ تم واقعی انسان ہو۔ آج سے تم میرے بھائی ہو۔ بہت بڑے آدمی ہو تم۔'' یہ ہمت، یہ خلوص، یہ ہمدردی۔ ایسے انسان کہیں گم ہو چکے ہیں۔ یہ گمشدہ انسان ہے۔ اس کو شدت سے خیال آیا۔ اس نے شکر گذار نگاہوں سے اس دیہاتی کو دیکھا جس پر شک کر کے پہلے اس نے ڈبے سے نکال دیا تھا لیکن جس نے اس بات کا قطعاً برا نہ مانا اور اب یہ غیبی مدد۔ رحمت کا فرشتہ۔

''تم نچنت رہو ہم پاس کے ڈبہ ماہیں۔'' بے حد مشفقانہ، بہت بزرگانہ انداز سے اس نے کہا اور پھر وہاں سے ہٹ گیا۔

اسی وقت روضہ اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ چند لمحہ بعد اس نے باہر دیکھا، سیتا رام کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں ٹنکچر آیوڈین کی پھریری دوسرے میں آبخورے میں پانی۔ وہ حیرت بدنداں رہ گئی۔ اوہ! مسیحائی۔

''بہن جی لیو پانی۔ پہلے تنی (ذرا) انگلی دھوئے لیو پھر یو ٹنچر لگائے لیو۔''

آبخورہ اور پھریری لے کر اس نے انگلی پر سے رومال ہٹایا۔ اور حیران رہ گئی۔ انگلی کی پور جڑ چکی تھی زخم پانی سے دھو کر اس نے دوا لگائی۔

اُسی لمحہ ٹرین سرکنے لگی۔ ''نمستے بہن جی۔'' دونوں ہاتھ جوڑ کر، بہت احترام سے اُس نے کہا۔ انتہائی شکر گذار نظروں سے اس نے اپنے محسن کو دیکھا۔ شکریہ ادا کرنے کو اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔

فطرت حسین ہے اور انسان اس کا ایک جزو۔ ایک مظہر۔ راستے بھر اُسے اس بہادر، شریف، نیک اور مخلص انسان کا خیال آتا رہا جو اس کا محافظ اور ہمدرد ثابت ہوا۔ جس کے کپڑے ملگجے اور بوسیدہ سے تھے جسکے ہاتھوں میں کتابیں نہیں تھیں لیکن دل صاف تھا۔ روح زندہ تھی!

☆

سیالدہ ایکسپریس بڑی تیزی سے رواں تھی اُسے اسکے وطن پہنچانے کے لیے جس سے وہ پانچ ماہ قبل اپنی سروس کے سلسلے میں جدا ہوئی تھی، گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی۔ کتاب پر سے ہٹ کر اس کی نظریں انسانوں کے ہجوم میں الجھ گئیں۔ اچانک ایک کھیرے والا سامنے سے گذرا اس کی طرف دیکھ کر ذرا رکا۔ اس کے جسم پر صاف کپڑے تھے..... قمیض پاجامہ۔ وہ آوازیں نہیں لگا رہا تھا، ہاتھ میں ڈلیا تھی جس میں چھلے ہوئے کھیرے رکھے تھے۔ اس کو لگا کہ اس شخص کو اُس نے کہیں دیکھا ہے۔ ضرور دیکھا ہے لیکن کہاں۔ اسے الجھن ہوئی۔ وہ کھیرے والا اسے جانی پہچانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے دیکھتا ہوا وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ اوہ! یہ تو سیتا رام ہے۔ پچھلے سفر کا پورا منظر اس کے سامنے ابھرا۔ اس نے آواز دی۔

''سیتا رام۔'' وہ تیزی سے مڑا اور کھڑکی کے پاس آ گیا۔ ''نمستے بہن جی۔'' اس کے چہرے پر خوشی تھی..... پہچان لیے جانے کی کہ پہچان ہی سب کچھ ہے..... نگاہوں میں شکایت۔ ذرا دیر سے پہچاننے جانے کی۔ وہ جلدی بولی کیونکہ ٹرین رینگنے لگی تھی۔

''تم وہی ہو نا پچھلے بار جو۔ ٹنکچر..... پانی..... تم.....'' خوشی سے اس کا عجیب حال تھا۔ کونسا اسٹیشن تھا وہ؟''

''یہی والا۔ یہ روجہ ہے۔ ہاں ہاں بہن جی۔ ٹھیک ہو۔؟'' وہ قریبی عزیز کی طرح خیریت پوچھ رہا تھا۔ خوشی اور عقیدت سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

وہ پرس کھول کر اس میں کچھ ٹٹولنے لگی۔ سیتارام سمجھ گیا۔ ''نہیں بہن جی بس اتنا ہی کا پھی ہے۔ بس بس اتنا ہی کا پھی ہے۔'' پہچان لیے جانے سے وہ ممنون معلوم ہو رہا تھا۔ ''نمستے بہن جی۔'' اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ وہ سرکتی ٹرین کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا گویا اُسے چھوڑنے آیا ہو۔

''نمستے میرے بھائی۔'' اس کا دل بے نام سی مسّرت سے لبریز تھا۔ گمشدہ انسان۔ اس نے سوچا۔ فطرت میں کتنے اسرار پوشیدہ ہیں، کیسی گہرائیاں ہیں پانی کی لہروں کے نیچے۔ زمین پر بسنے والے انسانوں میں جن کے مختلف رنگ روپ ہیں۔ لہریں ابھرتی ہیں، ڈوبتی ہیں۔ اور سمندر کا حصّہ بن جاتی ہیں۔ انسان جنم لیتے ہیں مرتے ہیں لیکن زندگی چلتی رہتی ہے۔ رواں رہتی ہے۔ آج اسے فطرت کے مکمل حُسن کا ادراک ہوا تھا۔

اس کے سامنے تھیں دریا کی لہریں۔ سامنے رنگ بدلتا آسماں، زمین پر سبزے کا جادو۔ اور تصور میں ایک انسان کا پیکر اور کانوں میں گونجتے ہوئے الفاظ۔

''بس اتنا ہی کا پھی ہے بہن جی۔ بس بس اتنا ہی کا پھی ہے''۔ اور کھڑکی کے اس پار کھجور کے درختوں کا بکھرتے پانیوں پر پڑتا ہوا عکس جادو جگا رہا تھا۔

اسے محسوس ہوا جیسے وہ ایک لہر ہے اور سمندری کائنات کا ایک حصّہ ہے۔ لہر لہر سمندر!

◀◀ ● ▶▶

F 5, Azim Residency, Near Madni Masjid
New Sir Syed Nagar Aligarh 202002
Mob no. 09837214069

● **محمد الیاس گوندل**

چڑیاں

گھر سے چند فرلانگ کی دوری پر سڑک کے کنارے وہ ایک بڑی سی زیرِ تعمیر عمارت تھی۔ شہری آبادی سے ایک مناسب فاصلے پر۔ یہ شاپنگ پلازہ بنانے والے مالک کا خیال تھا کہ لوگ اب گنجان آباد علاقوں میں ضروریاتِ زندگی کی خریداری کے لیے جانے سے کتراتے ہیں۔ لہذا یہ علاقہ اس قسم کے

خریداری مرکز کے لیے انتہائی مناسب رہے گا۔ وہ شروع دن سے ہی اس عمارت کے بنانے والے مزدور عملہ میں شامل ہو گیا تھا۔ اپنی کم گو طبیعت اور کام میں ایمانداری کی وجہ سے وہ مالک اور ٹھیکیدار کی نظروں میں اپنا وقار قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ پہلے اسے کام کے سلسلے میں گھر سے دور جانا پڑتا تھا۔ اب اسے کچھ دیر کے لیے ہی سہی، بہت سہولت تھی۔ وہ وقت سے کام پر پہنچ جایا کرتا تھا۔ اگر کبھی ٹھیکیدار ہنگامی حالات میں اضافی وقت میں اس سے کام کروانا چاہتا تو بخوشی دوبارہ گھر سے آ کر بھی کام پر لگ جایا کرتا۔

شام کے ملگجے اندھیرے پھیل رہے تھے۔ وہ تیسری منزل پر کام میں جُتا ہوا، سر پر عمارتی سامان اٹھائے سنبھل سنبھل کر تاریکی میں ڈوبی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اچانک پاؤں پھسلا اور وہ ہوا میں قلابازیاں کھاتا نیچے گرتا چلا گیا۔ زمین کے ساتھ ٹکرانے کے بعد اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا اور آنکھوں کے آگے سیاہی پھیلتی چلی گئی۔ اس حالت میں کتنے پل بیتے، کچھ خبر نہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ جیسے اس کا ذہن تاریکی سے روشنی کی طرف لوٹنا شروع ہو گیا۔ دُور سے لوگوں کے شور اور رونے کی ملی جُلی آوازیں آ رہی تھیں جو بتدریج اسے اپنے قریب ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اور پھر دھیرے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور ایک فاصلے پر کچھ جانے پہچانے، کچھ انجان چہرے ایک ہجوم کی شکل میں نظر آ رہے تھے۔ حیرانی سے وہ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوا اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا مختصر سے ہجوم کی طرف بڑھ گیا۔ ہجوم کے اندر جھانکا تو ایک عجیب منظر اس کی نگاہوں کا منتظر تھا۔ یہ اس کے اپنے بیوی بچے تھے جن کی کُرلاٹ سے ایک کہرام بپا تھا۔ زمین پر ایک لاش چادر سے ڈھکی پڑی تھی۔ آہ و بکا کے شور میں لوگوں کی ملی جُلی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ روایتی اور کئی بار کے سُنے ہوئے جملے تھے جو اکثر اموات پر سُننے کو ملتے ہیں۔

ابھی وہ اس عالمِ حیرت میں کھڑا تھا کہ ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے کے ساتھ زمین پر پڑی ہوئی لاش کے منہ پر سے چادر سرک گئی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اس کی اپنی لاش تھی۔

زندہ ہوتا تو بیوی اور بچوں کو یوں روتا بلکتا دیکھ کر اس کا کلیجہ کٹ جاتا۔ روتے ہوئے لوگوں اور خاص طور پر بچوں کو دیکھ کر وہ بہت بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ کئی بار بیوی کے ساتھ صرف اتنی سی بات پر جھگڑا ہو جایا کرتا کہ بچہ رو کیوں رہا ہے؟ اب ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو ہر قسم کے احساسات سے جیسے یکسر خالی ہو چُکا تھا۔ اس عجیب کیفیت کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اسے محسوس ہوا کہ وہ بھی محض ایک تماشائی ہے اور یہ بستی اس کے لیے بالکل اجنبی جگہ ہے۔ ایک شعوری کوشش کے تحت اس نے اپنی بیوی کو دلاسا دینے کے لیے کہا کہ چُپ ہو جاؤ، قسمت کو یہی منظور تھا۔ بچوں کو سنبھالو اور ان کو گھر لے جاؤ۔ لیکن

وہ حیران ہوا کہ لوگ اس کی آواز سُن پار ہے تھے اور نا ہی اسے اپنے پاس محسوس کر رہے تھے۔

زمین تا آسمان تنا ہوا ایک غیر مرئی شفاف پردہ دُنیا اور اس کے درمیان حائل تھا۔ اس ان دیکھی رکاوٹ کے پار وہ لوگوں کو دیکھ اور سُن پار ہا تھا لیکن کسی کو پکار یا چُھو نہیں پار ہا تھا۔ پھر دن چڑھ آیا اور اب اس نے خود کو آبادی کے خارجی راستے پر کھڑا ہوا پایا۔ محلے کا ایک خاندان گروہ کی شکل میں گلی سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس خاندان کا جواں سال بیٹا ان دیکھے آسمانوں کی تلاش میں گھر سے رخصت ہو رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کے چہروں سے درست اندازہ نہیں کر پار ہا تھا کہ وہ اس عارضی کامیابی سے خوش ہیں یا متوقع نقصان پر غمگین ہیں۔ وہ لڑکے کے باپ سے کہنا چاہتا تھا کہ جس دست و بازو کی تمنا کر کے حاصل کیا اسے کاٹ کر خود سے الگ کیوں کر رہا ہے؟ لیکن کہہ نا پایا۔ وہ اس لڑکے کو روکنا چاہتا تھا کہ اپنے آسمان بھی بہت وسیع ہیں، لیکن اسے روک نا پایا۔

ایک طویل اور تھکا دینے والے دن کی مسافت کے بعد اب سورج مغرب میں ہانپ رہا تھا۔ شام ہوئی اور پھر رات کا اندھیرا پھیل گیا۔ آبادی میں داخل ہونے والی بڑی گلی کی اختتامی نکڑ پر ایک ننھا سا بجلی کا بلب رات کے اندھیرے کو دُور کرنے کی سعی میں مگن تھا۔ وہ اسی ننھے سے بلب کی جانب چل پڑا۔ اس جگہ سے ایک راستہ آگے کو نکلتا تھا اور دائیں بائیں بھی دو گلیاں مُڑتی تھیں، جس کی وجہ سے یہ ایک چھوٹا سا چوراہا بن گیا تھا۔ چوراہے کے بیچوں بیچ ایک دُکان تھی جس کے باہر لکڑی سے بنا ایک پھٹہ پڑا رہتا تھا۔ جاڑا ہو یا گرمی، مینھ ہو یا آندھی، یہ پھٹہ ہمیشہ یہیں رہتا تھا جس پر دن کے وقت دُکاندار سبزیاں اور پھل رکھا کرتا۔ شام کو بچی کھچی سبزیاں اور گلے سڑے پھل دُکان کے اندر رکھ کر اور تالا لگا کر گھر چلا جاتا۔ اس کے بعد صبح تک پھٹہ مختلف قبیل کے لوگوں کے استعمال میں رہتا تھا۔ کبھی کوئی نشئی اس پر براجمان ہوتا تو کبھی محلے کے چند منچلے جو گھر سے آوارہ گردی کے شوق میں نکلتے اس پر ڈیرے ڈال دیتے۔ کبھی چوکیدار ذرا دیر سستانے کے لیے اور رات کٹنے کے انتظار میں اس کا سہارا لیتا۔ سردیوں کی طویل راتوں میں یہ پھٹہ اکثر سُنسان رہتا۔ دور سے آج بھی یہ جگہ خالی لگ رہی تھی۔ وہ قریب پہنچا تو ایک دس گیارہ سال کا بچہ گھٹنوں میں سر دیئے پھٹے کے ایک کونے پر ڈبکا ہوا تھا۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ دائیں ہاتھ والی گلی سے نُور اظاہر ہوا۔ نُور ا بچے کو دیکھ کر ٹھٹھکا اور اس سے پوچھا۔

''کاکا کون ہو تم؟''

''فلاں کا بیٹا ہوں۔''

''یہاں اس وقت کیا کر رہے ہو؟''

''دو دن ہوئے ماں نے گھر سے نکال دیا ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ کہتی ہے میں کام پر جایا کروں۔ ایک دن چھوڑ آئی تھی، استاد مارتا بھی ہے اور گالیاں بھی دیتا ہے۔ میں گھر آیا، ماں کو بتایا اور اسے بول دیا کہ اب کام پر نہیں جاؤں گا۔ اس نے کہا گھر سے نکل جا، باپ تو تیرا مر گیا، اب کمائے گا نہیں تو تم ساتوں کو کھلاؤں گی کہاں سے؟''

''دوبارہ گھر نہیں گئے؟''

''گیا تھا، ماں نے دروازہ نہیں کھولا۔''

''کل رات کہاں سوئے تھے؟''

''یہیں گلیوں میں گھومتا رہا اور پھر اس پھٹے پر۔''

''کھانا کھایا؟''

''نہیں۔''

''چلو آؤ! میرے ساتھ ڈیرے پر سو جانا، کھانا بھی ملے گا۔''

وہ نورے کو جانتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ بچہ اس کے ساتھ چلا جائے۔ نورے نے دوسری بار بچے کو پچکارا تو وہ نورے اور بچے کے درمیان حائل ہو گیا۔ بچہ اٹھا اور نورے کے پیچھے چل دیا۔ دونوں اس کے غیر مرئی جسم کے اندر سے گُزر گئے اور وہ پیچھے سے انہیں بس دور ہوتا دیکھتا رہ گیا۔

دنوں وہ یونہی بے مقصد کئی جانی پہچانی اور کئی انجانی جگہوں پر گھومتا رہا۔ زماں و مکاں جیسے اس کی سوچ کے تابع ہو چکے تھے۔ اِدھر کسی جگہ کا خیال کیا، اُدھر اس جگہ وارد ہوا..... وہ کچھ تلاش کر رہا تھا شاید، مگر اسے خود سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا ڈھونڈھ رہا ہے۔

شب و روز کے گزرنے کا ایک ہلکا سا احساس تھا بس..... اور ایک دن وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔ بیوی کے چہرے پر نظر پڑی تو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اس تلخ حقیقت کو ضبط نہیں کر پا رہی لیکن بچوں کی خاطر بہادر بنی ہوئی ہے۔

دونوں لڑکے اپنے پرانے ٹوٹے ہوئے کھلونوں میں مشغول تھے۔ اچانک اسے ایک خیال آیا اور اسے لگا جیسے یہ خیال آنے کے ساتھ ہی اس کی تلاش ختم ہو گئی ہے۔ میری بچی..... وہی پیاری بچی جو اس نے بڑی منتوں اور مرادوں کے ساتھ اللہ سے مانگ کر لی تھی۔

جب بھی وہ بچی کی آرزو کیا کرتا تو ماں کہتی تھی.

’’پتر کُرڑیوں کے بوجھ سے ڈر آتا ہے۔‘‘

’’کیوں بے بے کُرڑیاں کیا راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر کھاتی ہیں؟‘‘

’’نہیں پتر رزق دینے والی اللہ کی ذات ہے، ان کے کرموں سے خوف آتا ہے، زمانہ بڑا ڈھاڈا ہے۔‘‘

وہ ماں سے کہتا کہ میں ہوں نا بے بے۔ اپنی بچی کو اس قابل کروں گا کہ کوئی اسے بوجھ نہیں سمجھے گا۔

ماں کہتی تھی پتر چِڑیاں نہیں دیکھیں؟ آشیانے سے باہر نکلتی ہیں تو آسمانوں میں سبھی پرندے ان سے زورآور ہوتے ہیں۔

وہ جواباً کہتا۔ ’’بے بے تیری بات ٹھیک ہے لیکن چڑیاں اس کی رحمت ہیں جو سب زورآوروں سے زورآور ہے۔‘‘

پھر اس کی طلب یقین میں بدل گئی اور ایک چڑیا اس کے آنگن میں چہچہانے لگی۔

وہ انتھک محنت کرتا، اپنے خواب پورے کرنے کے لیے کبھی دن یا رات کا لحاظ نہیں رکھا۔ جس دن وہ مرا تھا اس دن بھی ٹھیکیدار کے کہنے پر اضافی وقت میں کام پر لگ گیا کہ چلو چار پیسے ہاتھ آجائیں گے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ پیسے ہاتھ آنے کی بجائے وہ خود ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ خوابوں کی تعبیر لانے کے لیے ایک اور چھوٹا سا سفر اس کا آخری سفر ثابت ہوگا۔

وہ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا۔ کام سے گھر لوٹتا تو وہ ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے باپ کے بڑے بڑے جوتے اٹھا کر اس کے پاؤں کے پاس رکھتی۔ رات کو اس کے سینے پر چڑھ کر سوتی۔ اس وقت وہ دنیا کے سبھی غم بھول جایا کرتا اور دن بھر کی تھکاوٹ لمحوں کے اندر راحت میں بدل جاتی۔ ابھی صرف ساڑھے تین سال کی تھی۔

خُدایا! یہ کیا ہوگیا؟

بیتے ہوئے پل ایک کوندے کی طرح اس کے ذہن کے پردے پر ابھرے اور پھر ڈھندلانے لگے۔

اب وہ اپنی بچی کی تلاش میں نکلا۔ چھوٹے سے گھر کے اندر جگہیں ہی کتنی تھیں، پھر بھی ہر وہ جگہ جہاں پر اس کے موجود ہونے کا امکان تھا، دیکھ ڈالی۔ وہ اپنے دھیان میں منہمک اچانک اسی عمارت کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

بچی اسی جگہ کھڑی تھی جہاں پر وہ گرا تھا۔ سپاٹ چہرہ لیے، دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیاں اپنے سینے

پر رکھے، نرم مٹی میں بنے اس چھوٹے سے گڑھے کو دیکھے جا رہی تھی جو اس کے باپ کے گرنے کی وجہ سے کچی زمین میں بنا تھا۔ ایک اضطراری اور فوری ردِ عمل کے تحت اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا، بچی کے سر پر رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ بچی نے مُڑ کر دیکھا اور اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئی۔

ایک مدہم سی آواز اس کے کان کے پردے کے ساتھ ٹکرائی ’’اٹھو بابا! کیا ہوا؟‘‘ آنکھ کُھلی تو اس کا چہرہ اور تکیہ آنسوؤں سے تر تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Quality Crafts & Co.
Hamza Street, Rawail
Pura Road Fateh Garh Agency
Sialkot- 51310Ph: +92-345-6768804

نام رسالہ: زبان و ادب مدیر: مشتاق احمد نوریؔ صفحات : ۸۰ قیمت : ۱۵؍روپے ملنے کا پتہ : بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ		نام اخبار: گوشوارہ مدیر: مسیح الزماں امروہوی صفحات : ۱۲ زرِ سالانہ: ۱۰۰؍روپے مقام اشاعت : روڑکی اتراکھنڈ
نام اخبار: ہفت روزہ مسلم دنیا مدیر :زین شمسی صفحات : ۲۴ قیمت : ۱۰؍روپے مقام اشاعت : نئی دہلی		نام: خبر مشن ادبی ڈائری ۲۰۱۸ء پیشکش :اشتیاق سعید صفحات : ۲۱۶ قیمت : درج نہیں مقام اشاعت: ممبئی

● **احمد عرفان**

آشرواد

شادی کے بعد سجاتا نوکری کرنے لگی تھی۔گھر میں شوہر اور بچے کے علاوہ اس کے سسر رہتے تھے جنہیں وہ پتاجی کہا کرتی تھی اور اُن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔سجاتا گھر کے سارے کاموں کو نپٹا کر بیٹے کو اسکول چھوڑتے ہوئے آفس جایا کرتی تھی۔اکثر ایسا ہوتا کہ عین گھر سے نکلتے وقت پتا کی آواز سنائی دے جاتی۔

''بہو! ذرا میرا چشمہ تو صاف کر دو'' اور سجاتا جھلاّتی ہوئی سولو پینٹ لے کر چشمہ صاف کرنے لگتی۔اس چکر میں اکثر اسے آفس پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی۔شوہر کی صلاح پر اب وہ صبح اُٹھتے ہی پتاجی کا چشمہ صاف کر کے ٹیبل پر رکھ دیا کرتی۔لیکن پھر بھی گھر سے نکلتے وقت پتاجی کا بہو کو بلانا بند نہیں ہوا۔

گھر کا سارا کام کرنا، بچے کو اسکول کے لیے تیار کرنا اور اسے اسکول پہنچا کر آفس جانا.....وقت کی اس کھینچا تانی میں سجاتا نے پتاجی کی پکار کو اب نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔

آج سجاتا کو چھٹّی تھی۔وہ گھر کی صفائی کر رہی تھی۔اچانک اُسے پتاجی کی ڈائری ملی۔اس نے یونہی ورق گردانی شروع کی۔ایک صفحہ پر لکھا تھا۔

تاریخ.....۲۳ر فروری ۲۰۱۵ء

''آج کی اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں گھر سے نکلتے وقت بچے اکثر بڑوں کا آشیرواد لینا بھول جاتے ہیں۔بس اسی لیے، بہو جب تم چشمہ صاف کر کے مجھے دینے کے لیے جھکتی ہو، میں من ہی من میں اپنا ہاتھ تمہارے سر پر رکھ دیتا ہوں۔میرا آشیرواد ہمیشہ تمہارے ساتھ ہے بیٹا!''

آج پتاجی کو گزرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں لیکن اب بھی ہر روز آفس سے نکلتے وقت سجاتا پتا جی کا چشمہ صاف کر کے ان کے ٹیبل پر رکھ دیتی ہے اور ان کے ان دیکھے ہاتھ سے مِلے آشیرواد کی اُمید میں سر جھکائے چند منٹ تک کھڑی رہتی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

Topkhana Bazar Munger-811201
Mob: 9472211255

● مائکرو فکشن

● ناہید طاہر

محبت

شادی کی پہلی رات سلطان گھونگھٹ اٹھا کر اپنی محبت کا یقین دلاتا ہوا زمین و آسمان ایک کرنے لگا۔

''تم میری متاعِ جاں ہو.....''

''میری زندگی کی ہر خوشی تم سے جڑی ہے.....''

''میری سانسیں تم سے وابستہ ہیں۔''

''تم میرے قصرِ دل کی وہ دھڑکن ہو جسکے بنا میرا وجود ادھورا ہے۔''

''محبت پاگل پن کا دوسرا نام ہے؟؟؟''

وہ گھٹنوں پر سر رکھے سوچتی ہوئی سسک اٹھتی۔

رات آتی تو محبت کی شمع بیدردی سے جلائی جاتی اور بڑی بے رحمی کے ساتھ شمع کو پگھلا کر خاکستر کیا جاتا.....اس کا وجود ٹوٹ کر موم کے سلگتے قطروں کی شکل اختیار کر جاتا جو صبح تک دھیرے دھیرے سسک کر فنا ہونے پر مجبور، ایک بے جان شکل اختیار کرتے ہوئے زمین پر ڈھہ جاتے۔آفتاب کی کرنیں زمین کو بوسہ دیتی ہوئی اسکے وجود کو جھنجھوڑنے لگتیں تو وہ خود کو کئی دنوں کی بیمار محسوس کرنے لگتی، لڑکھڑاتی ہوئی کمرے کے باہر چلی آتی تو دوسرے افرادِ خانہ پیٹ کی بھوک سے نڈھال نظر آتے اور ان کی نظریں سوال کر رہی ہوتیں کہ بہو ہمارے پیٹ کی آگ بھی بجھا دو.....!!!وہ بیمار قدموں سے رسوئی کی جانب بڑھ جاتی اور مشینی انداز میں سارے کنبے کا کھانا تیار کرنے لگتی.....!

متاعِ جاں صرف بھوک مٹانے کی مشین بنکر رہ گئی.....!!!

قصرِ دل کی دھڑکن اب شاید وجود کی تکمیل کے لیے ضروری نہیں تھی۔

زیست لڑکھڑاتے قدموں سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔اتنے سے شاید کام نہیں چل سکتا تھا سو''یہ دل مانگے مور'' سلطان کی مردانگی نے ''محبت'' کو ہوس، شک، بیدردی کے زنگ آلود خنجر سے ذبح کر ڈالا۔

مریم کے قصرِ محبت کو طلاق کے سیاہ رنگ سے رنگ دیا.....!!!اسکے کردار کو نوچ کر تنکوں کی مانند بکھیر دیا۔

مریم آنسوؤں کے سمندر تلے ساحل کو چھونے کی کشمکش میں گھنٹوں سوچتی رہی۔

''کیا یہی محبت ہے؟؟؟''

مریم کے آنسوؤں کا اثر تھا، سلطان کی تنہائی طائرِ بسمل کی طرح تڑپ اٹھی اسکا دل مریم کی محبت کا انکشاف کرتا ہوا خون کے آنسو رونے لگا تو وہ اپنے کاندھوں پر کربِ نارسائی اٹھائے دوڑتا ہوا مفتیوں اور عالموں کے چکر کاٹنے لگا۔

مفتی صاحب نے دوسرا نکاح حلالہ کا مشورہ دیا اور گاؤں کے ایک سیدھے سادھے لڑکے کو تھوڑی رقم دے کر مریم سے بیاہ کے لیے راضی کرلیا۔

بیاہ کے تیسرے دن ہی سلطان دروازے پر دستک دیتا ہوا فرحان کو آواز دینے لگا۔فرحان دروازے کی خوبصورت چلمن ہٹاتا ہوا باہر چلا آیا۔بال بکھرے ہوئے تھے۔لباس بھی بے ترتیب سا لگ رہا تھا۔لیکن چہرے پر محبت کی درخشاں روشنی ہالہ کیے ہوئے تھی۔

''بھائی میرے۔اپنا وعدہ پورا کردے۔میری سانسیں مجھے لوٹا دے۔''

''سانسیں.....!!!!''فرحان تمسخر سے ہنسا۔

دوسرے ہی پل چلمن میں سرسراہٹ سی ہوئی اور چوڑیاں کھنکاتے ہوئے ایک خوبصورت ہاتھ نے فرحان کا بازو تھام کر اندر کی جانب کھینچ لیا.....!!!

''محبت شاید اسی کو کہتے ہیں۔''

◀◀ ● ▶▶

C/O ,ABU TAHIR MUJAHID
Project Manager
Saudi ceramic co
Street No: 170,second industrial city,Alkharj Road.
P.O Box : 63629, Riyadh 11526 KSA.

● **انتخاب**
● **اقبال حسن آزاد**

بندوبست

چشم زدن میں اس نے اپنا بوسیدہ جمپر اتارا اور اپنی دونوں ٹانگوں کو پھیلا کر جمپر کو ران کے بیچوں بیچ رکھ کر یوں رگڑا جیسے کچھ پونچھ رہی ہو۔پھر اس نے جمپر کو الگنی پر ٹانگ دیا اور پیڑ کی طرح سیدھی کھڑی ہوگئی۔وہ مادر زاد برہنہ تھی۔آنگن میں بلب روشن تھا جس کی روشنی میں اس کا آنبوسی بدن چمک رہا تھا۔شوکت کی نگاہیں اس کے ننگے بدن پر الجھ کر رہ گئیں۔اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔اس کا پائجامہ کہاں گیا؟ فلیٹ میں اس وقت اور کون ہے؟ گلبدن کہاں گئی؟ جمال کہاں ہے؟ طرح طرح کے سوالات شوکت کے ذہن میں ڈنک مارنے لگے۔پھر اسے خیال آیا۔۔۔۔۔۔اس کے پستان اتنے بھاری کیونکر ہوگئے؟ کیا اس میں دودھ بھر گیا ہے؟ اور اس کا پیٹ آگے کو نکلتا ہوا کیوں دکھائی دے رہا ہے؟ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ کل تک تو چڈی پہن کر سڑک پر دوڑتی پھرتی تھی۔دکان سے سودا سلف لاتی رہتی تھی یا اپنے فلیٹ کے دروازے پر بیٹھ کر اپنی کالی سوکھی ٹانگوں کو بار بار کھجلاتی جاتی اور اپنے میلے الجھے بالوں میں جوئیں تلاش کرتی پھرتی تھی۔

شوکت کی نگاہیں اس کے چمچماتے سیاہ بدن پر پڑیں جس سے پسینہ پھوٹا پڑ رہا تھا۔اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ وہ اسے نہیں دیکھ پائے گی کیونکہ وہ اجالے میں تھی اور یہ اندھیرے میں۔وہ نیچے تھی یہ اوپر تھا۔اس کی نگاہیں اپنے جسم کو نہار رہی تھیں اور اِس کی نگاہیں اُس کے جسم کو۔

وہ ہینڈ پمپ سے پانی بھر رہی تھی۔کیا وہ اس وقت نہائے گی؟ رات کے نو بجے اسے غسل کی حاجت کیوں ہوئی؟ کیا اسے بہت زیادہ گرمی لگ رہی ہے؟ یا کوئی اور بات ہے؟ کیا اس وقت فلیٹ میں گلبدن کا شوہر جمال موجود ہے؟ اس نے پھر سوچا۔گلبدن کہاں ہے؟ کہیں گھومنے گئی ہے؟ پکچر یا کہیں اور ؟ کیا گلبدن کو یہ سب دکھائی نہیں دیتا؟ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوئی لڑکی کو شوہر کے ساتھ گھر میں اکیلا چھوڑ کر اکثر غائب رہتی ہے۔نوکری کرتی ہے، گھر کا خرچ چلاتی ہے اور جمال پڑا پڑا عیش کرتا ہے۔شادی کو دس سال ہو چکے تھے مگر گلبدن کی گود اب تک سونی تھی۔اس نے اپنے پیسوں سے ایک جنرل اسٹور کھولا تھا مگر جمال اپنی آرام طلبی کے باعث اسے چلا نہیں پایا۔گلبدن کی نظر میں اس کی قیمت دو کوڑی بھر بھی نہیں تھی۔اکثر وہ جمال کو زور زور سے ڈانٹتی۔شوکت اپنے برآمدے کی کھڑکی سے اس کے آنگن میں جھانکا کرتا۔اس کھڑکی پر ایک دبیز پردہ پڑا تھا مگر جب کبھی ہوا بند ہوجاتی یا مخالف سمت میں چلنے لگتی تو اس پردے کو

کنارے کر دیا جاتا۔ جب تک اس کی بیوی زہرہ جبیں گھر میں موجود رہتی وہ نیچے آنگن میں کھلنے والی کھڑکی کی جانب سے بے نیاز رہتا، مگر جیوں ہی زہرہ کسی کام سے باہر جاتی، وہ موقع پا کر گلبدن کے آنگن میں جھانکنے لگتا۔ اکثر اسے گلبدن دکھائی دے جاتی۔ کبھی وہ غسل خانے سے نکل رہی ہوتی۔ کبھی کچن میں مشغول ہوتی یا پھر آفس جانے کی تیاری کر رہی ہوتی اور جمال کسی زرخرید غلام کی طرح اس کے پیچھے پیچھے لگا رہتا اور یہ لونڈیا، جس کا نام سبزہ تھا، کوئی سات آٹھ برس کی تھی جب پہلے پہل اس گھر میں آئی تھی۔ وحشت زدہ سی، پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کو دیکھتی پھرتی۔ چلا چلا کر بات کرتی۔ اسے باتھ روم سے وحشت ہوتی تھی۔ صبح سویرے گھر کے پاس والے میدان میں فارغ ہو آتی۔ کبھی کبھی صرف فراک پہنے ہوتی۔ بار بار چڈی اتارنے کی زحمت کون مول لے؟ مگر جب گلی کے لونڈے اس کے گھر کا چکر لگانے لگے تو گلبدن نے ٹھوک ٹھاک کر اسے قاعدے کا بنایا اور اس کا باہر نکلنا بند کر دیا۔

آنگن سے ملحق باتھ روم تھا مگر سبزہ کو آنگن میں بیٹھ کر ننگے بدن نہانا پسند تھا اور اسے اس کی آزادی بھی حاصل تھی۔ گلبدن تو آفس چلی جاتی اور جمال کہیں اور نکل جاتا۔ وہ گھر کا دروازہ اندر سے بند کرتی اور آرام سے آنگن میں بیٹھ کر اپنے کالے بدن کو رگڑ رگڑ کر اجلا کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ اس حقیقت سے بے نیاز کہ کوئی اسے مسلسل گھورے جا رہا ہے اور اس کے بدن کے تمام زاویوں کو اپنی نگاہوں کے فیتے سے ناپ رہا ہے۔

یہ دو منزلہ مکان شوکت کا تھا۔ فرسٹ فلور پر وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا اور گراؤنڈ فلور پر گلبدن کرایہ دار تھی۔ گراؤنڈ فلور پر ہی اگلے حصے میں شوکت نے ایک سائبر کیفے کھول رکھا تھا جس میں کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر بھی تھا۔ اس سائبر کیفے میں پانچ ملازم تھے، ایک منیجر بھی تھا۔ شوکت بیشتر اوقات کاؤنٹر پر بیٹھتا مگر گاہے گاہے اوپر فلیٹ میں آجاتا۔ ایک دن گرمی سے پریشان ہو کر اس نے پردہ ہٹایا تو دیکھا کہ وہ نہ صرف عریاں ہو کر نہا رہی تھی بلکہ اپنے نوخیز بدن سے کھیل بھی رہی تھی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر مگن تھی کہ شوکت کی جلتی ہوئی نگاہوں کو وہ محسوس ہی نہ کر سکی۔ پہلے پہل تو اسے حیرت ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی بچی کو اپنے جسم کا گیان کیونکر حاصل ہو گیا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ خود لذیت ایک آفاقی سچ ہے۔ پیدا ہونے والے ہر بچے میں تجسس کا مادہ ہوتا ہے۔ اور اس کا تجسس جسم کی بھول بھلیوں سے شروع ہو کر جسم کے چکرویو میں ختم ہو جاتا ہے۔

شوکت نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بجنے جا رہے تھے۔ زہرہ بچوں کو لے کر گرمی کی چھٹیاں منانے میکے گئی تھی۔ کاش! یہ لڑکی جمال کے بجائے اس کی نوکرانی ہوتی اور پھر۔۔۔۔۔ اس خیال کے آتے

ہی اس کے سارے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ مگر زہرہ نے آج تک کسی Maid Servant کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ وہ اس قدر سگھڑ تھی کہ گھر کی ایک ایک ضرورت کو خود سمیٹ لیتی۔ وہ زہرہ کا موازنہ گلبدن سے کرتا تو اسے یک گونہ خوشی حاصل ہوتی۔ مگر اس وقت زہرہ گھر پر نہ تھی۔ ایسے میں اگر چھم سے وہ آجائے تو کیا ہو؟ مگر سبزہ کا خیال آتے ہی اس کا تیزی کے ساتھ اُبھرتا ہوا بدن بھی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس نے چپکے سے آنگن میں جھانک کر دیکھا۔ وہ نہا کر جا چکی تھی مگر اس کا جمپر الگنی پر ٹنگا ہلکی ہلکی ہوا میں ہلکورے بھر رہا تھا۔ شوکت کے جسم میں چنگاریاں دوڑ رہی تھیں۔ اگر اس وقت زہرہ گھر پر ہوتی تو ۔۔۔۔۔ وہ روز اسے فون کرتا، اسے جلد از جلد واپس آنے کو کہتا مگر اس کا ایک جواب ہوتا۔

''اتنے دنوں بعد آئی ہوں۔ بچوں کا بھی دل لگ رہا ہے۔'' پھر وہ دھیرے دھیرے سے ہنس دیتی۔ شوکت کو اس کی ہنسی سن کر جلترنگ بجنے کا احساس ہوتا۔ زہرہ کا بدن ابھی تک وینا کے تاروں کی طرح کسا ہوا تھا۔ وہ رسیور کا بوسہ لیتا ادھر سے آواز آتی۔

''اگر اتنی ہی بے چینی ہو رہی ہے تو انٹرنیٹ پر 'کچھ' دیکھ کر دل بہلا لیجئے' یا پھر 'جے سنتوشی ماں' کا سی ڈی' وہ جھنجھلا جاتا اور رسیور کو کریڈل پر پٹک دیتا۔

جمال سے اس کے تعلقات نہیں کے برابر تھے، البتہ گلبدن اس سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ پیش آتی اور اسے نوشے بھائی کہہ کر مخاطب کرتی مگر جب زہرہ موجود ہوتی تو تو بس آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کر کے چلی جاتی، لیکن اس وقت تو سبزہ اس کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ اگر جمال نے اسے راستے پر لگا دیا ہے تو پھر اسے راہ پر لانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ مگر اس بے وقوف نے احتیاط کیوں نہ برتی؟ آج کل تو فیملی پلاننگ کے بے شمار طریقے رائج ہیں۔ لگتا ہے سب کچھ اچانک ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں فلیٹ میں ہوں، گلبدن آفس گئی ہو۔ دوپہر کا وقت ہو اور وہ بغیر چڈی پہنے سو رہی ہو۔ نیند کے عالم میں اس کی فراک جگہ سے ہٹ گئی ہو۔ جمال کی نظر اس پر پڑی ہو اور وہ پھر خود پر قابو نہ رکھ سکا ہو۔ ایسے ہیجانی مرحلے میں سوچنے سمجھنے اور احتیاط برتنے کا موقع کہاں ملتا ہے اور وہ بے چاری بن ماں کی بچی۔۔۔۔۔ اپنے گاؤں سے دور۔۔۔۔۔ اس فلیٹ کی چہار دیواری میں قید۔۔۔۔ جمال نے اسے دھمکایا ہو کہ یہ بات کسی کو نہ بتانا اور وہ مارے ڈر کے چپ رہ گئی ہو اور پھر یہ کھیل روز کا معمول بن گیا ہو۔ مگر گلبدن کی نگاہیں اس کے بدن میں ہو رہی تبدیلیوں کو کیوں نہیں محسوس کر رہی ہیں؟ کیا وہ اپنے جاب میں اس قدر مشغول ہے کہ اسے ان سب باتوں کی جانب دھیان کا موقع ہی نہیں ملتا؟ وہ اکثر جمال کو دیکھتا۔ نماز کے وقت سر پر ٹوپی ڈالے مسجد کی طرف جا رہا ہوتا۔ کیا جمال پر اس کا شک بے جا ہے؟ دیکھنے میں تو بہت سیدھا سادہ، شریف اور بے

ضرر سا انسان معلوم ہوتا ہے۔ بیوی کی کمائی کھانے والے یوں بھی دبّو ہوتے ہیں۔ اس کے اندر اتنی ہمت کہاں سے پیدا ہوگئی۔ اگر گلبدن کو اس کی بھنک بھی مل گئی تو شاید وہ جمال کو دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دے۔ تو پھر وہ کون ہوسکتا ہے؟ سبزہ تو اب فلیٹ سے باہر نکلتی نہیں ہے اور اگر کبھی باہر جاتی بھی ہے تو گلبدن کے ساتھ اور پھر یہ بھی ہے کہ باہر کا کوئی شخص شاذ و نادر ہی ان کے یہاں آتا ہے۔ تو کیا اسے کوئی مرض لاحق ہوگیا ہے؟ کوئی ایسا مرض جس میں پیٹ پھول جاتا ہو۔ لیکن اس کے پستان؟

اس نے فلیٹ کو تالا لگایا اور نیچے اتر آیا۔ سڑک پر چہل پہل کم ہوگئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ جمال اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے صرف لنگی اور بنیان پہن رکھی تھی۔ شوکت نے سوچا۔ کیا اس نے ابھی سبزہ کے ساتھ قربت فرمائی ہے؟ کیا وہ ابھی غسل نہیں کرے گا؟ وہ اس وقت دروازے پر کھڑا کس کا انتظار کر رہا ہے؟ جمال کی نظر اس پر پڑی تو وہ جلدی سے گھر کے اندر گھس گیا اور دروازہ بھی اس نے اندر سے بند کرلیا۔ اسے لگا جیسے جمال اس سے نظریں چرا رہا ہو۔ پھر وہ اپنے سائبر کیفے میں داخل ہوا اور دن بھر کے حساب کتاب میں منہمک ہوگیا۔ ملازم ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ حساب کتاب کرنے کے بعد اس نے شٹر گرایا اور تالا لگا کر سیدھا کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک رکشہ آ کر رکا اور اس سے گلبدن اترتی دکھائی دی۔ چما چم کپڑوں میں ملبوس، خوشبوؤں میں بسی ہوئی، ایک ہاتھ میں بیگ جھلاتی ہوئی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو گلبدن نے مسکرا کر اسے سلام کیا۔ وہ پوچھ بیٹھا۔

''کہاں سے آ رہی ہیں؟''

''ایک کولیگ کے بیٹے کا Reception تھا۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور ایک قاتل نگاہ اس پر ڈالی۔

''جمال کو ساتھ لے کر نہیں گئیں؟''

''نہیں اگر انہیں لے جاتی تو پھر سبزہ کو بھی لے جانا پڑتا۔ میزبان کیا سوچتا کہ دعوت تو ایک کو دی اور یہاں پورا کا پورا گھر اٹھ کر چلا آیا۔'' وہ اٹھلا کر بولی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل سینے کے اندر قلابازی کھا گیا ہو۔ ہے ہے کیا انداز ہے، کیا ادا ہے، دل کرتا ہے کے دل میں بسا کر رکھ لیں۔ اس نے چاہا کہ گلبدن کو لڈ ڈرنک کی دعوت دے اور اپنے فلیٹ پر لے جا کر۔۔۔۔۔۔ مگر وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہ جٹا سکا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس پر اپنے شک کا اظہار کر دے اور کہہ دے کہ اپنے سیدھے سادے نظر آنے والے شوہر پر نگاہ رکھے۔ اور اس فتنہ ساماں کے جسم میں ہو رہی تبدیلیوں کو محسوس کرے۔ مگر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کبھی کسی کی شکایت اس کے اپنوں سے نہیں کرنی چاہئے۔۔۔۔ خواہ بات سچ ہی کیوں نہ ہو اور اگر کہیں

جمال بے قصور نکلا تو۔۔۔۔۔۔؟ دونوں کی بظاہر ٹھیک ٹھاک زندگی میں طوفان آ جائے گا۔ اور پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے پالتو شوہر کو تو کچھ نہ کہے مگر اس بے سائبان لڑکی کو گھر سے نکال کر زمانے کی سونامی لہروں کے حوالے کر دے۔

گلبدن نے جاتے جاتے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں بھی کمپیوٹر سیکھنا چاہتی ہوں''

''شوق سے۔۔۔۔ میں خود سکھاؤں گا۔''

''نہیں آپ سے نہیں سیکھوں گی۔''

''کیوں؟'' شوکت کا سوال سن کر وہ دھیرے سے ہنسی۔ پھر اس نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔

''آپ بہت بدمعاش ہیں۔'' اور اس کی جانب پر شوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ شوکت نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سوچا کہ گلبدن ٹھیک ہی کہتی ہے۔ جب تک کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ بدمعاشی نہیں کرتا وہ اسے بدمعاش ہی سمجھتی ہے۔

گلبدن جا چکی تھی، مگر اس کے بدن سے اٹھتی ہوئی خوشبو اب بھی اس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھی۔ اسے جمال کی قسمت پر رشک آیا۔ گورا بدن، کالا بدن، پختہ بدن، نوخیز بدن، گداز بدن، چھریرا بدن، راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔ اس نے بے خیالی میں اپنی قسمت ٹھونکی اور مرے مرے قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

وہ رات اس نے تلچھٹ میں کاٹی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو گلبدن کی ٹانگوں کے درمیان پاتا۔ کبھی اپنے آپ کو سبزہ کے پستانوں پر ٹکا ہوا پاتا اور کبھی زہرہ کا مرمریں جسم اسے اپنے بدن سے لپٹا ہوا محسوس ہوتا۔ پھر اسے لگا کہ اس کا سارا جسم پگھلتا جا رہا ہے اور وہ سرتاپا سیال میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اسے بڑی گرمی محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے وہ دودھ سے بھری کوئی کیتلی ہو اور تیز آنچ پر کھولتے کھولتے دودھ اچانک پتیلی سے باہر ابل پڑا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بجلی گل تھی اور چہار جانب تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے شدت کے ساتھ اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔ وہ گھبرا کر برآمدے میں نکل پڑا اور گلبدن کے آنگن میں کھلنے والی کھڑکی پر سے پردہ ہٹایا تاکہ ہوا آ سکے۔ اسے آنگن میں روشنی دکھائی دی اور ساتھ ساتھ کچھ ایسی آوازیں بھی سنائی دیں گویا کوئی قے کر رہا ہو۔ اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ آنگن کے ایک کونے میں لالٹین رکھی تھی اور نالی کے کنارے سبزہ اپنا سینہ تھامے بیٹھی تھی۔ اس کا پورا جسم دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ شوکت کے دل میں بیک وقت ہمدردی اور افسوس کے جذبات پیدا ہوئے۔ وہ بے سہارا لڑکی اس وقت اسے بہت مظلوم دکھائی

دے رہی تھی۔ سبزہ کو ایک زور کی ابکائی آئی اور شوکت کا دل کانپ اُٹھا۔ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس کا دل الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے منہ دھویا اور بستر پر جا کر لیٹ رہا مگر اب نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ وہ کافی دیر تک یوں ہی لیٹا رہا۔ کوئی تین بجے کے قریب بجلی آئی تو اس کی آنکھ جھپک گئی۔ پھر اس نے ایک عجیب سا خواب خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہے مگر آئینے میں اس کے عکس کی جگہ ایک لومڑی دکھائی دے رہی تھی جس کے منہ سے لار ٹپک رہی تھی۔ اس کا جی متلانے لگا، پھر وہ لومڑی زور سے ہنسی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے آپ کو بری طرح گھبرایا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

چند روز یوں ہی گزر گئے۔ زہری جبیں اب تک لوٹی نہ تھی۔ گلبدن بھی کئی روز سے دکھائی نہ دے رہی تھی۔ اس نے کئی بار اس کے آنگن میں جھانک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے صرف سناٹا نظر آیا۔ البتہ کچھ آوازیں سنائی دے جاتیں جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ گھر میں لوگ ہیں۔ انہی دنوں اسے اپنے آپ میں عجیب سے تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ گلبدن کے آنگن میں جھانکنے والی اپنی عادت پر اسے خفت ہونے لگی اور اس نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ شوکت دن کے دس بجے کسی کام کے سلسلے میں اپنے دوست ساحل کے پاس جا رہا تھا۔ راستے میں اسے سگریٹ کی طلب ہوئی تو اس نے ایک اسٹال کے پاس اپنا اسکوٹر روک دیا۔ اسٹال کے سامنے ایک دو منزلہ عمارت تھی جس کی پیشانی پر سوریا کلینک، کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ اس کلینک میں فیملی پلاننگ کے جملہ طریقوں کے ساتھ ساتھ Safe Abortion کی بھی سہولت تھی۔ وہ سگریٹ سلگا کر مڑا تو کلینک سے گلبدن نکلتی دکھائی دی۔ وہ سبزہ کا ہاتھ تھامے ہوئی تھی۔ سبزہ کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کسی عذاب میں مبتلا ہو۔ گلبدن اسے سہارا دے کر پاس کھڑے رکشے تک لے گئی اور بدقت تمام اسے رکشے پر سوار کر کے خود بھی اس پر بیٹھ گئی۔ شوکت سمجھ گیا کہ بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے۔ اسی لمحے گلبدن کی نظر شوکت پر پڑی۔ گلبدن نے نظریں چرا لیں۔ اس رات بھی شوکت کو ٹھیک طور پر نیند نہ آ سکی۔ ذرا سی آنکھ لگتی تو اسے سبزہ کا بھیانک چہرہ نظر آتا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ وہ خون کا قے کرتی نظر آتی۔ پھر اسے سبزہ کے قریب ایک سایہ نظر آیا۔ سبزہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے خون آلود قے کو سمیٹا اور اس سائے کے چہرے پر مل دیا۔

اس کے بعد کئی دنوں تک نہ گلبدن نظر آئی نہ سبزہ۔ جمال کو اکثر وہ اسی ہوٹل میں دیکھتا جہاں آجکل وہ خود کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے جمال سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ سمجھ گیا کہ گلبدن سبزہ کو لے کر کہیں چلی گئی ہے۔

چند روز اور گزر گئے۔ ایک دن شام سات بجے وہ اپنی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ گلبدن رکشے سے اترتی دکھائی دی۔ بجلی حسب معمول غائب تھی۔ اور آس پاس کے گھروں کی دیواروں پر جنریٹر کی روشنی سے جلنے والے Indicator فضا میں پھیلی ہوئی تاریکی کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ گلبدن ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ گیارہ بارہ سال کی بڑی بڑی آنکھوں والی ایک معصوم سی لڑکی بھی تھی جو حیران حیران سی چاروں طرف نظریں گھما کر نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک پھول دار جمپر پہن رکھا تھا جس پر ہلکا سا اُبھار دکھائی دے رہا تھا۔ شوکت کو دیکھ کر گلبدن نے اسے سلام کیا۔ شوکت پوچھ بیٹھا۔

''کہاں گئی تھیں؟''

''گاؤں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کوئی خاص بات؟''

''ہاں۔۔۔ سبزہ کا بندوبست کرنے گئی تھی۔''

''کیسا بندوبست؟''

''سیانی ہو گئی ہے۔ اسے اس کے ماموں کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ کچھ روپے بھی دے دیئے ہیں کہ کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔''

''اوہ!'' شوکت کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی۔ چڑیا جمال کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

''اور یہ کون ہے؟'' اس نے گلبدن کے ساتھ آئی ہوئی نئی فاختہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

سبزہ کے ماموں کی لڑکی ہے۔ اب یہ یہیں رہے گی۔ کچھ یہاں کا بھی تو بندوبست کرنا تھا۔ اس کا باپ تو اسے یہاں بھیجنے پر راضی نہ ہو رہا تھا۔ جب میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کی شادی کا بندوبست بھی

اقبال حسن آزاد

کا

پہلا افسانوی مجموعہ

قطرہ قطرہ احساس

(۱۹۸۷ء)

میں ہی کردوں گی، تب تیار ہوا۔''

اچانک جنریٹر بند ہوگیا اور ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ یہ سمجھ پانے سے قاصر تھا کہ چہار جانب پھیلی ہوئی تاریکی زیادہ گہری ہے یا گناہوں کی سیاہی۔ اسے گلبدن کے خوبصورت چہرے پر خون آلود قے کے چھینٹے دکھائی دے گئے۔ اس کا جی متلانے لگا اور قے کرنے کی شدید خواہش سے اس کے اعصاب تن گئے۔ مگر وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ قے کس کے منہ پر کرے۔۔۔۔ کس کے منہ پر؟

◀◀ ● ▶▶

Shah Colony, Shah Zubair Road,
Munger 811201

● **تجزیہ**

● **ارشد عبدالحمید**

افسانہ ''بندوبست'' کا بست وکشاد

اقبال حسن آزاد کے بیانیہ کا قتیل میں ہمیشہ سے ہوں۔ روانی ان کے بیانیہ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ پھر با محاورہ زبان اور چست ایڈٹنگ مزید ہے۔ ان کے بیانیہ پر رشک آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانی رشتے، معاشرتی روابط اور نفسیاتی دروبست حاوی رہتے ہیں۔ اور یہ مجھے پسند ہے۔

اُن کا افسانہ ''بندوبست'' حسب معمول ان کے رواں بیانیہ اور چست پلاٹ نگاری کے باعث توجہ طلب ہے۔ وہ با محاورہ زبان ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ واقعات کی ہم آہنگی سے اسے مزید دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ جنسیات کا تذکرہ میں نے ان کے افسانے میں پہلی بار دیکھا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے چٹخارے کو نہیں، جنسیات کے نفسیاتی اور سماجی تفاعل کو پیش نظر رکھا ہے چنانچہ افسانے کا موضوع جنسیات نہیں، مرد وزن کے نفسیاتی پہلو کا وہ غیر معمولی سماجی ایڈجسٹ مینٹ ہے جسے آپ کتنا ہی خلاف قاعدہ یا غیر اخلاقی قرار دیں لیکن ایسا ہوسکتا ہے۔ اور جو ہوسکتا ہے وہی اس افسانے کو اہم تر بناتا ہے۔

جہاں تک ''بندوبست'' کا تعلق ہے اس میں دو مرد کردار ہیں۔ شوکت اور جمال۔ ایک تیسرا مرد کردار بھی ہے اور وہ ہے راوی..... لیکن راوی کا ذکر بعد میں۔ پہلے شوکت اور جمال کا ذکر ہو جائے۔ کہانی پوری طرح شوکت کے زاویے سے لکھی گئی ہے۔ چنانچہ اس کی کردار نگاری براہ راست ہے۔ لیکن جمال کا کردار شوکت کے زاویے سے بیان ہوا ہے اور اس زاویے نے جمال کے بارے میں ایک نوع کی mystry تخلیق کی ہے جو واقعی دلچسپ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شوکت کا کردار بھی دلچسپ ہے کہ ایسے افراد فطری طور پر ہر معاشرے میں ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ مجھے بس یہ عرض کرنا ہے کہ جنسی تلذذ کی طرف مائل شوکت جس کے ذہن میں اپنی بیوی سے لے کر گلبدن اور سبزہ تک کے جنسیت آمیز خیالات گڈمڈ ہوتے رہتے تھے وہ اچانک بدل کیسے گیا؟ اور یہ تبدیلی بھی تعجب خیز نہیں، سوال صرف جواز کا ہے کہ یہ تبدیلی کیوں کر پیدا ہوئی؟ راوی ہمیں صرف اتنا بتاتا ہے کہ: ''انہی دنوں اسے اپنے آپ میں عجیب سی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ گلبدن کے آنگن میں جھانکنے والی اپنی عادت پر اسے خفت ہونے لگی اور اس نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔''

افسانہ اس تبدیلی کے جواز سے محروم ہے اور اقبال حسن آزاد جیسے فن کار جو چھوٹی سے چھوٹی بات کے نفسیاتی یا منطقی جواز کا قرینہ اپنے ہر افسانے میں رکھتے ہیں۔ یہاں محض راوی کے ایک بیان سے فارغ ہو گئے۔

خواتین میں بھی بنیادی طور پر دو کردار ہیں..... ایک سبزہ اور دوسرا گلبدن۔ جمال کی طرح سبزہ کا کردار بھی شوکت کے زاویے سے بیان ہوا ہے، یعنی ہم سبزہ کو شوکت کے ذریعے پہچانتے ہیں کہ وہ کیسی ہے۔ سبزہ کا کوئی براہ راست تفاعل نہیں۔ البتہ گلبدن فعال ہے اور اس کا رویہ بھی خاصہ پیچیدہ ہے یعنی افسانے کا بیانیہ ہمیں براہ راست یہ نہیں بتاتا کہ گلبدن اپنے شوہر کے لیے نوجوان نوکرانیاں فراہم کرتی ہے اور خود ادھر ادھر فلرٹ کرتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ شوکت سے بھی۔ لیکن گلبدن کا کردار بس اتنا ہی نہیں ہے۔ اس کا خدشہ ہے کہ گلبدن شوہر کو جنسی تسکین فراہم کرنے کے قابل نہ ہو۔ اور اس کا فلرٹ کرنا محض اس کا اوڑھا ہوا مکھوٹا ہو۔ کم از کم شوکت کو وہ یہی باور کراتی ہے کہ اس کا شوہر نالائق ہے۔ لیکن سبزہ اور پھر سبزہ کے ماموں کی لڑکی کے آنے سے سب معاملات صاف ہو جاتے ہیں۔

مجھے اس افسانے کے سبھی کردار متاثر کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب اکہرے کردار نہیں ہیں بلکہ نفسیاتی تہہ داری والے کردار ہیں۔

افسانے کے مرکز میں بظاہر گلبدن ہے اور اس کا شوہر جمال ہے، لیکن مزیدار بات یہ ہے کہ اس

مرکز کا ایک تیسرا زاویہ بھی ہے اور وہ ہے شوکت۔ بظاہر شوکت کا اس افسانے کی کہانی سے کوئی لینا دینا نہیں۔ وہ مکان کا مالک ہے اور اسے کرایہ دار سے ملنے والے کرایے سے مطلب ہونا چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ دراصل افسانہ نگار نے تمام افسانہ اسی شوکت کے نظریے سے لکھا ہے۔ گو کہ شوکت افسانے کا راوی نہیں ہے لیکن راوی بھی شوکت ہی کے نقطۂ نظر سے تمام ماجرا بیان کر رہا ہے۔ اور اسی باعث افسانے میں یہ دلچسپ بات پیدا ہوگئی ہے کہ راوی کا خود کا کوئی نظریہ نہیں اور بیانیہ کے مرکزی کرداروں یعنی گلبدن اور جمال کا بھی اس سلسلے میں کوئی راست دخل نہیں اور نہ ہی افسانے کی ان دو نوکرانیوں کا کوئی دخل ہے جن میں سبزہ کا کردار تفصیل سے بیان ہوا ہے لیکن اس تفصیل میں خود سبزہ کے نظریے کی کوئی وضاحت نہیں..... تو جو کچھ ہے وہ شوکت ہی کا نظریہ ہے اور مطمحِ نظر ہے اور باقی کردار بس وہی ہیں جن کی اچھی بری خصوصیات شوکت کے مطمحِ نظر نے قاری تک پہنچادی ہیں۔

اب آیئے اصل اور تیسرے مرد کردار پر یعنی راوی۔ یہ بات میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ راوی الگ ہے اور شوکت الگ۔ لیکن تمام کا تمام افسانہ شوکت کے نقطۂ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ افسانے کے تمام کرداروں کو بھی ہم شوکت ہی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ جب سارا افسانہ شوکت کے زاویے سے لکھا گیا ہے تو ایک تکنیکی سوال یہ ہے کہ خود شوکت ہی افسانے کا راوی کیوں نہیں ہے؟ راوی اور شوکت کے الگ ہونے کا کیا فائدہ یا نقصان ہے..... یا اگر شوکت نہ ہوتا۔ محض راوی ہوتا..... یعنی افسانہ واحد متکلم میں روایت کیا جاتا تو کیا فرق پڑتا؟ وغیرہ وغیرہ!

مجھے تکنیکی اعتبار سے یہ بات بہت دل چسپ معلوم ہوتی ہے کہ افسانہ نگار نے کہانی تو گلبدن، جمال اور سبزہ کی سنائی ہے لیکن مطمحِ نظر شوکت کا استعمال کیا ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ شوکت افسانے کا راوی بھی نہیں ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اگر شوکت کہانی کے مرکز میں نہیں ہے تو اس کی اتنی اہمیت کیوں ہے کہ تمام منظر نامہ اسی کی آنکھ سے دیکھا جا رہا ہے؟ اور جب آنکھ اس کی ہے تو وہ راوی کیوں نہیں ہے؟ اور اگر یہ سب اتنا ہی ضروری ہے تو یہ شوکت کی کہانی کیوں نہیں ہے؟ گلبدن، جمال اور سبزہ کی کہانی کیوں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

مجھے نہیں معلوم کہ افسانے کے فاضل قارئین اس صورت حال کا کیا تجزیہ کریں گے لیکن میری ناقص رائے میں یہ شوکت ہی کی کہانی ہے۔ شوکت اس لیے ضروری اور اہم ہے کہ ایک تو پورا افسانہ اسی کا مطمحِ نظر ہے۔ دوسرے شوکت کے کردار کو میں ایک علامت مانتا ہوں۔ اس سماج کی علامت جو ''مان نہ مان میں تیرا مہمان'' کی مصداق ایک فیملی کی صورت حال کو زبردستی اپنی شخصیت کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ ارے بھائی! ایک گلبدن ہے..... ایک اس کا شوہر جمال ہے اور ایک اس کی کم سن نوکرانی سبزہ ہے۔ ان تینوں میں ایک خاموش سمجھوتا، ایک ایڈجسٹ مینٹ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی بہت سی ضرورتیں پوری کر

رہے ہیں۔ کوئی کما کر لا رہا ہے۔ کسی کمسن کی لاچاری ہے کہ غربت اسے جنسی استحصال تک لے آئی ہے اور نکمے شوہر کی جنسی ضروریات بیوی سے پوری نہیں ہو رہی ہیں تو وہ نوکرانی سے اپنا مقصد پورا کر رہا ہے۔ اور یہ نوکرانی اسے خود اس کی بیوی فراہم کر رہی ہے۔ اب یہ جو کچھ بھی ہے یہ ایک فیملی کا ایڈجسٹ مینٹ ہے کہ وہ فیملی بنی ہوئی ہے، ٹکی ہوئی ہے۔ اس پورے تناظر میں شوکت (یا سماج؟) کو کیا پڑی ہے کہ وہ ہر شے کو اپنے نقطۂ نظر سے سوچے اور اپنی ہی آنکھ سے دیکھے اور ہر بات، ہر منظر کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دے۔

افسانہ نگار کی تعریف کی جانی چاہیے کہ اس نے شوکت (سماج) کو یہ اہمیت دی اور اپنی تکنیک نیز اپنے بیانیہ سے یہ جتایا کہ جمال، گلبدن اور سبزہ کے بارے میں برا بھلا سوچنے والا یہ شوکت، موقع ملے تو سبزہ کے ساتھ وہی سب کچھ کرے گا جو جمال کرتا آیا ہے۔ اور بیانیہ سے اُبھرنے والا سماج کا یہ تضاد اسی وقت گہرے طنز میں بدل سکتا تھا جب شوکت کی آنکھ اور دماغ کو مرکز میں رکھا جاتا۔ اور افسانہ نگار نے یہی کیا۔

یہ شوکت (سماج) کی اہمیت ہی کا تقاضہ تھا کہ کہانی میں گلبدن کو ایک پراسرار عورت کے روپ میں پیش کرتے ہوئے بہت سے سوالات کو قاری کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ مثلاً گلبدن خود کماؤ پوت تھی تو پھر ایک نکمے خاوند کا بوجھ اٹھانے پر کیوں مجبور تھی؟ وہ بآسانی اس سے گلوخلاصی حاصل کر سکتی تھی کہ معاش کی سطح پر وہ اس کی محتاج نہ تھی۔ پھر وہ اکثر دفتر کے ساتھیوں اور دیر رات کی پارٹیوں میں اس طرح کھوئی رہتی تھی کہ گھر پر کیا ہو رہا ہے، اسے معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس سے لگتا ہے کہ وہ ایک اوباش عورت تھی اور اپنی جنسی تسکین گھر کے باہر تلاش کرتی تھی۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ سبزہ والے حادثے کے بعد اسی کی کم سن ماموں زاد بہن کو نوکرانی بنا کر نہ لاتی۔ ظاہر ہے کہ دوسری نوکرانی کا لانا ایک ''بندوبست'' ہی تو تھا۔

میری حقیر رائے میں یہ تمام صورت حال دو باتوں کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہے۔ ایک یہ کہ گلبدن مرد کے لائق نہ تھی اور اس کا پارٹیوں میں جانا محض ایک چھلاوہ تھا۔ وہ جمال کے ساتھ اپنا گھر بنائے رکھنا چاہتی تھی کہ اس کی نسوانی نااہلی کا راز سماج پر آشکارا نہ ہو اور زندگی اسی طرح چلتی رہے۔

افسانہ نگار نے ان سب تفاصیل کو اہمیت نہ دے کر محض شوکت اور اس کے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ کو مرکز میں رکھا ہے اور بجا طور پر رکھا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ افسانہ ایک طرف اخلاقیات پر گڑھی ہوئی فرسودہ سی کہانی سے آگے نہ بڑھتا اور نتیجے میں عصریت سے خالی رہتا۔ دوسری بات یہ کہ اگر شوکت کی فکر و احساس کو مرکز میں نہ رکھا جاتا تو سماج پر اس گہرے طنز کی تخلیق نہ ہوتی جو اس افسانے کا مابہ الامتیاز ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شوکت کو افسانے کا راوی بھی نہیں بنایا گیا ہے۔ اگر شوکت اپنی بات واحد متکلم میں کہتا تو وہ دوری قائم نہیں ہوتی جو اس طرح کے طنز کے لیے لازمی ہے۔

تحریر میں بالواسطہ یا بلاواسطہ مصنف کی شخصیت کا شامل ہونا لازمی ہے۔اس اعتبار سے مصنف کی اپنی نفسیات ہوتی ہے جو اس کے تخلیقی عمل کا جزو لاینفک ہے۔ چنانچہ فکشن میں بہت کم مثالیں ایسی ہیں جن میں کوئی برا یا نیم برا کردار واحد متکلم میں اپنی کہانی سنائے۔کسی villion کو آپ بیتی سناتے میں نے نہیں دیکھا۔اس کے بعض دیگر پہلوؤں میں یہ بھی شامل ہے کہ مصنف, راوی اور شوکت.....اگر تینوں ایک ہوجاتے تو جمال اور گلبدن کے کرداروں کی پراسراریت باقی رکھنا ممکن نہ تھا۔مصنف, راوی اور شوکت کے الگ ہونے سے تین سطحی سہولت حاصل ہوئی:

1۔مصنف واقعات اور کردار نگاری کے خواص کے انتخاب میں آزاد ہے۔

2۔یہ آزادی راوی کو بھی ہے.....یعنی مصنف جو بات بتانا نہیں چاہتا وہ راوی کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے کہ صاحب راوی نے ایسا کیا۔

3۔جو بات راوی نہیں بتانا چاہتا وہ شوکت کے کھاتے میں ڈال دیتا ہے کہ چونکہ شوکت نے نہیں بتائی اس لیے راوی نے بھی نہیں بتائی۔

تکنیکی روپ سے یہ مصنف کی نفسیات ہے کہ جمال اور گلبدن کی پراسراریت کا ذمہ تین واسطوں سے مصنف تک پہنچتا ہے اور اسی وجہ سے جما اور گلبدن کے کرداروں کا دھندلا پن قاری کے لیے قابل قبول بنتا ہے۔اب رہی اس دھندلے پن کی اہمیت تو یہ صورت حال بلیغ تر ہے کہ حس طرح شوکت جمال اور گلبدن کے بارے میں قیاس آرائی کر رہا ہے ویسے ہی قاری بھی اپنے نتائج نکالنے میں قیاسات سے کام لے سکتا ہے اور ایک سے زیادہ قیاس یعنی ایک سے زیادہ معنی بلاغت کی بہتر صورت حال ہے

اقبال حسن آزاد اس ہنر سے واقف ہیں کہ کون سی بات کہہ کر ظاہر کرنی ہے اور کون سی بات نہ کہہ کر جتانی ہے۔کون سی تفاصیل افسانے کے لیے ضروری ہیں اور کون سے سوالات کو قاری کے لیے چھوڑنا بہتر ہے۔وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ فوکس گلبدن، جمال اور سبزہ پر رکھنا ہے یا شوکت اور اس کی فکر وعمل پر۔اس اعتبار سے نیز تکنیک کے خوب صورت اور بامقصد استعمال اور بیانیہ کی چستی کے باعث ''بندوبست'' ایک نہایت کامیاب افسانہ ہے۔البتہ ایک ہی بات سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ پورے افسانے میں شوکت کی فکر وعمل کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہ آخر میں تبدیل کیوں ہوگیا؟ اور اس طرح بلا جواز اچانک وہ بدل کیوں گیا۔ میرے خیال میں شوکت کے کردار کی یہ تبدیلی لازمی نہ تھی اور اگر لازم تھی تو اس لازمیت ہی کا نہیں، تبدیلی کا بھی کوئی نہ کوئی جواز فراہم کرنا افسانے کی بنت کا ایک فطری تقاضہ تھا۔

◀◀ ● ▶▶

Plot No: 64 to 67
Firdos Nagar Near Rajban
Tonk-304001(Rajasthan)

● **ناول کا ایک باب**
● **اقبال حسن خان**

راج سنگھ لاہور یا

کیٹی نے میز سے سگریٹ کا ڈبہ اُٹھا کر ایک سگریٹ منتخب کرتے ہوئے کہا۔

میرے لیے یہ انتہائی حیرت کی بات تھی۔وہ تو ہندوستان سے محبت کرنے والی عورت تھی پھر اُس نے ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ میں نے کہا۔

''مگر تم تو۔۔۔۔۔''

کیٹی نے ہاتھ اُٹھا کر میری بات کاٹی۔

''ہندوستان کا یہ چہرہ میرے لیے نیا بھی ہے اور خوفناک بھی۔میں فسادات کے بعد بہار گئی تھی۔تمہارے ملک کے لوگوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو زندہ حالت میں درختوں میں ٹھونک کر وہیں مرنے کو چھوڑ دیا تھا۔''

وہ دکھ کی وجہ سے اپنی بات مکمل نہ کرسکی۔چند لمحوں تک شراب کے گھونٹ لیتی اور سگریٹ کے کش لگا کر بولی۔

''میں گاندھی جی کے دورے میں ان کے ساتھ تھی۔بوڑھا آدمی کتنی ہی مرتبہ یہ مظالم دیکھ کر

رودیا۔ میں اخبار نویس ہوں۔ میرا کام رپورٹنگ کرنا ہے۔ میرا جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے لیکن ساتھ ہی میں ایک انسان بھی ہوں۔ کاش یہ احمق ہندوستانی اتنا خون اپنی آزادی کے لیے بہاتے جتنا وہ ایک دوسرے کو مذہب کے نام پر مارکاٹ کر کے بہا رہے ہیں تو دنیا کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جاتا اور ہندوستان کبھی کا آزاد بھی ہو چکا ہوتا۔''

مجھے سیاست سے زیادہ اُس وقت کلونت کور کی فکر تھی۔ میں نے کہا۔

''کیٹی مجھے ایک سکھ لڑکی سے محبت ہوگئی ہے۔ میرے والدین میری اُس سے شادی کے مخالف تو ہیں ہی، اگر اس کا علم کسی کو ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے بھی ان فسادات کو بڑھاوا دینے والوں کے کام میں حصہ ڈالا ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

کیٹی میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کافی دیر تک سوچتی رہی۔ وہ بولی تو اس کی آواز اور لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

''میں جانتی ہوں تم کن مشکلات کا شکار ہو سکتے ہو؟ لیکن اگر تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے تو تمہیں اُسے شادی ضرور کرنا چاہئے۔ ہر مخالفت کی پروا کیے بنا۔''

مجھے کیٹی کی بات سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا۔

''وہ میرے ساتھ گھر چھوڑنے کو تیار ہے۔ ہم اسے گھر سے لڑکی کا بھاگ جانا کہتے ہیں اور اس بات پر قتل ہو جاتے ہیں۔''

کیٹی نے منہ بنایا اور بولی۔

''یہ تو شاید بہت بڑی بات ہے۔ تم ہندوستانی تو راہ چلتے کندھے ٹکرانے پر بھی چاقو نکال لیتے ہو۔ بہرحال تمہیں اُس سے شادی کر لینا چاہئے اور تمہارے والدین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

میں نے اُسے بتایا کہ میرے والدین کیا کہتے تھے۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

''تم نے لڑکی کے تمہارے لیے مذہب چھوڑنے والی بات کہی۔ مجھے ہمیشہ سے یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے۔ مسلمان لڑکوں سے شادیاں کرنے والی لڑکیاں ہی ہمیشہ اپنا مذہب چھوڑتی ہیں۔ لڑکے کیوں نہیں چھوڑتے؟''

میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کلونت کور مجھ سے اس قسم کی کوئی فرمائش کرتی تو میں کبھی بھی اُس کی بات تسلیم نہ کرتا۔ اُسے چھوڑ دیتا لیکن اپنا مذہب نہ چھوڑتا۔ کیٹی میری ذہنی حالت کو پڑھ رہی تھی تو وہ ہنس کر بولی۔

''بہرحال میں کچھ اور پوچھ کر تمہیں کسی قسم کی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ تم جیسے بھی بن

پڑے، اُس سے شادی کر لو۔''

میں ایسا ہی کرنا چاہتا تھا لیکن کلونت سے شادی کر کے میں کبھی بھی اُس علاقے میں نہیں رہ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے گھر میں۔ میں نے اپنی مشکل کیٹی کو بتلائی تو وہ ہنسی اور بولی۔

''اس لیے نہیں کہ تم نے ایک رات مجھے راولپنڈی میں ایک جنونی اور نشے میں دھت انگریز سے بچایا تھا، بلکہ اس لیے کہ تم میرے عزیز دوست ہو، تم اس کی قطعاً فکر مت کرو۔ تم اُسے یہاں لا سکتے ہو۔ تم دونوں یہاں رہ سکتے ہو۔ میں تمہاری نوکری کا کوئی بندوبست بھی کر دوں گی۔ دیکھو شاید تم اسے بچگانہ بات سمجھو لیکن اگر تم دونوں چاہو گے تو میں تمہیں اپنے ساتھ انگلینڈ بھی لے جا سکتی ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں اب ہندوستان چھوڑنا چاہتی ہوں۔ میری وہاں بہت بڑی جائیداد ہے۔ تمہیں کام کی فکر بھی نہیں ہونا چاہئے۔''

کیٹی بات ختم کر کے پھر گھونٹ لینے لگی۔

شاید مجھے کلونت کو اپنانے کے لیے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت تھی اور اب جبکہ مجھے وہ سہارا کیٹی کی صورت میں مل گیا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں کلونت کو اُس کے گاؤں سے دلی لے جاؤں گا اور شادی کر لوں گا۔ سب کچھ خواب کے مانند لگ رہا تھا۔

میں کیٹی کی ہر پیش کش کے لیے اُس کا شکر گزار تھا۔ رات گئے میری واپسی تھی۔ جب میں ریل میں بیٹھا سفر کر رہا تھا تو مجھے دیکھ کر تعجب ہوا کہ ڈبے میں میرے علاوہ بس تین چار مسافر اور تھے۔ عموماً ایسا نہیں ہوا کرتا تھا کیونکہ مشرقی اور مغربی پنجاب کے وہ لوگ جو اندرون ملک دلی سے آگے تک ملازمتیں یا کاروبار کیا کرتے تھے، ہمیشہ ریلوں میں بھیڑ بنائے رکھتے تھے۔ خریدے گئے پرزے دو ڈبوں میں میری نشست کے نیچے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اس قدر وزنی تھے کہ مجھے اُن کے چوری ہو جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ جالندھر سے چار پانچ گھبرائے ہوئے مسلمان ڈبے میں داخل ہوئے تو مجھے علم ہوا کہ مغربی پنجاب میں کیسی آگ لگ چکی تھی۔ تین کیمبلپور (اب اٹک) اور دو راولپنڈی کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ وہاں سکھ مسلم فسادات پھوٹ پڑے تھے جس کی مجھے اطلاع نہیں تھی۔ مجھے بھی وہیں جانا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہاں سے سکھوں کے جتھے مشرقی پنجاب کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ کچھ مشرقی پنجاب کی حدود میں داخل بھی ہو چکے تھے اور کشیدگی کا رخ اب مغربی سے نکل کر مشرقی پنجاب کی طرف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کا ریل کا سفر آسان نہ تھا۔ ریل پر حملہ تو کوئی نہیں ہوا لیکن پٹریوں کے کنارے کھڑے سکھ نوجوانوں نے کسی کسی جگہ پتھراؤ بھی کیا اور اپنی دھوتیاں اُوپر اُٹھا کر ہمیں اپنے خفیہ اعضاء بھی دکھائے۔

یہ ریل سیدھی اُس سٹیشن نہیں جاتی تھی جہاں سے مجھے تانگہ لے کر عمر حیات کی حویلی پہنچنا

تھا۔ مجھے ایک ریل اور تبدیل کرنی تھی۔ میں جس وقت دوسری ریل سے وہاں پہنچا تو سٹیشن پر کوئی تانگہ نہیں تھا۔ بشیر ڈرائیور مجھے لینے آیا ہوا تھا جس نے مجھے بتایا کہ خان جی میری طرف سے پریشان تھے اور دو دن سے اُسے ریل کے وقت پر سٹیشن بھجوا رہے تھے۔ راستے میں بشیر نے سکھوں کو گالیاں دے کر کہا۔

''کنجروں نے بہت مسلمان مارے تھے اُدھر۔ اِدھر ہم نے بدلہ لے لیا ہے۔ بھگا دیا ہے اِدھر سے سب دلوں کو۔ راولپنڈی میں کل رات بڑی مار کاٹ ہوئی ہے۔ دفع ہو رہے ہیں سب اِدھر سے۔ ویسے بھی جی پاکستان تو سمجھو اب بن ہی گیا۔ گندے لوگوں کا اِدھر کیا کام؟''۔

اگر اِدھر کے سکھوں کے ساتھ کچھ ہوا تھا تو پھر کلونت کور بھی تو سکھ ہی تھی اور اُس کا گھر عمر حیات کی حویلی سے بہت قریب تھا۔ میں نے کہا۔

''وہ چوروں والے پنڈ میں بھی کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تھا؟''

بشیر چونکا اور ہنس کر بولا۔

''آپ کا اُدھر کوئی رہتا ہے؟ ہاں جی ہوا تھا۔ ایک بڑا زمیندار تھا۔ بلبیر سنگھ۔ اُس کا گھر سب سے پہلے لُٹا۔ اُسے تو مار دیا تھا فسادیوں نے۔ اُس کی لڑکی سے سارے بدلے لے لیے اپنی مسلمان بہنوں کے۔''

میرا دل مانو میرے حلق میں دھڑکنے لگا۔ میں نے سٹیرنگ پر ہاتھ اتنی شدت سے رکھا کہ نیم پختہ رستے پر چلنے والی کار لحہ بھر کو ڈول گئی۔ میں چیخا۔

''روکو۔ روکو۔''

بشیر نے کار روک دی اور حیرت سے بولا۔

''خیر تو ہے جی؟''

میں نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں کار سے اُتر کر ریل کی پٹری کے ساتھ بھاگنے لگا۔

چوروں والے پنڈ میں قبرستان کا سا سناٹا تھا۔ یہ میرے علم میں تھا کہ وہاں سکھ ہندو آبادی زیادہ اور مسلمان کم تھی۔ بلبیر سنگھ کا گھر نمایاں جگہ پر تھا۔ گھر کو اتنی شدت کی آگ نے جلایا تھا کہ گھر کے سامنے لگا صدیوں پرانا پیپل کا درخت بھی نیچے سے جھلسا ہوا تھا۔

گاؤں سے کتے تک ناپید تھے۔ گندم کی پیلی فصل بھی کہیں کہیں سے جھلسی ہوئی تھی۔ آج مجھے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ میں درانہ بلبیر سنگھ کے گھر میں گھس گیا۔ میں پہلی مرتبہ اس گھر کے اندر گیا تھا۔ ایک طویل کچے صحن کے دونوں جانب کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جو اجناس وغیرہ رکھنے کے کام آتی تھیں۔ کچھ کوٹھریاں خالی تھیں جو یقیناً لوٹی گئی تھیں۔ کچھ میں جھلسی اور جلی اجناس ابھی تک موجود تھیں۔ توڑ

پھوڑ کے آثار بہت واضح تھے۔ میں طویل برآمدے سے گزرا پھر چار رہائشی کمروں میں گھوما۔ جگہ جگہ کپڑے، برتن اور گھریلو ضرورت کا دوسرا سامان بکھرا پڑا تھا۔ گھر میں ایک کوے کے علاوہ اور کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ دھریک کے پیڑ پر بیٹھا کوا میرے داخل ہوتے ہی شور مچانے لگا تھا اور اب بھی وہ ایسا ہی کر رہا تھا۔ مجھے اطمینان ہونے لگا تھا کہ کلونت کور کا خاندان یہاں سے بخیریت نکل گیا تھا۔

کسی نے میرے شانے پہ ہاتھ رکھا تو میں نے گھوم کر دیکھا۔

وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ میں اُسے کتنی ہی مرتبہ سٹیشن پر بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ ہمیشہ سفید تہبند اور لامبا کرتا پہنا کرتا تھا۔ سر پر سفید پگڑی ہوتی تھی اور چھوٹی سی ترشی ہوئی داڑھی کے ساتھ وہ اچھا خاصا دیندار لگتا تھا۔ اُس نے نفی میں سر ہلایا اور دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

''اب یہاں کیا دھرا ہے؟ وہ نکل گئے۔ فوجی اُنہیں ساتھ لے گئے تھے۔ لوٹنے والے بعد میں آئے تھے۔ سب کچھ لے گئے۔ تمہارے لیے اب کچھ نہیں بچا۔''

وہ مجھے چور سمجھ رہا تھا۔ ایسا کوئی گیدڑ جو شیر کے مارے شکار کو چوری چھپے کھانے آجاتا ہے۔ اُس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ شاید کچھ کہا بھی لیکن میں سمجھا نہیں۔ نہ ہی میں سمجھنا چاہتا تھا۔ کلونت کور کے نہ ملنے کے دکھ سے بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اور اُس کا خاندان اُنہیں بھیڑیوں سے محفوظ رہی تھی جن کے بھائی بند سرحد کی دوسری طرف سے مسلمانوں کی لاشوں سے بھری ریلیں اس طرف روانہ کر رہے تھے۔

میں اپنے پریشان حال والدین تک کیسے پہنچا۔ یہ ایک لمبی داستان ہے اور پڑھنے والوں کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تو میں اسے بیان نہیں کروں گا۔ ہمارا شہر جل رہا تھا۔ ہمارا محلہ محض اس لیے بچا ہوا تھا کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اطلاع یہی تھی کہ اس اور دیگر شہروں میں رہنے والے ہمارے بیشتر اعزاء پاکستان کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ہر روز ہمارے محلے سے کوئی نہ کوئی کنبہ پاکستان کے لیے نکل رہا تھا۔ ہمارا گھرانہ بھی محض اس لیے رکا ہوا تھا کہ وہ سڑک کے راستے جانا چاہتے تھے۔ اُدھر سے آنے والی ٹرینیں غیر مسلموں کی کٹی ہوئی لاشوں سے اور اِدھر سے جانے والی مسلمانوں کی لاشوں سے بھری پہنچ رہی تھیں۔ ابا جی سے کسی نے ٹرک کا وعدہ کر رکھا تھا جو ہمیں اٹاری کے پار پہنچا سکتا تھا، جو ہندوستان کی سرحد کا پنجاب میں آخری کونا قرار پایا تھا۔ ہم اسی ٹرک پر پاکستان پہنچے تھے۔ راستے کے مناظر اس قدر دل دوز تھے کہ میں اُنہیں بیان نہیں کرنا چاہتا کیونکہ یہ سب بڑی تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ میں بس اتنا کہنا چاہوں گا کہ وہ سب دیکھ کر انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر سے ایمان بار بار اُٹھ جاتا تھا۔

میری اماں اور ابا کو اپنا شہر اور اپنی جنم بھومی ہمیشہ کو تیاگنے کا دکھ تھا۔ میرا دکھ دہرا تھا۔ مجھے وہ اس

کے ساتھ ساتھ اُس لڑکی کا بھی دکھ تھا جس نے محبت کے چراغ آنکھوں میں روشن کیے اپنا تن اور اپنی جان درندوں کے سپرد کی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک برس کے اندر اندر ہمیں ایک گھر بھی مل گیا اور ابا جی نے یہاں کی سبزی منڈی میں ایک دکان تلاش کر کے کاروبار بھی شروع کر دیا لیکن میں نہ سنبھل سکا۔ تین برس گزر گئے۔ کلونت کور کا دکھ مجھے بھولتا ہی نہیں تھا۔ مجھے یہ پچھتاوا مارے ڈالتا تھا کہ میں اگر ایک رات پہلی دلی سے لوٹ آیا ہوتا تو اس وقت کلونت میرے ساتھ ہوتی۔

کلثوم، میری پہلی محبوبہ کے بارے میں برسوں بعد کسی نے بتایا تھا کہ فسادیوں نے اُس کے شوہر اور تین بچوں کو، دلی میں اُس کی آنکھوں کے سامنے تلواروں اور برچھیوں سے قتل کیا تھا اور دس بارہ آدمی باریاں لگا کر اُس کی عزت سے کھیلے تھے۔ پاکستان بن گیا تھا، ہندوستان آزاد ہو گیا تھا لیکن مذہب پر بہت سے انسانوں کا یقین ماند پڑ گیا تھا کہ اُنہوں نے محض مذہب کی آڑ میں وہ کچھ دیکھا اور جھیلا تھا جس کی اجازت دنیا کے کسی مذہب میں نہیں تھی۔ میں پاکستان کے خلاف نہیں تھا۔ دراصل میری سوچ ہی اس حوالے سے اتنی پختہ نہیں تھی اور وہ صرف ہندوستان کی آزادی پر اٹک جاتی تھی لیکن بعد میں میں نے سوچا، تجزیہ کیا تو پاکستان کا قیام مجھے ہندوستان کی سرزمین ہی نہیں، مسلمانوں کے ٹکڑے کرنے کے مترادف بھی دکھائی دیا۔ پاکستان بنانے والوں کی نگاہوں سے بہت سے وہ عوامل اوجھل تھے جو صدیوں سے کسی خطہ زمین پر آباد ہونے والوں کو وہاں سے اکھاڑ کر کہیں اور بسانے کی کوششوں کے نتیجے میں وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔ اُس وقت جن لوگوں نے حالات کو ایسی تاریخ کے تناظر میں دیکھ کر، قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی، وہ راندہ درگاہ ٹھہرے تھے لیکن کیا آج کے حالات نے ثابت نہیں کر دیا کہ وہ سچے تھے؟ پاکستان بننے سے پہلے میری ایک ہی فکر تھی کہ میری سکھ محبوبہ کلونت کور مجھے مل جاتی لیکن جب میں نے مذہب کے نام پر بہائے جانے والے خون سے گزر کر پاکستان تک کا سفر طے کیا تو یہ فکر قدرے پیچھے چلی گئی اور اس کی جگہ ایک بے نام اُداسی نے لے لی۔ ایسی اُداسی جو مجھے دھیرے دھیرے اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی۔ مجھے اکثر بخار رہنے لگتا۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ خود کو مارنے کی کوشش بھی کی اور شاید میں اگلی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا اگر مجھے ضامن بھائی نہ ملتے۔

ضامن بھائی نے مجھ سے زیادہ خون اور آگ دیکھی تھی۔ اُن کا محلہ جس میں مسلمان اکثریت میں تھے نہ صرف جلا دیا گیا تھا بلکہ وہاں موجود عورتوں اور لڑکیوں، حتیٰ کے بچیوں تک کے ساتھ وہ بہیمانہ سلوک کیا گیا تھا کہ جس کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اتنے دکھوں اور بربریت سے گزر کر مجھے موجودہ محلے میں

ملنے والے ضامن بھائی ہمیشہ میری یادوں میں مہکتے رہیں گے۔

میری کہانی کا دوسرا حصہ اُس وقت شروع ہوا تھا جب ضامن بھائی کی توجہ اور محبت نے مجھے جینے کی نئی اُمنگ سے روشناس کروایا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو شاید میں کسی ذہنی مریض کی صورت اختیار کر جاتا اور اسی عالم میں مر بھی جاتا۔ اُنہی کی تحریک پر میں نے نوکری کرنے کا ارادہ بھی کیا تھا حالانکہ اماں نوکری سے پہلے ہی میری شادی کر دینا چاہتی تھیں کیونکہ میں انہیں کلونت کور کے بارے میں ایک ایک بات بتا چکا تھا۔ ضامن بھائی، خان صاحب، شوکی شٹو ڈنٹ، حنیفا پہلوان اور منشی ہجرؔ جیسے لوگ شاید سرحد کے پار بھی ہوں گے لیکن مجھے ان کا علم نہیں ہے۔ میں تو سرحد کے اس پار کے اُن زخم خوردہ لوگوں کی بات کر سکتا ہوں جو چاہتے تو ایک بے قصور اور بے گناہ سکھ سے، خود پر ہونے والے مظالم کا بھرپور بدلہ لے سکتے تھے لیکن اُنہوں اُسے مذہب کی نہیں، انسانیت کی عینک سے دیکھا تھا۔

یہ اُنہی دنوں میں سے ایک دن کی بات ہے۔

میں رمضان عرف جانی نائی کی دکان میں بیٹھا ''ضرورت ہے'' والے اشتہارات پڑھ رہا تھا تب ضامن بھائی کے سامنے جانی نے حلفیہ بیان دیا تھا اور اپنے سب سے چھوٹے لڑکے کی قسم بھی کھائی تھی مگر ضامن بھائی نے اس لیے یقین نہیں کیا تھا کہ جانی کا سب سے چھوٹا لڑکا پیدائشی پاگل تھا اور اُس کے ہونے نہ ہونے سے جانی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ضامن بھائی نے تلخی سے کہا تھا۔

،،سالے تُو دو تین معاملات میں بے اعتبار ثابت ہو چکا ہے۔ میں نہیں مانتا۔ کوئی اور ثبوت دے۔''

جانی نائی چاہتا تھا کہ مسجد میں جا کر قسم کھا لے مگر اُدھر کچھ دنوں سے اُس کے تعلقات مولوی شاکر اللہ سے اس وجہ سے ٹھیک نہیں تھے کہ مولوی صاحب نے اُسے کبھی، حتیٰ کہ عید تک کی نماز تک نہ پڑھنے کی وجہ سے شارع عام زندیق کہا تھا۔ جانی نائی کو اس لفظ کا مطلب پتا نہیں تھا اور اُسے منشی ہجرؔ سے پوچھنا پڑا تھا۔ جانی جمعے کے جمعے اُن کا خط بنانے جایا کرتا تھا۔ اُنہیں بھی اس لفظ کے درست معنی پتا نہیں تھے اور وہ چونکہ محلے کی ایک پڑھی لکھی شخصیت سمجھے جاتے تھے اور اس تاثر کو آخری عمر میں بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے، لہٰذا اُنہوں نے زندیق کے اٹکل سے جو معنی بتائے، وہ جانی کے دل میں ترازو ہو گئے اور اُسے مولوی صاحب سے گلہ پیدا ہو گیا کیونکہ اُس میں وہ پنج حرفی عیب ہرگز نہیں تھا جس کے معنی اُسے منشی جی نے بتلائے اور آنکھ بھی ماری تھی۔

ضامن بھائی بھی کچھ ایسے غلط نہیں تھے۔ جانی نے محض سنی سنائی کی بنیاد پر اُنہیں معراج الدین کلرک اور خوشی محمد دھوبی کی بہو کا قصہ سنا دیا تھا اور ضامن بھائی نے جانی نائی پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کر لیا

تھا لیکن کچھ دنوں بعد علم ہوا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور معراج الدین کلرک، خوشی محمد کے خاندان کی کسی لڑکی کی شادی اپنے کسی ساتھی کلرک سے کروانے کے سلسلے میں خوشی محمد کے گھر وقت بے وقت آیا جایا کرتا تھا۔ تو اس وقت جو جانی نائی نے ضامن بھائی کو یہ اطلاع دی تھی کہ سلطان حلوائی کا کالج میں پڑھنے والا بیٹا اصغر، فتح خان ٹھیکیدار کی پوتی سلطانہ سے کچھ سلسلہ جنبانی کر رہا تھا، تو ضامن بھائی کو یقین نہ آیا۔

،،سالے جانتا ہے اگر یہ بات جھوٹ ثابت ہوئی تو اسی اُسترے سے تیری گردن اُتار دوں گا جس سے تو اس وخت میری داڑھی مونڈ رہا ہے۔،،

ضامن بھائی نے اپنے دلی کے لہجے میں کہا۔

پاکستان بنے تین سال ہو گئے تھے اور اتنا ہی عرصہ ضامن بھائی کو اس گلی میں آباد ہوئے بھی ہو چکا تھا لیکن پنجابیوں میں رہنے کے باوجود وہ اپنے ہی لہجے اور ڈھنگ سے بات کیا کرتے تھے۔ جانی دھوبی ہوشیار پور سے آیا تھا اور وہ کھڑی پنجابی میں بات کرتا تھا لیکن ضامن بھائی کی خاطر اُسے اُردو بولنے کا جبر جھیلنا پڑتا تھا۔ وہ بولا۔

،،تمہیں کیسے یقین آئے گا میری بات کا؟ وہ چھوکرا ہر روز گلی کے کونے پہ سائیکل لیے کھڑا ہوتا ہے اور جب وہ چھوکری تانگے میں بیٹھ جاتی ہے تو اُس کے پیچھے پیچھے سائیکل چلاتا اُس کے کالج تک جاتا ہے۔،،

ضامن بھائی نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔ آج جانی نے ،،کھونٹی،، اچھی طرح نہیں نکالی تھی۔ وہ چڑ کر بولے۔

،،سالے یہ چھوکرا اور چھوکری ہماری دلی میں اشرافوں کی زبان نئیں سمجھی جاتی۔ لمڈا، لمڈ یا نئیں کہہ سکتا؟،، پھر اس سرزنش کو ناکافی سمجھا اور جانی نائی کے پیشے میں فی نکالنے کو بولے۔

،،ابے اٹھنی پوری لیتا ہے سالے۔ اور یہ بال چھوڑ دیئے حرام خور؟،،

جانی جو ضامن بھائی کا چہرہ تولیہ سے صاف کر کے اُس پہ تبت سنو لگانے کی تیاری کر رہا تھا، چٹکی لیے بغیر نہ رہ سکا اور بولا۔

،،یہ بال نہیں ہیں ضامن بھائی۔ یہ تمہاری عمر کا احساس ہے جو تمہیں چبھ رہا ہے۔،،

ضامن بھائی نے گدلے آئینے میں یہ بات کرتے ہوئے جانی نائی کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اچھی طرح نہ دیکھ سکے اور تڑخ کر بولے۔

،،سالے ہم سے جملے بازی کر رہا ہے؟ ابے دلی والوں کے منہ لگ رہا ہے؟ ابے چُپکا اپنا کام کیا کر نئیں تو کسی روز کوئی ایسی چپکا دوں گا کہ جوزہ محترمہ کے سامنے کوئی جگہ مسلتا واجائے گا۔ سمجھا؟،،

جانی نائی کو یہ جان کر انتہائی خوشی ہوئی کہ اُس کا تیر نشانے پہ بیٹھا تھا اور اُس نے ضامن بھائی جیسی زہر آلود زبان والے پہ کم از کم ایک ایسا وار کر دیا تھا جس سے وہ تلملا گئے تھے۔ ضامن بھائی کو غصے کے باوجود یہ نیم فلمی قسم کا جملہ جانی نائی سے سن کر حیرت بھی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے جانی کی کرسی سے اُٹھ کر قمیص جھاڑ کر پہنتے ہوئے کہا۔

،،ابے تو نے اتی گہری بات کاں سونچ لی مردود؟،،

جانی جانتا تھا کہ ضامن بھائی منشی ہجر کو زیادہ پسند نہیں کرتے چنانچہ اُس نے کہا۔

،،منشی جی کا خط بنانے گیا تھا۔ وہ کسی ایکٹر سے کہہ رہے تھے۔،،

ضامن بھائی نے اٹھنی جیب سے نکال کر آئینے کے قریب پھینکی جو گول ہونے کی وجہ سے لڑھک کر آناً فاناً نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

دونوں آدمیوں کا ردعمل یکساں تھا۔ دونوں بیک وقت جھکے اور اٹھنی تلاش کرنے لگے جو پہلی کوشش میں نہیں ملی۔ جانی نے تلخی سے کہا۔

،،تمہیں دس دفعہ کہا ہے کہ پیسے میرے ہاتھ میں دیا کرو۔،،

اب ضامن بھائی کی باری تھی۔ وہ سیدھے کھڑے ہوئے اور بولے۔

،،ابے بزرگوں کے کہے پہ عمل کر رہے ہیں۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے کہ رنڈی اور نائی کو پیسہ ہمیشہ پھینک کے دینا چاہئے ورنہ سالے سر پہ سوار ہو جاتے ہیں۔،،

جانی نائی کو اُسی وقت کونے میں پڑی اٹھنی مل گئی جس کی خوشی میں وہ ضامن بھائی کو جواب دینا بھول گیا۔ ضامن بھائی نے چلتے چلتے اور جیسے اچانک کوئی خیال آ جانے پر رک کر پوچھا۔

،،تو میں تیری بات کا یقین کر لوں؟ دیکھ بے اگر تو نے مجھے اس دفعہ جھوٹا بنایا نا تو قسم پروردگار کی تیرا یہ بُھٹا سا سر تلوار کے ایک ہی وار سے یوں کر کے اُڑا دوں گا اور پھر چاہے پھانسی ہی ہو جائے۔،،

اُنہوں نے چٹکی بجا کر کہا۔

جانی نائی ہنسا۔

،،وہ تو ہو ہی جائے گی ضامن بھائی۔ مزاخ تھوڑے ہی ہے۔ اسلامی ملک ہے ہمارا۔،،

بس یہی ضامن بھائی کی چڑ تھی۔ کسی نے پاکستان کو اسلامی ملک کہا نہیں کہ اُن کا ناریل تڑخا نہیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ وہ اس وقت گدلے آئینے کے سامنے اپنی ٹھوڑی اُٹھا اُٹھا کر پتا نہیں کیا دیکھ رہے تھے۔ اس بات پہ چونک کر پلٹے اور بولے۔

''سالے تُو بھی لیڈرانِ کراموں کی طریوں بول ریا ہے؟ آئیں؟ ابے کونسا اسلامی ملک؟ کیسا اسلامی ملک؟ میرے سامنے زیادہ بک بک مت کریو۔ بتائے دے ریا ہوں۔''

جانی نائی جو ناریل کی کراچی سے منگوائی ہوئی جھاڑو سے دکان کی صفائی شروع کر چکا تھا، بیٹھے بیٹھے ہاتھ روک کر بولا۔

''ناں۔ تو کیا ہمارا ملک اسلامی نئیں؟ تم بھی اُس ماں۔۔۔۔ شوکی شٹوڈنٹ کی طرح بول رئے ہو اس ٹیم۔ چلو اُس کا بولنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ اُس کے دل میں تو اللہ رسول کا ڈر بھی نہیں ہے۔ کافر ہے بلکہ ایک اور برا سا لفظ بھی ہے اس کے لیے۔''

جانی رکا تو ضامن بھائی نے فوراً لقمہ دیا۔

''ہاں ہاں۔ دہریہ کہتے ہیں اُسے۔ ابے تم لوگوں کی اُردو اِتی خراب کیوں ہے؟ حالانکہ دلی سالی لاہور کے پڑوس میں بس رئی ہے؟''

جانی نائی کو اس کی پروا نہیں تھی کہ اُس کی اُردو کیسی تھی اور دلی کہاں واقع تھی اس لیے اُس نے اس پر کوئی دھیان دیئے بغیر کہا۔

''ہاں وہی۔ تم ہر ٹیم پاکستان کو کیوں کوستے رہتے ہو؟ بڑے شرم کی بات ہے یار۔''

ضامن بھائی برصغیر کے اُن کروڑوں سیدھے سادہ مسلمانوں میں سے تھے جو واہگہ کے پار جنت کی تلاش میں آئے تھے اور ایسی کسی جنت کے نہ ملنے سے مایوس تو ہوئے ہی تھے ایک قسم کی مسلسل تلخی کا بھی شکار تھے۔ وہ بولے۔

''ابے شرم کس بات کی؟ میں تو ڈنکے کی چوٹ گے ریا ہوں۔ ابے ہمیں تو پاکستان آنے کی ضرورت ہی نئیں تھی۔ قاضی حوض والے بزار میں اپنا اچھا خاصا کاروبار چل ریا تھا۔ مگر ہمارے دادا نئیں مانے اور بولے۔ میں نئیں رہنے کا ان کافروں میں اب۔ جناح صاب نے ہم مسلمانوں کے لیے الگ وطن بنا دیا ہے۔ جس سالے کو چلنا ہو چلے نئیں تو میں اکیلا ہی جا ریا ہوں۔ بس ابا مجبور ہو گئے۔ ہمارے دلی والے گھر میں ہمارے چچا ابھی تک موجیں کر رئے ہیں۔ ابے گھر کیا تھا حویلی تھی حویلی۔ بزرگوں نے غدر سے پہلے بنوائی تھی۔ مگر سالے کشٹوڈین والوں نے آدھی سے زیادہ لاہور کے کسی سکھ کے خاندان کو الاٹ کر دی۔ کہنے لگے کہ جب وہ مالک پاکستان چلے گئے تو اب اُن کا کیا حق ہے اس حصے پہ؟ جہاں ہمارے بزرگ غالبؔ اور میرؔ کے شعر پڑھا کرتے تھے اب وہاں سارا دن جلندھر سنگھ بیوی بیٹیوں کو پنجابی کی وہ گالیں بکتے ہیں جن سے اُن کے خاندان کا رنڈیوں کے خاندان سے رشتہ ثابت ہوتا ہے۔''

جانی نائی نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔

''ضامن بھائی معاف کرنا۔ جو بھی اُدھر سے آتا ہے یہی کہتا ہے کہ وہ حویلی میں رہتا تھا۔ محل میں رہتا تھا۔ جگیریں تھی بڑی بڑی۔ وہ پودینے کے باغوں والی بات تم لوگوں کی وجہ سے ہی نکلی ہے۔''

ضامن بھائی پھر بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگا کے بولے۔

''قسم پروردگار کی سچ کے ریا ہوں۔ ذرا حالات ٹھیک ہو لیں۔ تجھے ساتھ لے چلوں گا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیو۔''

ضامن بھائی کے لہجے میں پتا نہیں کیا بات تھی کہ جانی نائی کو اُن کی بات کا یقین آ گیا اور وہ بیڑی سلگا کر بولا۔

''سچ کہتے ہو یار۔ ہزار برس سے بندہ جس جگہ رہ رہا ہو، وہاں حویلی نہ سہی جھونپڑی سہی، ہوتی اپنی ہے۔ ہمارے اپنے گاؤں محمد نگر، ضلع ہوشیار پور، تحصیل بچووالی، دلیر سنگھ آڑھتی کو مل کر نواب دین نائی کو ملے، پنجاب، میں ہمارا اپنا پکا گھر تھا۔ ایک نہیں کئی گھر تھے اپنی ''بلادری'' کے۔''

جانی نائی جب کسی کو اپنا وطن مالوف بتاتا تھا تو وہ پورا پتا بھی بتایا کرتا تھا جو اُس کا گاؤں چھوڑ کر ہمیشہ کو بمبئی میں آباد ہونے والا چچا گاؤں بھیجے جانے والے لفافے پہ لکھا کرتا تھا۔ پھر وہ ایک طویل کش لے کر بولا۔

''ویسے یار کچھ بھی کہہ لو۔ لاہور ہمارے گاؤں کے سامنے کچھ بھی نئیں۔ یہ موسم ہوتا تھا جب گندم کی کٹائی کر کے لوگ فارغ ہو جاتے تھے۔ اب شروع ہوتا تھا شادیوں کا موسم۔ یہ موسم ہمارے لیے بڑی بہاریں لاتا تھا۔ ہر روز کسی نہ کسی شادی کا بلاوا دینے جاتے تھے ہم لوگ۔ ابا اُدھر جا رہا ہے، میں اُدھر جا رہا ہوں، بھائی کدھر جا رہا ہے۔ ہندو، سکھ، مسلمان سبھی ایک ہی ٹیم پہ شادیاں کرتے تھے بچوں کی کیونکہ سبھی زمیندار تھے اور ہماری موجیں لگ جاتی تھیں۔ مسلمانوں کا تو کھانا بھی ابا اور چھوٹا چاچا پکایا کرتے تھے۔ ہندو اور سکھ اپنے رسوئیے شہر سے بلواتے تھے۔ کیا دن تھے یار ضامن بھائی، ہے نا؟''

چند لمحوں تک دکان میں خاموشی رہی۔ دونوں شاید اپنی اپنی گم گشتہ جنتوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ حنیفا پہلوان دھوتی کے دونوں ''لڑ'' دکان کے سامنے گزشتہ رات کی بارش کے کھڑے پانی سے بچا تا دکان میں داخل ہوا تو ضامن بھائی اُٹھ کھڑے ہوئے اور فوراً ہی دکان سے نکل گئے۔ جانی نائی نے نیا تولیہ نکال کر شیو کے ارادے سے پہلے ہی سے کرسی پر بیٹھے حنیفے کے شانوں پر ڈالا اور بولا۔

''بال بھی بڑھ گئے ہیں پہلوان جی۔ اُسترا کہ باریک مشین؟''

پھر وہ میری طرف دیکھ کر چونکا اور بولا۔

''باؤ داڑھی منڈوانی ہے یا اخبار پڑھنے آئے تھے؟''

گلی میں کل بہتر گھر تھے۔ اکثر گھروں کے نیچے دکانیں تھیں اور ان میں پانچ سال پہلے تک ہندو اور سکھ آباد تھے۔ جن گھروں کے نیچے دکانیں نہیں تھیں وہ خود بخود مسلمانوں کے تصور کیے جاتے تھے اور تھے۔ تقسیم سے پہلے گلی میں بمشکل دس بارہ گھر مسلمانوں کے ہوں گے لیکن اب سو فیصد آبادی مسلمانوں کی تھی۔ اب وہی گھر ویران پڑے ہوئے تھے جنہیں فسادات کے دوران آگ لگا دی گئی تھی اور ابھی تک محکمہ بحالیات نے کسی کو الاٹ نہیں کیے تھے۔ زیادہ تر گھروں میں مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے لوگ آباد تھے۔ کچھ میں دلی والے تھے اور فقط ایک گھر ایسا تھا جس میں لکھنو سے آئے منشی ہجر کا کنبہ رہتا تھا۔

منشی جی دوسرے درجے کے ادیب تھے۔ کہتے تھے کہ اُن کی تحریر کردہ ساری کتب فسادات کے دوران اچانک چھوڑے جانے والے گھر میں رہ گئی تھیں۔ حالانکہ کبھی وہ یہ بھی کہتے تھے کہ میاں ہم تو اطمینان سے تنکا تنکا جمع کر کے اپنے یار شریف خاں پٹھان کے ٹرک پہ بیٹھ کے لاہور میں اُترے تھے۔ زبان بھی خاصی ثقیل بولا کرتے تھے اور یوں محلے والوں پر اُن کا مجموعی تاثر ایک پڑھے لکھے شخص کا سا تھا۔ ویسے اُن کا خیال بھی یہاں مستقل رہنے کا نہیں تھا اور سوچا یہی تھا کہ جب حالات بہتر ہو جائیں گے تو واپس چلے جائیں گے۔ مگر دو وجوہات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُنہیں لکھنؤ والے آبائی گھر کے بدلے لاہور میں جو گھر الاٹ ہوا تھا وہ اُس گھر سے کوئی چھے گنا بڑا تھا اور محلے کے قدیمی باسی بتایا کرتے تھے کہ یہ کسی سیٹھ لچھومل کا گھر تھا جس کی سبزی کی آڑھت ملتان سے پنڈی تک پھیلی ہوئی تھی۔ لچھو مل پیشگی رقم دے کر کسانوں سے سبزی خرید لیا کرتا تھا اور پھر من چاہے نرخوں فروخت کیا کرتا تھا۔ میں یہ دھندہ سمجھتا تھا تو اُس کا اتنا بڑا گھر بنانا میری سمجھ میں بہ آسانی آتا تھا۔ اُس کا ایک بھائی دلی میں یہی کاروبار کیا کرتا تھا۔ لچھومل ایک سمجھدار آدمی تھا چنانچہ لاہور میں پہلا فساد پھوٹتے ہی وہ اپنا گھر ٹھیکیدار فتح خان کے سپرد کر کے دلی روانہ ہو گیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ جیسے ہی حالات بہتر ہوں گے وہ واپس آ جائے گا۔ اُس زمانے میں پاکستان کے بارے میں یہی خیال تھا کہ یہ ملک دو چار سال میں پھر ہندوستان کا حصہ بن جائے گا، چنانچہ بہت سوں نے یہی کیا تھا لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ ٹھیکیدار فتح خان نے بعد میں یہ گھر بحالیات والوں کے سپرد کر دیا تھا جس کے کارپردازوں نے لچھومل کے بھرے ہوئے گھر سے چن چن کر قیمتی سامان غائب کر کے وہ گھر منشی ہجر کو الاٹ کر دیا تھا۔ منشی جی گھر کی نچلی منزل میں رہتے تھے۔ اُن سے لوگوں نے بہت کہا کہ اُوپر کی منزل کرائے پر اُٹھا دیں لیکن وہ نہ مانے۔ جوان بیٹی کے باپ تھے اور کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔

منشی ہجر قلم کے مزدور تھے۔ غیر منقسم ہندوستان میں تھیٹر کے لیے لکھے گئے کھیلوں پر نظر ثانی کیا کرتے تھے۔ اللہ جانے سچ تھا یا جھوٹ آغا حشر کو اپنا اُستاد بھی کہتے تھے۔ لاہور میں وہ ماحول تو نہیں تھا البتہ کچھ کچھ فلمیں بننا شروع ہو گئی تھیں چنانچہ وہ فلموں کے مکالمے لکھنے لگے۔ اُن کے مکالموں میں فلمی ضروریات کے سارے مسالے وافر پائے جاتے تھے اور دو چار مکالمے بھی زبان زد عام ہو چکے تھے چنانچہ منشی جی مالی طور پر آسودہ تھے۔

منشی جی کے گھر سے تقریباً متصل گھر ضامن بھائی کا تھا۔ ضامن بھائی کے والد اور دادا کا انتقال تین دن کے وقفے سے ہوا تھا اور ضامن بھائی اسی واسطے خود کو فخریہ ڈبل یتیم کہا کرتے تھے۔ دلی میں اُن کے دادا کا جست کے برتن بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ تھا جس کا بنا مال اُن کے والد قاضی حوض والی دکان میں فروخت کیا کرتے تھے۔ بولی ٹھولی بھی وہی دلی والی تھی چنانچہ ضامن بھائی بھی وہی زبان بولا کرتے تھے اور پنجابیوں کے مذاق کا نشانہ بنتے تھے۔

ضامن بھائی اپنے الاٹ شدہ گھر میں بوڑھی ماں، دادی اور چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ گھر کے علاوہ اُنہوں نے بھاگ دوڑ کر کے ایک پرانا دھرانا سا کارخانہ بھی الاٹ کروا لیا تھا جس میں تقسیم سے پہلے کوئی سکھ لوہے کا سامان بنایا کرتا تھا۔ کارخانے کی عمارت بے شک ضامن بھائی کی اپنی تھی مگر وہ اس میں لوہاروں والا کام دو وجوہات کی بنا پر شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُن کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا اور دوسری یہ کہ وہ اپنے خاندان پہ ''لوہار'' کا ٹھپہ نہیں لگانا چاہتے تھے۔ وہ اکثر تلخی سے کہتے۔

''ابے ہم سالے کوئی لوہار ہیں؟ ہم کرخندار ہیں بھائی۔''

پھر وہ اعتراض کرنے والوں کو بتاتے کہ دلی میں کنجڑا، قصائی، بزاز، نائی، بہشتی ہر پیشے سے منسلک لوگوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ناموں کی طرح لوہار بھی ایک پیشہ ہے اور وہ اس پیشے کا دم چھلا اپنے نام کے ساتھ کبھی نہیں لگائیں گے۔ وہ تڑخ کر کہتے۔

''صاب عجب پایا آپ کا پاکستان۔ سالا پٹھان سبزی کی دکان کھولے بیٹھا ہے اور سید زیورات کی دکان کر رہا ہے۔ نہ بھائی، ہم تو کرخندار تھے اور رہیں گے اور جب بھی کھولا برتن بنانے کا کارخانہ ہی کھولیں گے۔ کیوں بے مجو؟''

مجو کا اصل نام شاید مظہر رہا ہوگا اور وہ ضامن بھائی کے ساتھ ہی پاکستان آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ دلی والے کارخانے میں چھوٹا موٹا کاریگر تھا اور لاہور میں اپنے ڈھب کا کام تلاش کر رہا تھا۔ مجو ضامن بھائی

کے گھر کی بیٹھک میں رہتا تھا اور ایک طرح سے خاندان کا فرد ہی تصور ہوتا تھا۔

ضامن بھائی زبان اور کانوں کے بلا کے تیز تھے۔ زبان تو زہر اگلتی ہی تھی، قدرت نے کانوں کو بھی یہ خوبی دے رکھی تھی کہ بیس پچیس فٹ دور کھڑے آدمیوں کی بات سن لیتے تھے اور وہیں سے کھڑے کھڑے بلند آواز میں جواب بھی دے دیا کرتے تھے۔ اُنہیں پنجابیوں سے من جملہ دیگر شکایات کے ایک شکایت یہ بھی تھی کہ سالوں کی گالی بے ربط ہوتی ہے۔ وہ تلخی سے کہتے۔

''اماں یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ سبھی کے لیے ایک ہی گالی؟ صرف جنس بدل دیتے ہیں سالے اور ''اعضاء'' کا نام بھی۔ ہماری دلی میں ہر ''جنے'' کے لیے الگ سے گالی ہوتی ہے اور ایسی تیز کہ ایک دفعے تو ہر جگہ مرچیں ہی لگ جاتی ہیں اور ہم دلی والے گالی بھی حسب مراتب کے حساب سے دیتے ہیں۔ یہ کیا کہ ایک دم ہی ماں کی گالی دے دی؟ ابے اس سے پہلے بھی تو کوئی رشتہ ہوتا ہوگا؟''

پھر وہ گالی کے حوالے سے اپنے علم البلاغت کو کام میں لا کر وہ وہ نکتے بیان کرتے کہ گالی دینے والا خود کو چغد محسوس کرنے لگتا اور کھانے والا ہنستا مسکراتا گھر چلا جاتا۔

اس محلے میں ایک شخص جس سے تقریباً ہی نالاں تھے وہ تھا شوکی شٹو ڈنٹ۔ نام تھا شوکت اللہ اور پیار سے بگڑ کر شوکی کر دیا گیا تھا۔ شوکی، بقول اُس کی ماں کے، سولہویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ چونکہ وہ گلی بلکہ محلے کا واحد کالج جانے والا طالب علم تھا اس واسطے اُس کے نام کے ساتھ شٹو ڈنٹ کا دم چھلا لگا ہوا تھا۔ شوکی لمبے بالوں والا لڑکا تھا۔ آنکھیں نیم وا رکھتا اور قینچی کے سگریٹ پیا کرتا تھا۔ ایک ہفتے بعد کپڑے تبدیل کرتا اور مذہب کے خلاف تھا۔ یہ ایک ایسا قصور تھا جو نا قابل معافی تھا لیکن وہ زمانہ برداشت اور دلیل کا تھا اس لیے لوگ اُس سے مذہبی بحثیں ضرور کرتے لیکن ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے شوکی کا سر پھاڑنے کی کوشش کی ہو یا رات کو ہاکی بردار حضرات اُٹنگی شلواریں پہنے، ڈاڑھے پھٹکارتے اُس کا دماغ درست کرنے اُس کے گھر پہ گئے ہوں۔ شوکی دولت کی نامنصفانہ تقسیم کے خلاف تھا اور سنا تھا کہ یونیورسٹی میں بھی اس نوعیت کی تقریریں کیا کرتا تھا۔ میں محلے کی مسجد میں جمعے کی نماز پڑھنے جاتا تو شوکی کی کھلے دروازوں والی بیٹھک کے سامنے سے گزرا کرتا اور اُس کو عین نماز کے وقت ملاقاتی سے باتیں کرتے یا کوئی کتاب پڑھتے دیکھا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اُس نے مجھے راستے میں روک کر پوچھا تھا۔

''تم اچھے خاصے سمجھدار آدمی لگتے ہو۔ تمہیں نماز روزے کی عادت کیسے پڑ گئی؟''

میری اور شوکی کی عمروں میں دو چار سال کا فرق رہا ہوگا۔ وہ مجھ سے بڑا تھا یا کم از کم دِکھتا تھا۔ لیکن اُس کی شخصیت میں ایک عجیب سا متاثر کر دینے والا احساس دور سے نظر آتا تھا اور مجھے اُس کے

سامنے ہمیشہ ایک احساس کمتری رہتا تھا چنانچہ اُس کی بات اچھی نہ لگنے کے باوجود میں اُسے کوئی جواب نہ دے سکا لیکن میں نے اتنا ضرور کہا۔

''نماز پڑھنا کوئی بری بات ہے شوکی بھائی؟''

شوکی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور دلاور کے ہوٹل کی گلی تک بچھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بٹھا کر بولا۔

''مجھے سوال کرنے والے لوگ بہت پسند ہیں۔ تم نماز کیوں پڑھتے ہو؟''

میرے ذہن میں اس سوال کے بہت سے جوابات لہرا کے رہ گئے لیکن میں کوئی ایسا جواب دینا چاہتا تھا جس سے اس منکر کی زبان ہمیشہ کو بند ہو جاتی۔ اُس روز مجھ پہ آشکار ہوا کہ میرے پاس سوائے اس جواب کے اور کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ اللہ میاں کا حکم ہے۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی اس جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ شوکی جو اشارے سے ویٹر کو بلوا کر اس دوران چائے منگوا چکا تھا، پرچ میں ایک ہی دفعہ میں آدھی سے زیادہ پیالی اُنڈیل کر بولا۔

''یہ مولویوں والا جواب ہے۔ مجھے تمہارے جواب کا انتظار ہے۔''

میں نے کہا۔

''اس لیے پڑھتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔''

لگتا تھا میرے جواب سے شوکی کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے قینچی کے دو سگریٹ ایک ساتھ سلگائے اور ایک مجھے دیتے ہوئے بولا۔

''ہوں۔ لیکن میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مسلمان کیوں ہو؟ ایک آدمی بقائمی ہوش وحواس کسی بھی مذہب کو کیسے مان سکتا ہے؟''

یہ بہت مشکل سوال تھا۔ میرے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا جو میں نے فوراً ہی دے دیا۔

''شوکی بھائی۔ میرے باپ دادا سبھی مسلمان تھے اس لیے میں مسلمان ہوں اور معاف کیجیے میں اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔''

شوکی نے ایک طویل کش لیا اور اپنی نیم وا آنکھوں سے مجھے قدرے غور سے دیکھا اور پھر ہنس کر بولا۔

''مجھے سالا ایک بھی ایسا مسلمان آج تک نہیں ملا جس نے اپنی عقل کو استعمال کر کے مجھے جواب دیا ہو۔ بہرحال تم اچھے آدمی ہو اور تمہیں مسجد جاتا دیکھ کر مجھے عجیب سے لگا تھا اس لیے میں نے یہ بات پوچھ لی۔''

مجھے غصہ آ گیا اور میں نے کہا۔

''آپ کے خیال میں مسجد جانے والے لوگ اچھے نہیں ہوتے؟''

شوکی پھر مسکرایا اور بولا۔

''میں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں یار۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ خیر دفع کرو۔ ویسے تم نے کبھی غور کیا کہ اس دنیا میں آج جتنے بھی جھگڑے دکھائی دے رہے ہیں ان سب کی بنیاد مذہب ہی ہے۔ دُور کیوں جاتے ہو۔ یہ سالے ہندوستان کے دو ٹکڑے بھی تو تمہارے مذہب ہی نے کروائے ہیں۔ دیکھو میں صرف تمہارے مذہب کو نہیں کہہ رہا۔ کسی بھی مذہب کو لے لو۔ پتا نہیں مذہب ایجاد کرنے والوں نے یہ سب کیوں نہیں سوچا؟ تم نے کبھی غور کیا اس بات پر؟''

میرے لیے یہ بھی ایک اطلاع تھی کہ مذہب کسی نے ''ایجاد'' کیا تھا۔ میں نے کہا۔

''مذہب ایجاد کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ہر مذہب اللہ میاں نے اس دنیا میں بھیجا ہے۔''

شوکی ہنسا۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر میرا شانہ تھپتھپایا اور بولا۔

''اگر اللہ میاں ہی اس سارے کھیل کے پیچھے ہیں تو وہ بار بار مذاہب دنیا میں کیوں بھیجتے رہے؟ ایک ہی مذہب شروع میں بھیج دیتے، اللہ اللہ خیر سلا۔ معاف کرنا یار۔ یہ تو انسانوں کو آپس میں لڑوانے والی بات ہوئی۔ ہوئی یا نہیں؟''

اُس وقت میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اس لیے میں نے کہا۔

''مجھے نہیں پتا۔ یہ سب اللہ میاں کے کام ہیں۔ ہمیں یہ سب باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔''

شوکی کھڑا ہوا اور سگریٹ کا آخری کش لگا کر اُسے نالی میں پھینک کر بولا۔

''تمہارا مذہب غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور تم اس سے انکار کر رہے ہو؟ کیسے مسلمان ہو یار؟''

شاید اُسے مجھ سے کسی جواب کی توقع ہی نہیں تھی۔ وہ تیز قدموں سے وہاں سے چلا گیا۔

رات کو کھانے کے بعد جب ابا جی حقہ سنبھال کر صحن میں بیٹھے اور میرا ماموں جو ہم سے تین چار گلیاں چھوڑ کر رہتا تھا اور بیرون بھاٹی گیٹ، اپنا پرانا کام چھوڑ کر آلو چھولے اور نان بیچنے لگا تھا اور خاصا خوشحال بھی تھا، ابا سے ملنے آیا تو میں نے ابا کو بتایا کہ شوکی شٹو ڈنٹ نے آج میرے سامنے کیسے سوالات اُٹھائے تھے؟ اماں نے دونوں مردوں کو چائے دیتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے اور بولیں۔

''توبہ کر پُتر۔ ایسے لوگوں کو منہ ہی نہ لگایا کر۔''

میرا ماموں جس کا نان چھولوں کا کاروبار لاہور آتے ہی اتنی ترقی کر گیا تھا کہ وہ اب ہوٹل کھولنے کا منصوبہ بنا رہا تھا، نفرت سے بولا۔

''آپاں جی۔ انہی لوگوں نے اس پاکستان کا بیڑہ غرق کرنا ہے ایک دن۔''

پھر وہ میرے ابا جی سے اپنی چھیڑی ہوئی گفتگو کا بقیہ حصہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بھائی جی کیا خیال ہے پھر؟ پچیس سو رشوت مانگتا ہے انسپکٹر، دے دوں؟ جگہ بڑی اعلیٰ ہے۔ پہلے ہوٹل ہی ہوا کرتا تھا وہاں کسی ہندو کا۔ اور سنا ہے مسلمان اُس میں گھس نہیں سکتے تھے۔ پکا جن سنگھی تھا۔''

ابا جی نے ایک گہرا کش لگایا اور بولے۔

''مگر یار اُس کرنال والے بندے کا کیا ہوگا؟ سنا ہے وہ بھی بڑا زور لگا رہا ہے۔ کوئی بتا رہا تھا اُس کا بھی ہوٹل کا کاروبار تھا وہاں۔ ویسے حق تو اُسی کا بنتا ہے، ہے نا؟''

ماموں نے سگریٹ کی ڈبیہ جیب سے نکالی اور جب وہ سگریٹ سلگا رہا تھا تو میں نے اُس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک دیکھی جسے میں کوئی نام کم از کم اُس وقت تو نہ دے سکا۔ پھر وہ بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بھائی جی مگر اُس کے پاس دھیلہ نہیں۔ شاد باغ میں کسی رشتے دار کے گھر رہتا ہے۔ ویسے انسپکٹر نے اُس سے کہا تھا کہ وہ دو ہزار بھی کر لے تو جگہ اُسے مل سکتی ہے۔ آخر خدا خوفی بھی کوئی چیز ہے۔''

ابا جی نے کچھ دیر سوچا اور پھر بولے۔

''یار ہم بھی مہاجرین ہیں۔ تیرا کام اگر بنتا ہے تو اس میں کیا ہرج ہے؟''

ماموں نے سگریٹ کا ایک زوردار کش لگایا اور بولا۔

''ٹھیک ہے صبح ہی بات کرتا ہوں۔ بس میرے دل کا بوجھ ہٹ گیا۔''

لیکن میرے دل پہ اُس رات جو بوجھ پڑا وہ مجھے آج اتنے برس گزرنے کے باوجود اپنے دل کا ہی ایک حصہ لگتا ہے کیونکہ کہ ماموں کو ہوٹل الاٹ ہونے کے بعد کرنال کے اُس مہاجر نے ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا اور میرے ماموں کو خاصا پریشان بھی کیا تھا۔ وہ ایک دفعہ کسی کے کہنے پر میرے ابا جی سے ملنے بھی آیا تھا۔ میں تو اُس کا حلیہ دیکھ کر کانپ گیا تھا۔ ہمارے اور اُس کے گھر کا فاصلہ کئی میل کا رہا ہوگا اور اُس وقت تانگے والے وہاں تک محض چار آنے سواری لیا کرتے تھے مگر اُس کے پاس وہ چونی تک نہیں تھی اور وہ ہمارے گھر پیدل آیا تھا۔ اُس کی دھوتی میلی اور کرتا دو جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ پگڑی ڈھیلی تھی اور بعد میں پتا چلا تھا کہ اُس کی بیوی بیمار تھی اور تین بچے دو وقت کے فاقے سے تھے۔ ابا جی نے مثالی بے اعتنائی سے کہا تھا۔

''میرا اس قصے سے کوئی واسطہ نہیں ہے یار۔ ٹھیک ہے احمد دین میرا سالا ہے پر میرا اُس پہ زور تو نہیں چلتا نا۔ اور پھر تمہیں پتا ہے اس پاکستان میں کوئی کام رشوت کے بغیر نہیں ہوتا۔ مجھے معاف کرو۔''

پتا نہیں کرنال کے اُس مہاجر نے ابا جی اور ماموں کو معاف کیا تھا یا نہیں لیکن میں اُس وقت جانی نائی کی دکان پر بیٹھا تھا جب میں نے کرنال کے اُس مہاجر کو اپنے گھر سے نکلتے اور گلی میں چلتے دیکھا تھا۔ وہ یوں جھک کر چل رہا تھا جیسے میرے باپ نے اُس کی کمر پر زوردار لات رسید کر کے اُس کی کمر ہی توڑ دی ہو۔

اس بار جانی نائی کی بات بالکل دُرست نکلی۔ سلطان حلوائی کا بیٹا اصغر واقعی ٹھیکیدار فتح خان کی پوتی سلطانہ سے عشق کر رہا تھا۔ ایک دن ضامن بھائی نے دونوں کو پبلک پارک میں ایک ساتھ یوں بیٹھے دیکھا کہ بقول ضامن بھائی ''سالوں کا گھٹنے سے گھٹنا چھل رہا تھا''۔ کچھ بھی تھا، ضامن بھائی زبان کے کیسے بھی تھے مگر اُن کا دل بہت گہرا تھا۔ اُتنا ہی گہرا جس گہرائی کی بات کوئی بزرگ شاعر سمندروں کے حوالے سے کر چکے ہیں مگر ضامن بھائی، سلطان حلوائی کے لونڈے کو شریف آدمی نہیں سمجھتے تھے کیونکہ یہ اُس کا تیسرا عشق تھا جو اُن کے علم میں آیا تھا۔ وہ رات بھر بقول اُن کے انگاروں پہ رکھی سیخ کی طرح بھنتے رہے اور صبح اُس وقت جبکہ میں ایک اشتہار کے جواب میں ایک جگہ نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلا ہی تھا، اُنہوں نے مجھ روک لیا اور پان کی پیک بے تکلفی سے گلی کی نالی میں تھوک کے بولے۔

''اچھا ہوا میاں تمہیں میں نے گھر سے نکلتے ہی چھاپ لیا۔ رات سے میرا دل قبوتر کی طریوں سینے میں پھڑ پھڑا ریا تھا۔ کسی پل چین قرار نئیں مل ریا تھا وِس کو۔ ذرا آئیو تو میرے سنگ اُس حرامی دلاور کے ہوٹل پہ۔''

سچی

اقبال حسن آزاد

کا

دوسرا

افسانوی مجموعہ

مردم گزیدہ

(۲۰۰۵ء)

بات تو یہ تھی میں انٹرویو کے لیے جانا چاہتا تھا اس لیے میں نے کہا۔

''ضامن بھائی ایسی بھی کوئی ضروری بات ہے۔ میں انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں اور شاید اس جگہ میری نوکری ہو ہی جائے۔ میں بارہ بجے تک لَوٹ آؤں گا۔ یہ بات ہم اُس وقت تک نہیں ٹال سکتے؟''

میری اس بات پہ ضامن بھائی کا ناریل چٹخ گیا اور اُنہوں نے شاید اس خوف سے کہ کہیں میں سائیکل پہ بیٹھ کے ہوا نہ ہو جاؤں، ایک ہاتھ سے ہینڈل مضبوطی سے پکڑا اور بولے۔

''میاں محلے کی لمڈیا کی عزت کے تِکے کرے دے ریا ہے وہ حرام کا جنا اور تمہیں اپنی نوکری کی پڑی وی ہے؟''

اس اصطلاح پر میری ہنسی نکلتے نکلتے رہ گئی لیکن میں نے ضامن بھائی کا سنجیدہ چہرہ دیکھا تو خود پہ قابو پا لیا۔ اُن کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کے سنجیدہ رہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ پتا نہیں کس کے کہنے پہ ضامن بھائی نے کچھ عرصہ سے مونچھیں رکھ لی تھیں اور جیسے ہی وہ سنجیدہ ہوتے تھے مونچھیں نیچے کو لٹک کے اُن کے چہرے پر ایسا تاثر پیدا کر دیتی تھیں کہ ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہر حال میں اُن کے ساتھ دلاور کے ہوٹل کی نالی کے عین اُوپر پڑی ایک کرسی پہ بیٹھ گیا۔ دلاور کے ہوٹل کے اندر ناشتہ کرنے والوں کا ہجوم تھا اور دلاور اپنے دونوں ملازم چھوکروں کو مسلسل گالیوں کے ساتھ گاہکوں کی خدمت مزید مستعدی سے کرنے کے روز کے احکامات جاری کر رہا تھا۔ ایک چھوکرا لپک کے ہمارے پاس بھی آیا مگر ضامن بھائی نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

''ابے ہم ناشتہ کر کے آئے ہیں سالے۔ لکل لے۔ اِدھر کوئی ضروری بات چل رئی ہے۔''

چھوکرے کے جاتے ہی ضامن بھائی نے قینچی کا سگریٹ نکال کر سلگایا اور سگریٹ نوشی کے نقصانات پر کوئی دو تین منٹ کا لیکچر یہ کہتے ہوئے ختم کیا۔

''میں جانتا ہوں تم بھی سگریٹ پیتے ہو مگر میاں میں اپنے ہاتھ سے تمہیں یہ زہر نہیں دینے کا۔ جانتے ہو وِس سالے تماکو کے پیڑ پہ کوئی نر پرندہ بھی خوف کے مارے نہیں بیٹھتا؟ کس واسطے کہ وِس کے بعد وہ اپنی جوزہ محترمہ کے بھی کسی کام کا نئیں رہتا۔''

پھر اُنہوں نے مجھے آنکھ ماری اور مزے سے کش لگانے لگے۔ مجھے جلدی تھی اور میں چاہتا تھا کہ پرندوں کی ناکام عائلی زندگی کا سبب بتانے کے بعد ضامن بھائی جو کہنا چاہ رہے تھے، جلدی سے کہہ دیں۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''ضامن بھائی ایمان سے میں بہت جلدی میں ہوں۔ آپ کسی لڑکی کی بات کر رہے تھے؟''

ضامن بھائی چونکے اور بولے۔

''یہ لو۔ میرے دماغ سے یہ بات تو بالکل ہی نِکل گئی۔ میاں میں کبھی کسی سے نہ کہتا مگر جب وِس محلے میں رہنا ہی پڑ گیا ہے تو وِس محلے کی ماں بھین ہماری بھی ماں بھین ہوئی۔ ابے ہوئی کہ نئیں؟ میرا منہ کیا ٹکر ٹکر تک رئے ہو؟''

میں نے اعتراف کیا تو وہ بولے۔

''یہ سالا سلطان حلوائی کا بیٹا اصغر ایک لمبرا اپنی ماں کا خصم ہے۔ وہ جو تم اُس دن جانی نائی کے دکان میں بیٹھے اخبار رٹ رئے تھے اور جو بات جانی نائی نے کہی تھی۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔'' پھر اُنہوں نے گھٹنے سے گھٹنا چھلنے والی بات دہرائی اور بولے۔

''میں جانتا ہوں وِس حرام کے تخم کو۔ وِس نے لونڈیا کو خوش وختی کے لیے پھانسا ہے اور جیسے ہی مطلب نکلے گا سسری کو گھورے پہ پھینک دے گا۔''

خوش وقتی سمجھنے میں مجھے ذرا وقت لگا۔ بہرحال میں سمجھ گیا۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ سلطان حلوائی کا بیٹا کس قماش کا آدمی تھا۔ لیکن میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ ضامن بھائی مجھ سے کیا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

ضامن بھائی مسکرائے اور میری ٹھوڑی کو چھو کر بولے۔

''میں چاہتا ہوں وِس سالے کو ایسا پھانسوں کہ بس پھڑ پھڑا کے رہ جائے۔ میں تمہاری مدد چاہ ریا تھا وِس سلسلے میں۔''

میں نے مزید حیران ہو کر کہا۔

''لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟''

اس بار ضامن بھائی عیاری سے مسکرائے اور بولے۔

''وہ غیاث پولس والے کا لمڈا تمہارا دوست ہے نا۔ بس اُسی کی مدد سے کچھ علاج کرنا ہے وِس حرامی کا۔''

غیاث الدین انسپکٹر پولیس ہم سے تین گھر چھوڑ کر رہتے تھے اور اُن کا لڑکا جاوید اقبال میرا دوست تھا۔ کھلنڈرا اور دل کا بہت اچھا۔ اُس نے تین سال میٹرک میں فیل ہو کے پڑھائی چھوڑ دی تھی اور آج کل صدر میں منیاری کی دکان کھولے بیٹھا تھا جہاں اُس کا جی بالکل نہیں لگتا تھا۔ اُس نے کسی سے سپین کے بارے میں سن رکھا تھا اس لیے دن رات اُس پر یہی دھن سوار تھی کہ وہ کسی طرح سپین چلا

جائے۔ ہماری اس سلسلے میں لمبی لمبی بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ میں نے کہا۔

''وہ کیا کر سکتا ہے اس سلسلے میں؟ ٹھیک ہے وہ میرا دوست ہے۔ مگر انتہائی نالائق آدمی ہے۔''

ضامن بھائی نے آخری پیک نالی میں تھوکی اور آلودہ لبوں کو کرتے کی آستین سے پونچھ کر بولے۔

''ابے تم اُسے مجھ سے ایک دفعے ملوا کے بس یہ کہہ دو کہ ضامن بھائی جو کام بھی کہیں وہ کر دے۔ بس پھر یار جانیں اور وہ جانے۔ وِس کا باپ پولیس والا ہے تو وِس کی حرامیوں کے محکمے میں پہچان تو ضرور ہی ہوگی۔''

مجھے واقعی دیر ہو رہی تھی اس لیے میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ جاوید کی دکان راستے میں تھی۔ ضامن بھائی میری سائیکل کے کیریر پہ ٹِک گئے حالانکہ میں چاہتا تھا وہ آگے ''ڈنڈے'' پر بیٹھیں مگر اُنہوں یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ سائیکل کے ڈنڈے پہ ہندوستانی فلموں میں لمڈوں کی معشوقیں بیٹھتی ہیں اس لیے میں پیچھے ہی بیٹھوں گا۔ میں بچپن سے سائیکل چلاتا تھا لیکن اُس روز مجھے پتا چلا کہ میں تو بالکل اناڑی تھا۔ ضامن بھائی مجھے مسلسل ہدایات جاری کرنے کے ساتھ ساتھ پورے رستے سائیکل اور ٹانگے والوں کو مطعون کرتے رہے اور ایک آدھ جگہ اُنہوں نے تانگے والوں کی جوابی پنجابی گالی کا جواب محض فحش اشاروں میں بھی دیا کیونکہ وہ ابھی اتنی پنجابی نہیں جانتے تھے کہ ترکی بہ ترکی جواب دے سکتے۔ میں نے ضامن بھائی کو جاوید کے حوالے کیا اور خود انٹرویو دینے چلا گیا اور حسب دستور ناکام لوٹا کیونکہ اُن لوگوں نے کسی ایسے لڑکے کو وہ نوکری دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا جس کا ماموں سن پینتیس سے انتخابات جیتتا چلا آ رہا تھا۔

میں تین دن کے لیے اماں کو لے کر شیخوپورہ چلا گیا کیونکہ ہمارے رشتہ داروں میں سے کوئی حج سے واپس آیا تھا اور اماں خود جا کر مبارکباد دینا ضرور سمجھتی تھیں۔ گلی میں داخل ہوتے ہی میں ششدر رہ گیا۔ گلی یہاں سے وہاں تک رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجی ہوئی تھی اور پانچ سات آدمی بہت تیزی سے پہلے سے لگے شامیانے میں کرسیاں لگا رہے تھے۔ اُن کے عین درمیان، بہت مصروف دکھائی دینے والے ضامن بھائی پاجامے کے پائنچے گھٹنوں تک چڑھائے بھاگ دوڑ کرتے دکھائی دیئے۔ اماں جب گھر میں چلی گئیں تو میں نے ضامن بھائی سے جاننا چاہا کہ گلی کی رونق کا کیا سبب تھا۔ وہ ہنس کے بولے۔

''اماں کچھ نئیں۔ سلطان حلوائی کے بیٹے کی شادی کروا دی ہے وِس لمڈیا سے جسے وہ شہر بھر میں لیے یوں گھوما کرتا تھا جیسے راجکپور وِ سے، جدن بائی کی لمڈیا کو آوارہ فلم میں لیے گھومتا تھا۔''

ضامن بھائی کو نرگس کی بجائے اُس وقت نرگس کی ماں کا نام ہی یاد آ سکا سو اُنہوں نے وہی لے دیا۔

''مگر کیسے؟ یہ سب ہوا کیسے؟ فتح خان ٹھیکیدار نے اپنی پوتی حلوائیوں میں کیسے دے دی؟''

ضامن بھائی مجھے ایک گوشے میں لے گئے اور کرسیوں کے ڈھیر سے دو کرسیاں نکال کے ایک میرے لیے بچھاتے ہوئے بولے۔

''اماں سارا کام وِس نے سیدھا کرایا، تمہارے دوست نے۔''

تب ضامن بھائی نے بتایا کہ کیسے اُنہوں نے لڑکی اور لڑکے کا پیچھا کیا اور اُنہیں ایک جگہ بیٹھے ہوئے رنگے ہاتھوں بذریعہ پولیس پکڑوایا اور رہائی کی شرط یہ رکھی کہ دونوں فوراً نکاح کریں ورنہ جیل جانے کو تیار ہو جائیں۔ وہیں تھانے میں ضامن بھائی کے مہیا کردہ مولوی صاحب نے نکاح پڑھوایا اور تھانیدار بمع دلہا دلہن ٹھیکیدار فتح خان اور سلطان حلوائی سے ملا اور مرتا کیا نہ کرتا والا محاورہ درست ثابت ہو گیا۔ ضامن بھائی ہنسے۔

''اماں ہمارے دادا یونہی نہیں کہا کرتے تھے کہ ہم خاندانی کاریگر ہیں۔ مانتے ہو نا؟''

میرے پاس ماننے کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ رات گئے ولیمے سے نمٹنے کے بعد جب میں اور ضامن بھائی پان کھانے بازار جا رہے تھے تو ضامن بھائی نے مجھے بتایا کہ جس باورچی نے یہ کھانا پکایا تھا وہ دلی سے ہجرت کر کے لاہور آیا تھا اور ''وِس'' کی بیوی کسی کنجڑے کے ساتھ ''لِکل لی'' تھی اور تبھی سے سالا جب بھی کسی کی شادی کا کھانا پکانے جاتا ہے، وِس میں مرچیں حد سے زیادہ جھونک دیتا ہے..... انتقاماً۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں پان کھانے سے پہلے ایک ایک پاؤ قلاقند بھی ضرور کھانا چاہئے۔

''قلاقند؟ وہ کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

ضامن بھائی قدرے تلخی سے بولے۔

''اب تم اِتے بچے بھی نہیں ہو میاں۔ اِتی مرچوں کا توڑ نئیں کرو گے تو صبح بولائے بولائے پھرو گے گھر بھر میں۔''

اُس سال لاہور میں شدت کی سردی پڑی اور بقول ضامن بھائی کے دلی یاد آ گئی۔

''میاں اِتا جاڑا پڑتا تھا کبھی کبھی کہ سالے ہندو دھوتی چھوڑ کے پاجامے پہننے لگتے تھے۔ کس واسطے کہ سرسراتی ہوا اعضائے رئیسہ کو اِتا خفیف کر دیتی ہے کہ آدمی اپنے بارے میں شک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔''

آس پاس بیٹھے بیچارے پنجابیوں پہ اعضائے رئیسہ اُس وقت واضح ہوتے جب ضامن بھائی آنکھ مار کے اپنی بات کی خاموش صراحت کرتے۔ پھر بہار آ گئی۔ لاہور میں بھی اور میری زندگی میں بھی۔ مجھے ایک سرکاری محکمے میں ملازمت مل گئی اور ساتھ ہی ایک چھوٹے سے اخبار میں ہفتہ وار فلمی صفحہ لکھنے کا جز وقتی کام بھی۔ زندگی پہلے سے زیادہ مصروف ہو گئی۔ دن رات کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ میں اس زندگی سے خوش

تھا۔ ہم سبھی مطمئن تھے۔ ضامن بھائی نے ایک دن مجھے بتلایا کہ وہ سن اٹھارہ کی پیدائش تھے۔ میں نے کہا۔

''ضامن بھائی۔ شادی کیوں نہیں کرتے؟ اب تو تم نے اپنا کارخانہ بھی کھول لیا ہے اور مجو کے ساتھ دو چار لڑکے بھی رکھ لیے ہیں۔''

ضامن بھائی نے قینچی کے سگریٹ کا سلگتا ہوا سرا دیکھ کے کہا۔

''یار اُنہوں نے بھی نئیں کری شادی ابھی تک۔ وہ بھی تو بیٹھی وی ہیں ہمارے نام پہ۔''

تب مجھے پہلی مرتبہ پتا چلا کہ ضامن بھائی برسوں سے عشق کا ڈول ڈالے بیٹھے تھے اور اُن کی محبوبہ نے بھی ضامن بھائی کے خاندان کی طرف سے دیئے گئے رشتے سے انکار کے بعد کہیں بھی شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''وہیں دلی میں رہتی ہیں؟''

ضامن بھائی نے نفی میں سر ہلا اور بولے۔

''نئیں یار۔ راولپنڈی میں رہتی ہیں۔ ابا تو اُن کے اُن سالوں نے مار دیئے تھے۔ دونوں بھائی اور اماں کسی طرح راولپنڈی پہنچ گئے تھے۔ بھائی شادی شدہ ہیں۔ راجہ بازار ہے کوئی۔ وہاں برتنوں کی دکان کرتے ہیں۔ وہ پڑھاتی ہیں کسی سکول میں۔''

میں معلومات کا ذریعہ جاننا چاہ رہا تھا جو ضامن بھائی نے خود ہی بتا دیا۔

''وہ جو بڑی بی کبھی کبھی ہماری اماں سے ملنے آتی ہیں نا۔ تمبو برقعے والی۔ ہماری رشتے کی تائی ہیں۔ وہ بھی راولپنڈی میں رہتی ہیں۔ وئی بتاتی ہیں سب کچھ۔ مگر سن بے۔ کسی سے کہیو متی۔ اچھا؟''

پھر ضامن بھائی سر جھکا کے بیٹھے دیر تک سوچا کیے اور بولے۔

''یار وہ بڑی اچھی ہیں۔ ہمارے دادا اور اُن کے دادا کی دکانیں برابر برابر میں تھیں۔ کسی چھوٹی سی بات پہ جھگڑا ہوا تھا۔ وِس کے بعد بات چیت بند ہو گئی بڈھوں میں۔ پھر ہمارے ابا نے یہ دشمنی چلائی اور یہ رشتہ نئیں ہونے دیا۔ اُن کے دادا بھی بڑے طرم خاں تھے۔ ساری دلی میں یہ بات مشہور تھی۔ مرتے وخت بیٹوں نے کلمہ پڑھانے کی کوشش کی تو بولے۔ سالو۔ کلمہ بعد میں پڑھوں گا۔ میرے تیجے اور چالیسویں پہ تنجن کلن باورچی سے پکوائیو اور کہیو سالے گرم مسالے دلدار پنجابی کی دکان سے منگوائے اور گوشت۔۔۔۔ بس یہاں تک کہہ پائے تھے کہ کھٹ سے لِکل لیے۔''

ضامن بھائی نے یہ بات پوری سنجیدگی سے کہی تھی مگر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ضامن بھائی نے مجھے گھورا اور بولے۔

''سالے تم کیسے مسلمان ہو؟ میں کسی کے مرنے کی بات کر رہا ہوں اور تم ٹھی ٹھی کر رہے ہو؟''

میں نے ہنسی ضبط کی اور کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا ضامن بھائی۔ اچھا پھر کیا ہوا؟''

ضامن بھائی تلخی سے بولے۔

''ابے ہونا کیا تھا وہ راولپنڈی میں بیٹھی فرقت کی آگ میں جل رہی ہیں اور میں یہاں تم سالوں کے بیچ پھنسا ہوا روز ایک سے ایک نیا ٹنٹا بھگت رہا ہوں۔''

لیکن نیا ٹنٹا تو اُس روز شروع ہوا جس دن راج سنگھ امرتسر سے واپس لاہور پہنچا۔ (جاری)

◀◀ ● ▶▶

C/o Dr.Rehana Iqbal
Hazara Road
Hasan Abdal
Dist: Attock-47000(Pakistan)

● فلم

● شکور پٹھان

یوسفِ ثانی

تیل میں چپڑے بالوں کی مانگ نکال کر امی نے میری پیشانی پر آئی سب سے نچلی لٹ کو انگلی میں مروڑ کر چاند سا بنایا اور میرا منہ چوم کر بولیں۔ یہ لو میرا ''دِلپ'' تیار ہو گیا۔

دلپ نے بستہ گلے میں لٹکایا، تختی ہاتھ میں پکڑی اور گلی میں منتظر دوسرے چندا، تارے، لاڈلے، راج دلارے لڑکوں کے ساتھ اسکول کی طرف چل دیا۔

اس ''دلپ'' کو لیکن نہیں پتا تھا کہ دلپ کیا چیز ہوتی ہے۔ بس یہ سمجھ آتی تھی جیسے منا، چندا، گڈو اور ببلو وغیرہ ہوتے ہیں ایسا ہی یہ بھی کوئی پیار کا نام ہے۔ ہر ماں کے لیے اس کا لختِ جگر دنیا کا خوبصورت ترین بچہ ہوتا تھا۔ میں جسے محلے اور اسکول کے بچے ''موٹا آلو پلپلا، بہو کو لے کے گر پڑا'' کہہ چڑاتے تھے، امی کے نزدیک ایسا خوبصورت بچہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

تیسری جماعت کے ششماہی امتحان میں فیل ہونے کے بعد اب میں گھر والوں کی طعن و تشنیع کا نشانہ تھا کہ میرے چھوٹے ماموں کی شادی نکل آئی اور امی نے ہم چار بچوں کو سنبھال، ایس ایس دوارکا، میں سفر کرتی، بمبئی کی راہ لی۔ شادی تو شاید دو تین ہفتے بعد ہو گئی لیکن ہم چھ ماہ تک نہ جانے کس کھاتے میں اپنے ننہیالی قصبے ''اورن'' میں ڈیرہ جمائے بیٹھے رہے۔

یہاں چاہے ہندو ہو یا مسلمان، ہر ایک گھر میں خوشی کا جشن ''ریکارڈنگ'' کر کے منایا جاتا۔ میری عمر کے لوگ جانتے ہیں کہ ''ریکارڈنگ'' کیا ہوتی ہے۔ جی ہاں، یہ فلمی گانوں کے ریکارڈ با آواز بلند لاؤڈ اسپیکر پر بجا کر پورے علاقے پر اپنی خوشی مسلط کی جاتی تھی۔ اور یہاں ہر روز کوئی نہ کوئی خوشی ہوتی تھی۔ کسی کی شادی ہے، کہیں لڑکا پیدا ہوا ہے، کسی نے کوئی مقدمہ جیت لیا، اور تو اور ہمارے محلے میں ایک گھر میں سات دن ریکارڈنگ اس خوشی میں ہوتی رہی کہ ان کے بڑے ابا خیر سے حج کر آئے ہیں۔

'اورن' میں ہر روز ہی ریکارڈنگ سنائی دیتی۔ چند نئی فلمیں لگی تھیں جن کے گانے تب کے سنے، مجھے اب تک یاد ہیں۔ ''ڈھونڈو ڈھونڈو رے ساجنا، مورے کان کا بالا''، ''دو ہنسوں کو جوڑا بچھڑ گیو رے،''

''ابتدائے عشق میں ہم ساری رات جاگے، اللہ جانے کیا ہوگا آگے''، ''سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا''، ''تری زلفوں سے جدائی تو نہیں مانگی تھی''، ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے''، ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' میرا نام راجو'' اور یہ ہریالی اور یہ راستہ'' اور ایسے نجانے کتنے گیت تھے جواب تک بول سمیت یاد ہیں کہ یہ رکارڈنگ صبح سے رات گئے تک کانوں میں انڈیلی جاتی تھی۔

اور ایک چھٹی والے دن جب سب گھر والے ایک بڑے کمرے میں جمع تھے اور کہیں ایک عجیب وغریب قسم کے گیت کا ریکارڈ بج رہا تھا ''نین لڑگئی ہے تو منواماں کھٹک ہوئی وے کری۔''

'' دلیپ نے کیا مست کام کیا ہے۔'' یہ میرے سب سے بڑے ماموں کے بیٹے تھے اور سکنڈری اسکول میں پڑھتے تھے۔

''گنگا جمنا بہت ہٹ جارہی ہے۔''

''جس دیش میں گنگا بہتی ہے بھی اچھی چل رہی تھی۔''

''ارے راج کپور سالا کیا بیچتا ہے دلیپ کے سامنے!!''

میں نے یہاں آنے سے پہلے دو فلمیں دیکھ رکھی تھیں جن کا قصہ میں پہلے کہیں سنا چکا ہوں۔لیکن فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔آٹھ سالہ لونڈے کو بھلا ان باتوں کا دماغ کہاں؟۔میری سمجھ میں یہ باتیں کچھ سمجھ آتی اور کچھ سمجھ نہیں بھی آتیں۔

پھر ہم واپس آگئے۔ایک دن چھوٹے چچا ہمارے ہاں رہنے آئے اور امی سے کہہ کر مجھے اپنے ساتھ فلم دکھانے لے گئے۔میں نے بچپن کی ساری فلمیں ان ہی کے ساتھ دیکھیں۔

ہم نے لانڈھی کے ''گلستان'' سنیما میں ''آن'' دیکھی۔یہ تو بہت بعد میں پتا چلا کہ یہ ہندوستان کی شاید پہلی رنگین فلم تھی۔ہم نے اسے بلیک اینڈ وائٹ ہی دیکھا۔

اس فلم میں سرکس کے مسخروں کے پاجامے جیسی پتلون کولانگ شوز میں اڑسے ہوئے اور کمر میں چوڑا سا پٹکا باندھے، اور بینڈ باجا، بجانے والوں کی سی قمیض پہنے ہیرو لیکن ذرا مختلف نظر آیا۔اسکے ماتھے پر ویسی ہی لٹ تھی جیسی امی میرے ماتھے پر بنانے کی کوشش کرتی تھیں۔اس کی شریر سی مسکراہٹ یاد ہے جب وہ فلم کی مغرور شہزادی سے کہتا ہے کہ میں تمہیں ان محلوں سے اٹھا کر جھونپڑوں میں لے جاؤں گا۔پھر گھوڑا گاڑی چلاتے ہوئے ہیرو کا گانا ''دل میں چھپا کے پیار کا طوفان لے چلے'' اور پھر آخری منظر سے کچھ پہلے زبردست تلوار بازی۔مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا۔

لیکن یہ فلم دیکھ لی اور بس۔

پھر سال میں ایک یا دو فلمیں دکھائی جاتیں۔جب ذرا بڑے ہوئے تو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا کون ہیرو نمبر ون ہے اور کون سا دو نمبری۔لیکن اب ہندوستانی فلمیں آنا بند ہو چکی تھیں۔ہم سنتوش، درپن، سدھیر، حبیب، کمال اور رحمان کو دیکھتے تھے۔پھر وحید مراد اور محمد علی نے عروج حاصل کرنا شروع کیا۔

اور پھر لگی فلم 'چکوری' ساتھ ہی اس کے ہیرو کی بھی دھوم مچ گئی۔''ارے یہ تو دوسرا دلیپ کمار ہے۔''

یعنی یہ ہیرو اس لیے اچھا ہے کہ یہ دلیپ کمار جیسا ہے۔ندیم کی باتیں تو ہوتیں لیکن دلیپ کمار کا ذکر بھی ہوتا۔ہم سے بڑے جو دلیپ کمار اور راج کپور وغیرہ کی فلمیں دیکھ چکے تھے وہ دلیپ کے قصے سناتے، کس طرح ''انداز'' میں دلیپ نے راج کپور کو تھپڑ مارا (یا شاید بیڈمنٹن کا ریکٹ مارا، یا راج کپور نے دلیپ کو مارا، وغیرہ وغیرہ) پھر دیوداس کی اداکاری کا ذکر ہوتا، یا پھر مدھو بالا اور دلیپ کے طوفانی عشق کے قصے بتائے جاتے۔ غرض دلیپ کمار کی کہانی کسی عام اداکار جیسی نہیں ہوتی۔اسے ایک دیومالائی شخصیت بنا کر پیش کیا جاتا۔

بہرحال یہ سب کچھ تھا لیکن دلیپ کمار ایسا کوئی خاص ہمارے ذہن پر سوار نہیں تھا۔نہ ہمیں کوئی اس سے اتنی زیادہ دلچسپی تھی۔اور ہوتی بھی کیوں کر۔جو چیز سامنے نہ ہو اس کی بات کون کرتا ہے۔

لیکن ہم پاکستانی بھی عجب چوں چوں کا مرّبا اور ڈب کھڑبّا قسم کی قوم ہیں۔پینسٹھ کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ہندوستان ہمارا دشمن نمبر ایک تھا (اور ہے؟)۔ہندوستان سے نفرت ہماری گھٹی میں پڑی ہے اور ہمارا جزو ایمان بن چکی ہے۔بھارت سے کرکٹ میچ ہو یا سرحدوں پر گرما گرمی، ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔لیکن بات جب فلم یا ہندوستانی فلمی گانوں کی آتی ہے تو ہم ساری دشمنی بھلا کر بس تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیتے ہیں۔

ان دنوں بھارت سے سفارتی تعلقات بھی نہیں تھے، فلمیں تو دور کی بات، سادہ سے خط بھی براہ راست نہیں آتے تھے۔لیکن ہمارے ہندوستانی فلموں کے رسیا دوست کابل، تہران یا زاہدان کا سفر صرف ہندوستانی فلمیں دیکھنے کے لیے کرتے اور ہندوستانی فلموں کی خبریں لاتے۔کچھ فلم والے بھی جاتے اور کہانیاں چرا لاتے اور یہاں وہی فلم بنا کر الغاروں کماتے۔پھر ایک دن یہ بھی سنا کہ کراچی کے سوئس قونصل خانے میں (جو ہندوستان کے مفادات کی نگرانی بھی کرتا تھا)، فلم ''رام اور شیام'' یار لوگوں نے ڈیڑھ سو روپے دے کر دیکھی۔ان دنوں کراچی کے بہترین سنیما کا سب سے مہنگا ٹکٹ ساڑھے تین روپے کا ہوا کرتا تھا اور لوئر ڈویژن کلرک کی تنخواہ سوا سو روپے ہوتی تھی۔

ہندوستان سے شمع، فلم فیئر اور اسٹار ڈسٹ وغیرہ فلمی رسالے بھی آنے لگے۔انہی سے دلیپ کمار

کی سائرہ بانو سے شادی کی تفصیلات پڑھنے ملیں۔ سائرہ اس وقت دلیپ کی آدھی عمر کی تھیں۔ آدھی عمر کی لڑکی سے ہمارے ہاں کی ایک مشہور شادی تو بہت جلد دم توڑ گئی، لیکن دلیپ کمار اور سائرہ بانو کی جوڑی نصف صدی سے برقرار ہے اور خدا نظر بد سے بچائے، ایک مثالی جوڑی ہے۔

پھر امرتسر ٹی وی کا غلغلہ اٹھا اور سننے میں آیا کہ ''مغل اعظم'' دیکھنے کے لیے لاہور کی دکانوں سے ٹی وی ہی غائب ہو گئے، گھر کے پرات، تھالیاں، المونیم کے لوٹے سب ٹی وی اینٹینا کے گلے کا ہار بن گئے تا کہ سگنل صاف مل سکے۔

اور پھر میں بہ عمر بائیس سال تلاش روزگار میں بحرین جا پہنچا۔ میرے بڑے چچا، (اللہ ان کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ قائم رکھے، جن کے پاس میں رہتا تھا) نے کہا کہ جب تک نوکری نہیں ملتی مزے کرو، آرام کرو اور رات کو فلمیں دیکھو۔ اب یہاں بھارتی فلمیں تھیں اور چچا کا دیا ہوا وافر جیب خرچ تھا اور میں تھا۔ بحرین میں سوائے ایک دو سنیما کے، صرف ایک دن کے لیے فلم لگتی۔ سنیما والوں کی جانب سے ایک کتابچہ مفت تقسیم کیا جاتا جس میں ہر پندرہ دن کی فلموں کی تفصیل دی جاتی۔ اور ہم نے یہ فرض بنا رکھا تھا کہ کوئی بھی اچھی فلم قضا نہ ہو جائے۔

چھ سات فلمیں دیکھ لیں تو ایک دن دلیپ کمار کی ''دل دیا درد لیا'' لگی۔ سمجھداری کی عمر میں آنے کے بعد یہ دلیپ کمار کی پہلی فلم دیکھنے ملی۔ ہال میں داخل ہوئے تو فلم شروع ہو چکی تھی اور منظر کچھ یوں تھا کہ دلیپ کہیں سے دوڑے ہوئے چلے آ رہے ہیں اور کسی ٹھاکر یا رانا یا کنور صاحب کو کوئی پیغام پہنچا رہے ہیں۔ پسینے آلود چہرے اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ مکالموں کی ادائیگی بڑے غضب کی تھی۔ ان کی اداکاری کا نقش بھی جم کر دل پر بیٹھا، لیکن وہ ایک ادھیڑ عمر کے ''نسبتا'' بھاری بھرکم جسم کے ہیرو لگے جس میں کوئی خاص قسم کا گلیمر نظر نہیں آیا۔ ہم پاکستان سے ندیم اور وحید مراد جیسے چھریرے جسم کے ہیرو کو دیکھنے کے عادی تھے۔

پھر یکے بعد دیگرے مدھومتی، دیدار، ، داغ، لیڈر، اڑن کھٹولہ، آزاد، کوہ نور، ترانہ، امر، آدمی، داستان، گنگا جمنا، گوپی، بیراگ غرض کون سی فلم تھی جو وہاں لگی اور ہم نے نہیں دیکھی لیکن اس وقت تک کوئی ایسا خاص تاثر دل پہ قائم نہیں ہوا تھا۔ دلیپ کی سب سے عظیم فلم ''مغل اعظم'' مانی جاتی ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ وہاں پرانی فلمیں صرف ایک دن کے لیے لگا کرتی تھیں اور جس دن دلیپ کمار کی فلم لگتی، سنیما ہال میں امن وامان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا، خوب دھکم پیل، مار کٹائی اور گالی گلوچ ہوتی اور خالص لاہوری انداز سے ٹکٹ خریدے جاتے اور ٹکٹ کے حصول کے بعد منہ سے بکرے بلائے جاتے اور بھنگڑے ڈالے جاتے۔

مغل اعظم کے بارے میں اندازہ تھا کہ کیا کیفیت ہو گی اس لیے بہت پہلے سے پہنچ کر لائن میں لگ گئے۔ لیکن لگتا تھا کہ کھڑکی تک پہنچنے سے پہلے ٹکٹ ختم ہو جائیں گے کہ اتنے میں ایک فرشتہ صفت پاکستانی نوجوان نے آ کر سرگوشی کی، پاجی، ٹکٹ چیدے ہیں؟ میں نے بھی یہاں وہاں دیکھ کر پوچھا ''کِنّے دا؟ جواب ملا چار دا چھ وچ! جی چاہا اس کا منہ چوم لوں، فوراً ''چھ سو فلس جو وہاں چھ روپے ہی کہلاتے تھے اس کے حوالے کیے اور اس نے بسرعت ٹکٹ میری جیب میں منتقل کیا اور یہ جا وہ جا۔

میں قطار سے نکل کر تیزی سے ہال کے گیٹ کی طرف پہنچا کہ جلدی سے اندر جا کر مناسب سیٹ پر قبضہ کر لوں کہ وہاں سیٹ نمبر وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ گیٹ کیپر کے حوالے ٹکٹ کیا، اس نے ٹکٹ چیک کرنے کے لیے نظر ڈالی اور پھر ترشی سے بولا ''کہاں سے لیا یہ ٹکٹ۔''

''ٹکٹ کہاں سے لیتے ہیں؟'' میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اچھا؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ''ذرا سائیڈ میں کھڑے ہو جاؤ۔''

اب مجھے محسوس ہوا کہ دال میں کچھ کالا سا ہے۔ پوچھا کہ کیا بات ہے۔ پتا چلا کہ یہ گذشتہ روز کا استعمال شدہ ٹکٹ تھا۔ اب آپ ذرا اس وقت کی کیفیت کا اندازہ کیجیے۔ میری عمر بائیس سال تھی اور جسمانی حالت یہ تھی کہ تیز ہوا میں اپنے پچاس کلو کے وجود کو زمین پر قائم رکھنا مشکل ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت میں وحشی گجر بنا ہوا اس بندے کو سنیما کے آس پاس کے ہوٹلوں اور دکانوں میں تلاش کرتا پھر رہا تھا اور نیت پیسے واپس لینے کی نہیں بلکہ قتلِ عمد کی تھی۔ بہرحال وہ مجھ سا بے وقوف تو تھا نہیں۔ کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو سنیما واپس آیا کہ ٹکٹ استعمال کرنے کا کوئی اپائے ہو، اور لگن سچی ہو تو کام بن ہی جاتا ہے۔ اتفاق سے ایک ایرانی گیٹ کیپر نظر آیا جو میری رہائش گاہ کے نیچے چوکیدار کے کمرے میں رہتا تھا اور سیڑھیوں پر آتے جاتے اس پر نظر پڑتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی شناسائی کی لہر نظر آئی۔ میں نے اپنا دکھڑا اسے سنایا، اس نے کہا کہ اپر کلاس میں تو مشکل ہے میں تمہیں نیچے کہیں بٹھا دیتا ہوں۔ مجھے مغل اعظم دیکھنے سے غرض تھی چاہے عرش پر بیٹھ کر دیکھوں یا فرش پر۔

اب یہ قصہ ذرا طویل ہو رہا ہے لیکن یہاں تک سنا ہے تو اور بھی سن لیں۔ بحرین کا یہ لولو یا Pearl سنیما بھی ایک طُرفہ ہی تھا۔ گرمیوں میں یہاں کھلے ہال میں فلم دکھائی جاتی، سامنے اسکرین، سر پر تاروں بھرا آسمان، سنیما کے پیچھے سمندر اور سمندر کے اس پار دمام، سعودی عرب، کی روشنیاں نظر آتیں۔ لوگ باگ آرام سے سگریٹ پیتے اور ٹوٹے دیوار سے باہر کی طرف اچھال دیتے۔ سردیوں میں یہ برابر میں بنے دوسرے ہال میں منتقل ہو جاتا جہاں پنکھے وغیرہ نہیں تھے اور سگریٹ پینے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ بہرحال قصہ مختصر، اندھیرے ہال میں ٹٹولتے ہوئے ایک سیٹ مل ہی گئی۔ فلم شروع ہو چکی تھی اور

شہنشاہ اکبر، شیخ سلیم الدین چشتی کے مزار پر اولاد کی دعا مانگ رہے تھے ''شہنشاہوں کے شہنشاہ!! جہاں پناہ اور ظل سبحانی کہنے والی آوازیں تو بہت سنائیں، اب باپ کہہ کر پکارنے والی آواز بھی سنا۔''

ابھی یہ مکالمے سن ہی رہا تھا کہ سامنے سے سگریٹ کے دھوئیں سے ایک پردہ سا قائم ہو گیا۔ ساتھ ہی کچھ ناخوشگوار سے بوئیں قوت شامہ سے ٹکرائیں۔ اب ذرا نظریں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو دیکھا کہ پڑوس میں تین سردار بیٹھے ہیں جو براہ راست ڈیوٹی سے فلم دیکھنے آئے تھے۔ میں اس صورتحال کا نقشہ الفاظ میں نہیں کھینچ سکتا۔ یہ وہی جان سکتے ہیں جنھیں کسی پسینے آلود سکھ کی قربت نصیب ہوئی ہو۔ سرداروں نے شاید یہ فلم دیکھ رکھی تھی اس لیے انہیں شہنشاہ اکبر کی اولاد نرینہ سے محرومی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ اپنے گذرے دن، سپر وائزر اور اوور ٹائم وغیرہ کی باتوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں کان لگائے سننے کی کوشش کر رہا تھا کہ شہزادہ سلیم سنگتراش سے کیا کہہ رہے ہیں۔

یہ آوازیں، یہ خوشبوئیں، سگریٹ کا دھواں اور فلم کا پرانا پرنٹ۔ کچھ ہی دیر میں طبیعت متلانے لگی۔ میں اٹھ کر ہال سے باہر چلا آیا۔ جی ہاں، کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ مغل اعظم جیسی فلم چھوڑ کر کوئی باہر آ سکتا ہے۔ فلم ادھوری چھوڑ کر باہر ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں قے کر سکوں۔ اس کے بعد جب بھی مغل اعظم کا ذکر ہوتا طبیعت بھاری سی ہو جاتی۔

اس کے کئی سالوں بعد یہ فلم ٹی وی پر دیکھی تو ایک بات سمجھ آئی کہ فلم کا کوئی کردار کوئی بھی کر سکتا ہے، حتّٰی کہ مغل اعظم کا کردار بھی، لیکن سلیم کا کردار کوئی بھی اس طرح ادا نہیں کر سکتا جس طرح دلیپ کمار نے ادا کیا ہے۔ اور یہ کمال صرف دلیپ کمار کا ہے کہ جن کرداروں کو انہوں نے ادا کیا ہے، کوئی اس کے پاسنگ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ کہاں پشاور کا پٹھان اور کہاں گنگا جمنا کا بھوجپوری بولتا گنگا۔ اور اگر کردار مزاحیہ ہے تو آپ ایک شرارت سے بھرپور دلیپ کمار کو دیکھیں گے جس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کی مسکراہٹ، اس کی بدن بولی، اس کے ایک ایک انگ سے شرارت پھوٹتی نظر آئے گی اور جب یہی دلیپ کمار ایک ناکام عاشق کا کردار ادا کر رہا ہو تو دنیا بھر کی یاسیت اس کے چہرے میں سمٹ آئے گی لیکن مکالموں کی ادائیگی میں تصنّع کا نام تک نہ ہوگا۔

دلیپ جیسی اداکاری شاید ہالی ووڈ کے اوسط درجے کے اور ہمارے ہاں کے ٹیلیویژن کے اعلیٰ درجے کے اداکار کر لیتے ہیں۔ لیکن دلیپ جیسی شخصیت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ اور اس میں قدرت نے جس دریا دلی سے انہیں مردانہ وجاہت سے نوازا ہے وہیں اُن کی اپنی شخصیت، مجلسی رکھ رکھاؤ، نپا تلا انداز گفتگو، الفاظ کا بہترین چناؤ، گویا کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ دلیپ شاید واحد اداکار ہیں کہ جنہیں لوگ فلم کے پردے سے باہر بھی اسی دلچسپی سے دیکھتے اور سنتے ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ توجہ دیتے ہیں کہ ان

کی باتوں سے ایسے پھول جھڑتے ہیں کہ ہر ایک کا بات سننے کو جی چاہتا ہے۔ اور یہ انداز تکلم یہ رکھ رکھاؤ اس صحبت کا نتیجہ ہے جس میں وہ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ بے پناہ مطالعہ، بڑے بڑے ادباء اور شعراء سے ذاتی دوستی، پنڈت نہرو، جوش ملیح آبادی، مہندر سنگھ سحر، فیض احمد فیض اور بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔

جب دلیپ ہوتے ہیں تو آپ کسی اور کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتے۔ آپ انہیں راج کپور، دیو آنند، امیتابھ بچن، دھرمیندر، راجیش کھنّہ اور جسے چاہیں ان کے ساتھ کھڑا کر لیں، آپ کی نظر تیر کی طرح سیدھی دلیپ صاحب پر جا کر ٹھہرے گی۔ مجھے ذاتی طور پر دو بار انہیں دیکھنے کا موقع ملا۔ پہلی بار دبئی میں کنور مہندر سنگھ سحر کے ساتھ منائی جانے والی شام کے مشاعرے میں دیکھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے آئے، اپنی باتوں کے موتی بکھیرے اور معذرت کر کے جلد ہی واپس چلے گئے۔ لیکن اپنے پیچھے اپنی باتوں کی ایسی دھنک چھوڑ گئے کہ کچھ دیر تو مشاعرے میں کسی کو سننے کا جی ہی نہیں چاہا۔ دوسری بار شارجہ اسٹیڈیم میں عبدالرحمان بخاطر کے مہمان تھے۔ ہم گاہے گاہے دوربین سے انہیں دیکھتے اور خوش ہوتے۔ ساتھ ہی سائرہ بانو بیٹھی اپنے آس پاس کو منور کیے ہوئے تھیں۔

ان کی فلمی جوڑی کامنی کوشل، نمی، مینا کماری، نرگس، وجینتی مالا، وحیدہ رحمان، شرمیلا ٹیگور اور سائرہ بانو وغیرہ کے ساتھ رہیں، لیکن جو طوفانی عشق ان کا مدھو بالا کے ساتھ تھا اور شاید دلیپ کمار اور مدھو بالا سے زیادہ ان کے پرستاران دونوں کو اکھٹا دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مدھو بالا کے باپ کے لالچ اور اڑیل پن نے دنیا کو ایک خوبصورت ترین جوڑی سے محروم کر دیا۔ لیکن بہرحال رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ سائرہ بانو اپنے 'صاحب' ہی کے لیے بنی تھیں اور جس طرح انہوں نے عہد وفا نبھایا ہے وہ ایک مثال ہے۔

دلیپ کو شہرت اور دولت سے کہیں زیادہ جو چیز ملی وہ ہے 'عزت'۔ ہندوستان پاکستان کا ہر چھوٹا بڑا اداکار ان سے ہاتھ ملانے اور ان کی خدمت کرنے کو اپنے لیے اعزاز جانتا ہے یوسف خان عرف دلیپ کمار ایک اداکار یا ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک عہد کا نام ہے۔ نامور اداکار امیتابھ بچن نے بجا طور پر کہا ہے کہ جب کبھی ہندوستانی سنیما کی تاریخ لکھی جائے گی وہ دلیپ کمار سے قبل اور دلیپ کے بعد پر لکھی جائے گی۔ تہائی صدی سے لاکھوں دلوں پر حکومت کرنے والا یہ عظیم فنکار اب عمر کے انتہائی آخری حصے میں ہے۔ جو کوئی دنیا میں آیا ہے اسے واپس ضرور جانا ہے۔ لیکن کیا ضروری ہے کے ہم کسی کو اس کے جانے کے بعد ہی یاد کریں۔ دنیا میں بہت سے اداکار آئیں گے اور جائیں گے لیکن، یوسفِ ثانی، دلیپ کمار کا کوئی ثانی نہیں ہوگا۔

◀◀ ● ▶▶

BLACK & DECKER P.O.BOX 17164
DUBAI.UAE

TEL. 00971-507762694

- **شوہر نامہ**
- **شائستہ انجم نوری**

میرے مجازی خدا

مشتاق احمد نوری کا نام شادی سے قبل ہی میرے لیے آشنا تھا۔ گھبرائیے نہیں، اس میں کوئی عشق و عاشقی والا معاملہ نہیں تھا، کیوں کہ اس معاملے میں نوری قبل سے ہی انگیج تھے۔ میں انہیں ادیب کی حیثیت سے جانتی تھی ان کی کہانیاں شوق سے پڑھتی تھی۔

۱۹۸۰ء میں میری بڑی بہن زرتاج سلطانہ انسان اسکول کشن گنج میں پڑھاتی تھیں اور نوری کی پہلی پوسٹنگ کشن گنج میں ہی ہوئی تھی۔ آپی کو جانے کون سی بات پسند آئی کہ انھوں نے یہ رشتہ چلایا اور چٹ منگنی پٹ بیاہ ہوگیا۔ ۷ر جون ۱۹۸۰ء کو میں ان کی شریک سفر بن گئی۔

بات شادی کی ہے تو تھوڑی تفصیل اس لیے ضروری ہے کہ موصوف کی کچھ صفتیں عوام کے سامنے آجائیں۔ عام طور پر کسی بھی بارات میں سب سے اہم شخصیت دولہے کی ہوتی ہے اور دولہا ہزاروں باراتیوں میں بھی پہچان لیا جاتا ہے، لیکن ایک دولہا نوری بھی بنے، بارات میرے گاؤں سے دو تین کلومیٹر دور ہی روکی گئی کیوں کہ بس کا راستہ نہیں تھا۔ باراتی کے استقبال کے لیے جب گھر والے گئے تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پوری بارات میں دولہا غائب تھا۔ میرے ایک چچا نے ایک نوجوان سے جو بس سے سامان اُتروا رہا تھا اور قدرے ذمہ دار لگ رہا تھا، سے دریافت کیا۔

دولہے کے ابا تشریف لائے ہیں؟

اس نوجوان نے ایک بزرگ شخص کی جانب اشارہ کردیا۔

چچا نے اس بزرگ سے دریافت کیا:

''حضرت دولہا کہاں ہے؟''

اس بزرگ نے اسی نوجوان کی طرف اشارہ کردیا۔

چچا کو کاٹو تو خون نہیں۔

''یا اللہ! کس گھامڑ کے پلّے ڈاکٹر صاحب اپنی بیٹی کو باندھ رہے ہیں، اسے تو دولہا کی طرح سجنا بھی نہیں آتا۔ نہ عبا، نہ قبا، نہ عمامہ اور نہ ہی سہرا۔ یہ کس صدی کا دولہا ہے؟''

یہ تو بہت بعد میں پتا چلا کہ نوری قدرے آزاد خیال ہیں اور روایتی انداز سے انحراف کرنا ان کی عادت ہے اس لیے نہ اُبٹن لگا اور نہ مہندی، نہ جہیز کا ڈیمانڈ اور نہ ہی کسی خواہش کا اظہار۔

ہاں جب ان کے دوست علی امام نے جو اُن دنوں انسان اسکول میں استاد تھے، بہت کریدا کہ یار کچھ تو کہو، کسی بھی خواہش کا اظہار تو کرو۔ تو جھجکتے ہوئے جواب دیا:

''میری ایک ہی خواہش ہے کہ شادی سے قبل اس لڑکی کو بس ایک بار دیکھ لوں جس کے ساتھ پوری زندگی گزارنی ہے۔''

لیکن ہائے رے محرومی۔ حضرت کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوسکی، ایک آدھ تصویر پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔

بہرحال شادی کی گہما گہمی کے بعد سہانی رات میں دولہے کو اندر لایا گیا۔ پوری تفصیل شاید آپ کو بور کردے، اس لیے مختصر ہی لکھوں گی۔

میرے یہاں مذاق کے طور پر میرے ساتھ ایک اور لڑکی کو دولہن جیسا دوپٹہ اوڑھا کر میرے بغل میں بٹھایا گیا تھا۔ نوری جب اندر آئے تو ان سے کہا گیا:

''ان دونوں میں ایک تمہاری دُلہن ہے، اس کے سر پر اپنا رومال رکھ دو۔'' نوری نے جھٹ جواب دیا:

''رہنے دیجیے۔ ایک لینے آیا تھا یہاں تو دو مل رہی ہے۔ دونوں لے جاؤں گا۔''

نوری کی یہ پہلی آواز تھی جو میرے کانوں نے سنی۔ میں اندر سے قدرے گھبرائی۔

''یہ تو بڑا چالاک لگ رہا ہے، دونوں پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔'' ان سے پھر کہا گیا۔

''صرف اپنی دُلہن کی شناخت کرو، ورنہ خالی ہاتھ جاؤ گے۔'' یہ سن کر انھوں نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''ان دونوں میں ایک تم ہو جو میری ہوچکی ہو، اس لیے ذرا مدد کرو اور اپنی دُم ہلا دو۔ میں تمہیں پہچان لوں گا۔''

میری تو ہنسی چھوٹ گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ نوری نے میرے سر پر رومال رکھنے کے بجائے اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''یہ میری دُلہن ہے۔'' لوگ حیرت زدہ کہ اس نے صحیح دلہن کی شناخت کیسے کرلی۔ ان کے دوست نعیم فاروقی فوٹو گرافر کا فرض ادا کررہے تھے۔ میرا سر کافی جھکا ہوا تھا فوٹو گرافر کو شکل نظر نہیں آرہی

تھی، انھوں نے آپی سے التجا کی:

''ذرا دُلہن کو سر اُٹھانے کہیے، پلیز۔''

آپی نے نوری سے کہا:

''نوری بابو دُلہن کی ٹھڈی پکڑ کر چہرہ اٹھایئے نا!''

نوری نے میری ٹھڈی کو ہاتھ لگایا، میرے پورے بدن میں ایک عجیب سی سہرن دوڑ گئی۔ جب فوٹو گرافر نے تاخیر کی تو نوری نے ٹوکا۔

''یار جلدی کرو کب تک میں ڈیوٹی نبھاتا رہوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''یار بیٹری چارج ہو رہی ہے، بس تھوڑی دیر اور۔'' ادھر سے جھٹ جواب گیا۔

''تمہاری بیٹری چارج ہو رہی ہے اور ادھر میری انگلی چارج ہو رہی ہے۔ اس کا خیال ہے تمہیں۔''

میرے یہاں ایک رسم رونمائی کی ہوتی ہے، اور دلہن کی رونمائی ہونی تھی۔ حکم ہوا سامنے قرآن ہے اس میں سے سورہ رحمن تلاش کیجیے اور اسے پڑھ کر دلہن کے چہرہ پر پھونکیے پھر آئینہ میں شکل کا دیدار کیجیے۔ زیادہ تر لوگ سورہ رحمن تلاش نہیں کر سکتے یا تلاش کر لیا تو پڑھنے میں اٹکتے ہیں لیکن نوری نے جواب دیا۔

سورہ رحمن آپ لوگ خود تلاش کیجیے۔ میں زبانی پڑھ رہا ہوں، چاہیں تو قرآن سے ملاتی جائیں۔

یہاں بھی اس نے اپنا سکہ جما دیا۔

اور یہ سکہ ایسا جما کہ آج ۳۷ سال بعد بھی سکہ رائج الوقت بنا ہوا ہے۔

ایک رسم اور تھی دودھ ملے پانی میں انگوٹھی ڈالی گئی اور ہم دونوں کو نکالنے کہا گیا۔ ہم دونوں ہی نے ہاتھ ڈالا۔ میں انگوٹھی تلاش کرتی رہی، لیکن ناکام رہی۔ نوری نے دھیرے سے انگوٹھی پانی کے اندر مجھے پکڑا دی۔ ان کی مدد کا یہ انداز مجھے ایسا بھایا کہ آج تک نہیں بھولی۔

درج بالا واقعات میں نے کچھ اس لیے بھی سنایا کہ میں اس یاد کو تازہ کرنا چاہتی تھی اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان واقعات سے نوری کے رویے، ان کی بذلہ سنجی اور ان کے اصول سے آشنائی ہو جاتی ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ میں آج بھی نوری کو پوری طرح نہیں سمجھ سکی ہوں تو غلط نہیں ہوگا۔ وہ معمہ نہیں ہیں، لیکن ان کی شخصیت کی اتنی پرتیں ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا کہ اصل نوری کون ہے؟ بہت مشکل ہے۔

میں چوتھی کی دُلہن.....نوری نے بڑی معذرت کے ساتھ کچھ کہنے کی اجازت چاہی، میں نے فراخ دلی سے عطا کر دی۔

انھوں نے دھیمے سے کہا۔

''اب تک کی زندگی میں نے اپنی مرضی سے گزاری، اب تم آ گئی ہو تو تمہاری پسند ناپسند کا بھی

خیال کرنا ہوگا۔ میں پوری زندگی تمہارے نام کر سکتا ہوں لیکن زندگی کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جہاں تمہارا داخلہ ممنوع ہوگا۔'' یہ سن کر میں قدرے گھبرائی۔ سوالیہ نگاہوں کا یہ جواب ملا:

''میں ایک سرکاری آفیسر ہوں۔ میرے فیصلے اصول وضوابط کے دائرے میں ہوتے ہیں۔ صاحب کا ہر اسٹاف میم صاحب سے ربط رکھنا چاہتا ہے اور صاحب کے فیصلے بدلوانے میں ان سے مدد لینا چاہتا ہے۔ یہ دستور گو بہت پرانا ہے لیکن میں ایک بات صاف کر دوں کہ دفتری معاملات میں، میں تمہارے مشورے کی پروا نہیں کر سکوں گا۔ ایسا کر کے مجھے دکھ ضرور ہوگا، لیکن یہ میری مجبوری ہے۔''

وہ رُکے پھر ٹھہر ٹھہر کر جملہ ادا کیا۔

''میری گزارش ہے کہ زندگی کے اس شعبے میں تم جھانکنے کی کوشش مت کرنا۔''

ایک چوتھی کی دُلہن شوہر کو مکمل پانا چاہتی ہے۔ شوہر کا سب کچھ، دکھ درد، زندگی کا ہر شعبہ۔ مجھے قدرے برا ضرور لگا تھا، لیکن بعد میں غور کرنے پر مجھے نوری کی صاف گوئی اچھی لگی۔

قسمت کی ماری ایک بار سمستی پور میں ایک چوتھے درجے کے ملازم کی میں نے سفارش کی۔ نوری نے ہنس کر ٹال دیا۔ بعد میں جو وجہ بتائی اس میں اتنا دم تھا کہ میرا دل میلا نہ ہوا۔ تب سے آج تک میں نے کسی بھی دفتری معاملے میں دخل نہیں دیا۔

نوری دفتری معاملات میں بہت سخت ہیں، کسی کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اکثر ان کے سینئر افسران سے خائف رہتے ہیں۔ ایک بار سمستی پور میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنے چیمبر میں کسی بات پر ان سے کہہ دیا:

''مسٹر نوری یہ پاکستان نہیں ہے۔''

اتنا سننا تھا کہ وہ آپے سے باہر ہو گئے، اور چیختے ہوئے کہا:

''اسٹاپ پلیز، اس کے بعد ایک لفظ بھی بولے تو یہاں وہ واقعہ ہونے جا رہا ہے جو زندگی بھر آپ کو یاد رہے گا۔''

پھر اپنا جوتا اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا کہ سر میری ایک بری عادت ہے۔ میں جب شروع ہوتا ہوں تو گنتا نہیں ہوں۔ وہ بے چارہ راجپوت آئی۔ اے۔ ایس آفیسر ماتحت آفیسر کے اس رویے سے ایسا حیرت زدہ ہوا کہ واقعی ایک لفظ نہ بول سکا۔

لمبی کہانی ہے۔ نوری بھی پریشان ہوئے۔ سوال و جواب ہوتا رہا، لیکن نوری بھی کم تگڑم باز نہیں۔ ایک مہینے کے اندر اس ڈی۔ ایم کا ٹرانسفر کروا کر ہی چھوڑا۔ ان کی مدد وہاں کے پترکاروں نے خوب کی۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کوئی غلط بات سننا ان کی عادت نہیں، اور سمجھوتا کرنا ان کی

فطرت نہیں۔ان کی اسی عادت نے انہیں پٹنہ سے چھپرہ کے سفر پر مجبور کیا۔

بیوی بچوں سے بہت شفقت سے پیش آتے ہیں، لیکن معمولی معمولی باتوں سے بھی چراغ پا ہوجاتے ہیں اور کبھی کبھی تو گھر سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔آوازیوں بھی پاٹ دار ہے، گھر سے نکلنے میں دیر نہیں ہوتی۔

دفتر سے آنے کے بعد پورے گھر کا تنقیدی جائزہ لیں گے اور ساری خامی گنا کر اسے درست کرنے کا فرمان جاری ہوگا۔ بچے کبھی کبھار ناراض بھی ہوجاتے ہیں، لیکن نوری بچوں کے دوست بھی ہیں اس لیے بچے جلد مان جاتے ہیں۔ بچوں سے محبت کا یہ عالم ہے کہ ان کی بیماری میں رات بھر جاگ کر ان کی تیمارداری کرتے ہیں اور میں مزے کی نیند سوتی ہوں۔ میں اگر جاگی تو فرمائیں گے ''تم سوجاؤ، میں جاگ ہی رہا ہوں۔ایسی حالت میں مجھے نیند نہیں آتی۔''

بچوں کو اگر گھر آنے میں دیر ہوجائے تو بار بار گھڑی دیکھیں گے اور گھر سے نکل کر سڑک پر جا کر ان کا انتظار کریں گے اور دل ہی دل ان کے حفاظت سے لوٹنے کی دعا کریں گے۔

دوسروں کے کام کے لیے نوری بے حد مستعد ہیں، بلکہ بگڑے کام بھی بنانے میں انہیں مہارت ہے۔ دفتر کے بے حد پیچیدہ معاملات چٹکیوں میں حل کرنے کا ہنر انہیں معلوم ہے، لیکن ان کی یہ ساری توانائی اپنے معاملات میں نہ جانے کہاں گم ہوجاتی ہے۔

اپنی ۲۹ سال کی نوکری میں ان کا GPF ابھی تک clear نہیں ہے۔ GPF دفتر کے کئی بڑے آفیسر جو ان کے جان پہچان والے تھے، نے گھر آکر میرے سامنے ان سے کہا کہ آپ صرف درخواست دیں باقی سب وہ لوگ خود کرلیں گے، لیکن وہی بے اعتنائی۔ (یہ واقعہ ۲۰۰۶ء کا ہے ان کی سبکدوشی کے چار سال بعد جی۔پی۔ایف کی رقم ملی)

خود میرا اپنے کالج پر تقریباً تین لاکھ روپیہ بقایا تھا، بہت خوشامد کیا تو لیٹر ڈرافٹ کردیا۔ایک بار مگدھ یونیورسٹی گئے بھی۔اس کے بعد پلّہ جھاڑ دیا۔

''مجھ سے خوشامد نہیں ہوگی۔''

ان کے ایک شناساوی۔سی بنے، کافی امید بندھی۔انھوں نے کہا بھی مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ ایک رجسٹرار نے تو پٹنہ آکر ان سے ڈیرہ میں وعدہ بھی کیا کہ میں کروادوں گا، لیکن کچھ لوگ کردار کے نہیں گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ میں نے پھر ضد کی تو فرمان جاری ہوا۔

''ہائی کورٹ میں مقدمہ کردو۔رقم میں ادا کردوں گا۔''

جو کام چاہ لیا اسے ہوتے دیر نہیں لگتی، لیکن اپنے معاملے میں ان کی فقیرانہ بے اعتنائی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ایک گورنر کے اُوایس ڈی نے نوری سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔کرشن کمار سے اس زمانے میں وی

سی سے لے کر پرنسپل تک ڈرتے تھے۔وہ ان دنوں یونیورسٹی میں ٹیرر (Terror) کے نام سے جانے جاتے تھے۔نوری چھپرہ میں جوائنٹ ڈائرکٹر تھے۔بلاوا گیا تو وہ ایک اتوار کو ان سے ملنے گئے اور جب گفتگو ختم ہوگئی تو نوری نے انہیں میرا معاملہ بھی تفصیل سے بتادیا۔انہوں نے نوٹ کرلیا اور کہا اب آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں میں دیکھ لوں گا۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔پھر دونوں کالج کے پرنسپل نے دوسرے دن ہی مجھے فون پر اطلاع دی کہ آپ کا بقایا آج یا کل بینک میں جمع ہوجائے گا اور واقعی رقم ادا کردی گئی۔نوری نے بس مسکرا کر کہا۔

''ہر کام کی تاریخ اللہ نے مقرر کر رکھی ہے۔''

میرے ساتھ مشکل یہ ہے کہ شوہر پر لکھنا یوں خطرناک ہے کہ ذرا سی بات پر بھی دنیا اور آخرت تباہ ہونے کا ڈر بنا رہتا ہے، لیکن جب لکھنا ہی ہے تو ایسے واقعات تو لکھنے ہی ہوں گے جن سے نوری کی شخصیت سامنے آسکے۔کچھ دائیں بائیں ہوا تو معافی مانگ لوں گی، وہ ویسے بھی معاف کرنے کے معاملے میں بہت فیاض ہیں۔

گھر میں ان کی عادتیں عجیب عجیب سی ہیں۔ایک بار قربانی کا بکرا خریدنے گئے اور ایک خوب صورت بکری اُٹھا لائے۔ میں نے پوچھا اسے ہی قربان کرنا ہے۔ جواب ملا۔''اسے میں پالوں گا اور اس طرح رسول اللہ ﷺ کی ایک سنت تو ادا ہوجائے گی۔

دھوپ میں لنگی گنجی پہنے اپنے گارڈن میں ہی کچیا (ہنسوا) سے بکری کے لیے دوب کاٹ رہے تھے..... پسینہ سے شرابور۔ ایک اجنبی شخص نوری صاحب کو تلاش کرتا ہوا آیا۔ ان سے دریافت کیا۔ فرمایا۔''وہ بیل دبا دیں۔'' لڑکا باہر نکلا تو فرمایا۔''انہیں اندر لے جایئے۔'' اور جب تھوڑی دیر بعد آدمی کی شکل میں خود سامنے آئے تو بے چارہ اجنبی ہکّا بکّا رہ گیا۔

جھاڑو لے کر اندر کا حصہ صاف کرتے کرتے کبھی کبھار چہار دیواری سے باہر نکل کر جھاڑو دینے میں عار محسوس نہیں کرتے۔کئی بار ٹوکا، آزو باز و سینئر آفیسر رہتے ہیں کیا سوچیں گے۔

''ان کے کچھ سوچنے سے میں چھوٹا تھوڑے ہی ہوجاؤں گا۔'' یہ جواب سن کر کوئی کر بھی کیا سکتا ہے۔

بکری کے ساتھ مرغی، کبوتر، خرگوش، ولایتی چوہا اور بلی پالنے کا بھی شوق رہا ہے۔ان جانوروں کے ساتھ وقت گزارنا انہیں کافی سکون بخشتا ہے۔

ایک دفعہ بڑے شوق سے ایک بہترین رائٹنگ ٹیبل لائے اور ساتھ میں ایک اچھی کرسی، خوب صورت مرادآبادی ٹیبل لیمپ اور گلدان۔ٹیبل ارمان سے سجایا، کرسی پر بیٹھ کر ریوالنگ کا مزہ لیا، ادیب ہونے کا پوز بنایا، کچھ لکھا بھی۔لیکن ہفتہ دن کے اندر ٹیبل پہچاننے لائق نہیں رہا۔ کتابوں، رسائل، خطوط، تراشے اور دیگر سامان کا انبار۔لیکن حکم یہ کہ میری کسی چیز کو کوئی ہاتھ نہ لگائے، خوشامد برآمد کر کے صفائی کروائی، چیزوں کو قرینے سے رکھا لیکن پھر وہی حال۔ان کی اس بے ترتیبی میں جو ترتیب ہے اسے وہی

محسوس کر سکتے ہیں۔

کہانی یا مضمون، اگر خود لکھنا ہے تو تنہائی میں لکھیں گے اور ایک ہی شفٹ میں، لیکن ان دنوں مضامین مجھے ڈکٹیٹ بھی کرنے لگے ہیں، لیکن آج تک جو بھی کہانی لکھی ایک ہی شفٹ میں لکھی۔ کہانی سوچتے سالوں ہیں لیکن بڑی سے بڑی کہانی بہت تیز رفتاری سے ایک سے دو گھنٹے کے درمیان مکمل کر لیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی پہلی قاری یا سامع ہونے کا فخر مجھے ہی حاصل ہے۔ اگر کبھی کچھ کہہ بھی دیا اسے نظر انداز نہیں کرتے، اس پر غور کرتے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۹۶ء میں ایک کہانی لکھی۔ مجھے سنائی۔ میں نے برجستہ کہا:

''یہ کہانی آپ نے سوچ کر لکھی ہے۔ آپ کی کہانی نہیں لگتی۔''

اس کہانی کو انھوں نے پھاڑ کر پھینک دیا۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہیں؟'' میرے ٹوکنے پر کہا۔

''تم نے درست کہا۔ یہ میں نے غصے میں لکھی ہے، اس لیے ٹھیک سے بن نہیں پائی۔''

اور جب ستمبر ۲۰۰۵ء میں وہی کہانی اچانک ''لمبی ریس کا گھوڑا'' کے عنوان سے 'آج کل' دہلی میں شائع ہوئی تو میں حیرت زدہ رہ گئی۔

''اسے آپ نے کب لکھا؟ مجھے سنایا نہیں۔''

''تمھیں نے تو اسے رد کیا تھا، اس لیے سوچا تمھیں سرپرائز دوں۔''

اپنی کہانیوں کو سنبھال کر نہیں رکھتے، کون کہانی کس رسالہ میں شائع ہوئی ان کے لیے بتانا مشکل ہے۔ رسالہ کہاں ہے؟ کوئی خبر نہیں۔ ان کی اس لاپروائی سے بہت سی اچھی کہانیاں گم ہو گئیں۔

جب مجموعہ شائع کرنے کا زمانہ آئے گا تو میری خوشامد ہونے لگے گی۔ ذرا رسالہ تلاش کر دو، نہ جانے کہانیاں کہاں کہاں دفن پڑی ہیں۔ نہ کسی کی خوشامد کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کی خوشامد پسند کرتے ہیں۔ اپنی تعریف انہیں بھی پسند ہے، لیکن تعریف اور خوشامد کے باریک فرق سے وہ واقف ہیں۔ مجھ سے اپنی تعریف کی توقع بھی رکھتے ہیں لیکن میں جان بوجھ کر طرح دے جاتی ہوں۔ (زیادہ تعریف کر کے سر پر چڑھانا ہے کیا؟)

وقت اور زبان کے پکّے ہیں۔ ایک بار اگر کسی کو زبان دے دی تو سمجھئے کہ وہ پتھر کی لکیر ہو گئی۔ دنیا ادھر سے اُدھر ہو جائے لیکن ان کا وعدہ ٹل نہیں سکتا۔ وقت کی پابندی اتنی کہ آپ گھڑی ملا لیں۔ ایک زمانے سے ان کی اس عادت میں فرق نہیں آیا۔

ایک بار ایک پترکار نے فون کیا۔

''بھیا شام کو آپ گھر پر رہیں گے؟''

''ہاں۔'' سنتے ہی جواب میں انھوں نے کہا۔

''میں چھ بجے تک آؤں گا۔''

اب ان کا سارا کام موقوف..... چھ سے قبل کہیں نہیں جانا۔ اسے نہ آنا تھا نہ آیا۔ اس طرح اس نے کئی بار آنے کا وعدہ کیا اور نہیں آیا، اور جب ایک بار پھر اس نے حسبِ عادت آنے کا وعدہ کیا تو اس پر کافی بگڑے۔

''تم کو جب آنا ہو آؤ، لیکن تم مجھ سے وعدہ کیوں لیتے ہو میں بندھ جاتا ہوں۔'' وہ دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں اور پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مہمان نوازی میں فیاضی دکھاتے ہیں۔ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا اس کے سامنے بچھ جائیں گے۔ کبھی کبھی اگر کوئی ہوٹل میں ٹھہر جائے تو اسے ایسی بات کہہ دیں گے کہ وہ یہیں آنے پر مجبور ہوگا۔

ایک بار شاہد احمد شعیب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ان کے دولڑکے اور ایک بہو انہیں دیکھنے آئے اور ہوٹل میں رُکے جب کہ ان لوگوں کی والدہ میرے یہاں ہی تھیں۔ انھوں نے دارین شاہدی سے دریافت کیا۔ ''دونوں کمروں کا کیا چارج دے رہے ہو؟'' اس نے بتایا۔

''فی کمرہ سات سو روپیہ یومیہ۔'' اس پر انھوں نے جواب دیا۔

''تم آدھی رقم مجھے ادا کر دو میں مفت میں تین وقت کھانا بھی کھلاؤں گا۔''

وہ لوگ اتنے شرمندہ ہوئے کہ فوراً ہوٹل سے میرے یہاں شفٹ ہو گئے۔

اپنے گھر کے سب سے بڑے ہیں اور آج بھی ایک ایک کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے بہن بھائی بھی انہیں بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ صرف ان لوگوں کی دلجوئی کے لیے ہر عید پوری فیملی کے ساتھ گاؤں جا کر مناتے ہیں کہ اس طرح گاؤں سے رشتہ بنا رہے گا۔

رقم کے معاملے میں ان کا ہاتھ بہت تنگ رہتا ہے۔ اکثر مقروض بھی رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں بھی قرض لے کر ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے ہیں اور واپسی کی توقع نہیں رکھتے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی اجنبی نے کسی شناسا کا حوالہ دے کر فون پر قرض مانگا۔ ہاتھ خالی تھا، لیکن دوسرے دوست سے قرض لے کر انہیں رقم فراہم کر دیا۔ قرض دینے کے معاملے میں اگر رقم ہے تو وہ انکار نہیں کرتے۔ ایک یوپی کا قالین بیچنے والا آتا۔ جب بھی آتا کچھ نہ کچھ خرید لیتے..... بلاضرورت ہی۔ ایک بار اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''سر جی ایک لاکھ کے ادھار پر مجھے دس ہزار فاضل دینا ہوتا ہے۔ آپ اگر ایک لاکھ دے دیں تو مجھے دس ہزار نہیں لگیں گے۔''

جھٹ چیک کاٹ کر دے دیا۔ چھ سال ہو گئے، مگر قالین والے نے پھر گھر کا رخ نہیں کیا۔ اسی طرح دو چار لوگ اور ہیں جنہیں ڈیڑھ لاکھ، ڈھائی لاکھ مانگنے پر دے دیا۔ سالوں بیت گئے، لیکن کسی نے قرض نہ لوٹایا۔ یہ ساری رقم ان کے گریجویٹی کی تھی۔ یاد دلاؤں تو ارشاد ہوگا۔

''دے ہی دے گا کسی دن، شرم آتی ہے مانگنے میں۔'' اب میں کیا کہوں۔

اب ذرا ان کے مذہبی رنگ کا بھی مطالعہ کر لیا جائے۔ شریعت کی پابندی بہت اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ذوق وشوق حد سے بڑھا ہوا ہے، ان معاملات میں زیادہ اس لیے نہیں بتا پاؤں گی کہ کچھ چیزوں کی تشہیر وہ پسند نہیں کرتے اور میں اس معاملے میں ان کی ناپسندیدگی مول لینا نہیں چاہتی۔ بیس سال کی عمر میں ہی پیر ومرشد پروفیسر فضل امام فردوسیؒ نے انہیں پانچ سلسلے کی خلافت عطا کر دی کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات شاید انہیں پالنے میں ہی نظر آ گئے تھے۔

گھر پر اکثر بزرگ فقیروں کی آمد ہوتی رہتی ہے۔ ایک بزرگ جو قدرے مجذوب ہیں وہ ان سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھر سے نکال کر باہر لے جا کر جم کر گالیاں دیتے ہیں اور سارا علاقہ دیکھتا ہے اور عام حالات میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دینے والے نوری سر جھکائے ان کی گالیاں سنتے رہتے ہیں۔ ان کا مذہبی معاملہ ان کے اپنے رنگ کا ہے اس پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہے۔

ایک بزرگ اکثر اپنے چھ سات حواریوں کے ساتھ آتے ہیں اور کئی ہفتے قیام کرتے ہیں۔ وہ انہیں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ ایک بار ایک مستان تشریف لائے۔ وہ ڈنڈا مستان کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک دو فٹ کا ڈنڈا ہوتا۔ اس میں سونے، چاندی، لوہے، پیتل اور تانبے کے کیل جڑے تھے۔ ان دھاتوں کے کئی چھلے بھی اس میں لگے تھے۔ ان کا قیام ہفتے بھر رہا۔ وہ روٹی کے ساتھ سالن کی بجائے ہری مرچ کا کوچا پیالہ بھر کھاتے۔ میں کافی ہری مرچ تھکوچ کر اس میں لہسن، نمک اور سرسوں تیل ڈالتی۔ وہ مزے سے پورا پیالہ کھا جاتے۔ ہم لوگوں نے بھی کھانا شروع کیا اور اچھا ہی لگا۔ وہ مستان، نوری کو ''سرکار'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ میں نے ایک بار ٹوک دیا تو مسکرا کر بولے۔ ''اسے آپ نہیں سمجھیں گی نا، یہ اندر کی بات ہے۔'' ایک بار نوری کے دوست شمیم اختر ملنے آئے۔ مستان کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ نوری نے کہا میں تمہیں مستان کی خاص بات بتاؤں۔ یہ نعرۂ حیدری میں کمال رکھتے ہیں۔ پھر نوری نے مستان کو اشارہ کیا اور وہ ''جی سرکار'' کہتے ہوئے کمرے سے باہر گارڈن میں تشریف لے گئے۔ اب جو انہوں نے نعرۂ مستانہ لگایا تو پورا علاقہ گونج گیا۔ آواز کیا تھی شیر کی دھاڑ جیسی تیز تھی۔ ایسے بہت سے فقراء آتے اور مل کر چلے جاتے۔ میں سب کی تفصیل لکھوں تو عتاب نوری سے بچ نہیں سکوں گی۔

۱۹۹۲ء سے حضرت خیر سے عامل بھی ہو گئے۔ مجھے بتایا کہ ان کے کچھ مؤکل بھی ہیں۔ میں نے اَن سنی کر دی۔ لوگ آتے رہے، فیض پاتے رہے۔ میں نے توجہ نہیں دی۔ جب بھی گاؤں جاتے لوگ پتا

کر کے آتے اور انہیں دم مارنے کی فرصت نہ دیتے۔ میں اسے بس یوں ہی سمجھتی رہی لیکن جب ایک بار ایک لڑکی دو دن سے بے ہوش تھی، بقول شخصے وہ جن کے نرغے میں تھی، ان کے پاس لائی گئی اور وہ ایک گھنٹے میں مکمل ٹھیک ہو کر گئی۔ میں چونکی ضرور کہ کچھ تو بات ہوگی۔ اور جب ایک عورت جسے ایک بچہ کے بعد دوسرا بچہ نہیں ہوا تھا اور وہ پہلے بولتی تھی، لیکن بارہ برسوں سے گونگی تھی، ڈاکٹر کی جانچ اور علاج بھی بے اثر رہی۔ اس گونگی عورت کو میرے سامنے ہی نہیں پورا آنگن عورتوں سے بھرا پڑا تھا، کے سامنے نوری نے صرف پانچ منٹ کے اندر اسے اس کی گویائی لوٹا دی تو میں ان پر ایمان لے آئی۔

ماشاءاللہ سینکڑوں مریض فیض یاب ہو چکے ہیں۔

لیکن ان دنوں انھوں نے دھیرے دھیرے اپنی دوکان بند کرنی شروع کر دی ہے اور لوگوں کو دوسری جگہ بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی عملیات کے لیے کسی سے بھی پھوٹی کوڑی قبول نہیں کی۔ ہاں، ایک امیر کبیر شخص کے ۱۸ سال کے پاگل بیٹے کو جب انھوں نے چٹکی بجاتے ٹھیک کر دیا تو وہ ایک کلرٹی۔ وی زبردستی دے گیا اور ان کی محبت دیکھ کر انھوں نے قبول کر لیا۔

اپنی ادبی شہرت اور ناموری کے لیے لوگ طرح طرح کے ہتھکنڈے اپناتے ہیں لیکن نوری ان چیزوں سے کوسوں دور ہیں۔ کئی ہفتہ وار اور ماہنامے نے ان پر گوشہ شائع کرنے کا آفر دیا جسے انھوں نے خندہ پیشانی سے انکار کر دیا۔ حالاں کہ وہ ایسے محکمہ سے وابستہ ہیں جہاں سے صرف اشتہار دلا کر خود پر گوشہ کیا اسپیشل نمبر بھی شائع کرا سکتے ہیں، لیکن ان کی وہی فقیرانہ بے اعتنائی یہاں بھی کارفرما ہے۔

عمدہ لباس کے شوقین ہیں۔ ان کی جامہ زیبی شروع سے مشہور رہی ہے لیکن صاحبِ ریش ہونے کے بعد اس جانب توجہ کم ہو گئی ہے۔ ان کے سوٹ ٹائی کا دیدار اب جاڑے میں بھی کم ہی ہو پاتا ہے۔

کھانے کے شوقین کبھی نہیں رہے۔ حالاں کہ اسی معاملے میں شوہر بیوی میں کافی کچھ ہو جاتا ہے۔ جو بنا کر رکھ دیا کھا لیا۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ دال، چاول اور آلو کا بھرتا ان کا محبوب کھانا ہے۔ دودھ اور دہی روٹی بھی بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ ستّو بھی بے حد پسند کرتے ہیں اور کبھی کبھی بھوکا رہنا بھی انہیں کھانے کی طرح ہی مرغوب ہے۔

اپنے رویے سے بہت سخت دکھتے ہیں، لیکن رقیق القلب اتنے ہیں کہ آج بھی فلم میں دردناک منظر انہیں رُلا دیتا ہے۔ کبھی کبھی ناول پڑھتے ہوئے بھی میں نے انہیں آب دیدہ ہوتے دیکھا ہے۔ انتہا تو یہ ہوئی کہ شادی کے بعد رخصتی کے وقت جب میں والدین کے گلے لگ کر رو رہی تھی تو دولہا میاں بھی اپنی آنکھیں بار بار پونچھتے دیکھے گئے تھے۔

انسان کا گناہ ہی اسے فرشتے سے بالاتر کرتا ہے۔ بے عیب انسان فرشتہ ہو جاتا ہے۔ نوری مکمل

انسان ہیں۔غلطیاں ان سے بھی سرزد ہوتی ہیں جسے وہ تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔

ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ ہر محفل میں خود کو فٹ کر لیتے ہیں۔ ہزاروں کی محفلوں میں بھی وہ اپنی گفتگو اور رویے سے اپنی انفرادی شناخت قائم کر لیتے ہیں۔

فقیروں کی مجلس میں فقیر نظر آئیں گے۔ دوستوں کی محفل میں لوگوں کو قہقہہ لگانے پر مجبور کریں گے۔ بچوں کے ساتھ بچہ بن جائیں گے اور بوڑھوں کے ساتھ بھی ایڈ جسٹ کرنا ان کی فطرت ہے۔

بے باکی ان کی فطرت ہے۔ جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ بے لاگ گفتگو کے لیے جانے جاتے ہیں۔ اپنی تحریر میں بھی اپنی اسی فطرت کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ان کے کچھ ادیب دوست انہیں کرنیل، جرنیل کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ گفتگو میں حد درجہ بذلہ سنج ہیں، گفتگو دلیل کے ساتھ کرتے ہیں۔ مشورے لیتے کم، دیتے زیادہ ہیں۔رقم خرچ کرنے کے سو بہانے جانتے ہیں، لیکن بچانے کا گر نہیں معلوم۔سب اللہ پر چھوڑ کر شانت ہو جانا فطرت ہو گئی ہے۔ان کی بذلہ سنجی کا ایک واقعہ سناؤں۔ایک بار اپنے مائکے میں تھی۔نوری بھی تشریف لائے۔میرے ابی جان کو معلوم ہوا کہ داماد جن بھوت کا عامل ہو گیا ہے۔مسکرا کر بولے ”اچھا یہ بتاؤ کہ گاؤں کے فلاں پیڑ کے بارے میں مشہور ہے اس پر بہت بڑا شیطان جن رہتا ہے۔میں تم لوگوں کی طرح دیندار نہیں ہوں۔رات برات مریض دیکھنے اسی راستے سے گزرتا ہوں۔اس نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔“ نوری پوری سنجیدگی سے بہت دھیمے لہجے میں بولے۔

”ابی جان دراصل وہ لوگ بھی اپنے استاد کی بہت قدر کرتے ہیں۔“ ابی جان قہقہہ لگا لگا کر بے حال ہو گئے۔اپنے والدین سے بے حد محبت کرتے تھے۔کبھی ان کے سامنے اونچی آواز میں گفتگو نہیں کی۔ان کی دعاؤں کو اپنی زندگی کا سرمایہ بتاتے ہیں۔ جب بھی پریشان ہوتے تھے ماں کو فون کر دیتے اور چین کی نیند سو جاتے، لیکن والدین کی موت کے بعد خود کو بے آسرا کہنے لگے ہیں۔

اپنے بچوں کو بھی ماں کی خدمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بہت صاف لفظوں میں بتاتے ہیں کہ تین ماں کی بات مانو ایک باپ کی، کہ ماں سے باپ کا حق بہت کم ہوتا ہے۔

ہر کسی پر بھروسا کرنا اور ان کی بات تسلیم کر لینا ان کی عادت ہے۔اس طرح اکثر بھروسا کر کے برے پھنسے ہیں، لیکن یہ عادت نہیں گئی۔ جب کبھی کچھ کہوں گی، جواب دیں گے۔

”تم سمجھتی نہیں ہو۔میں سنّی مسلمان ہوں۔اس لیے جو سنتا ہوں اسے مان لیتا ہوں۔“

اب ان سے بحث کون کرے، بلکہ انہیں بحث کی دعوت دینا آ بیل مجھے مار کے مترادف ہوگا۔ اپنی بات ہر حال میں منوا کر چھوڑیں گے۔ایسی حالت میں پروین شاکر کا یہ شعر بہت یاد آتا ہے:

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

ایک شوہر کی جتنی محبت ہو سکتی ہے وہ مجھے نصیب ہے۔ میری دلجوئی کا اکثر خیال رکھتے ہیں۔ شادی کے وقت میں انڈر گریجویٹ تھی اور آج جو بھی ہوں سب ان کی مرہونِ منت ہے۔شادی کے سات سال بعد میں نے انہی کے مشورے سے گریجویشن کیا، پھر ایم۔اے میں داخلہ لیا۔اس کے بعد انہیں کی حوصلہ افزائی اور کچھ نعیم فاروقی کی ضد کی وجہ سے انگریزی میں بھی ایم۔اے کر لیا۔ پھر پی ایچ۔ڈی کے لیے انھوں نے رجسٹریشن کرایا اور ۲۰۰۱ء میں ڈگری بھی ایوارڈ ہو گئی۔

انگریزی میں ایم۔اے منڈل یونیورسیٹی مدھے پورہ سے کیا۔نعیم فاروقی کی ضد کی تھی کہ بھابھی انگریزی میں بھی ایم۔اے کر لیں۔انہوں نے ہی نوٹس اور کتابوں کا انتظام کیا۔اتفاق سے امتحان رمضان میں پڑ گیا۔نوری تیار نہیں تھے کہ رمضان میں تکلیف اٹھاؤں، لیکن میری لگن دیکھ کر تیار ہو گئے۔میں امتحان کے ایک دن قبل بس سے مدھے پورہ جاتی۔نعیم فاروقی وہاں سے اپنے ڈیرہ لے جاتے اور امتحان دے کر اسی رات بس سے پٹنہ آ جاتی۔بس پٹنہ میں چار بجے سے قبل آ جاتی۔فاروقی بس کے خلاصی کو تاکید کر دیتے کہ صبح ہونے کے بعد ہی میڈم کو رکشہ کر کے دینا۔ایک بار بس ساڑھے تین بجے ہی پٹنہ پہنچ گئی اور میں یہ سوچ کر کہ جا کر سحری بھی کھا لوں گی۔رکشہ لے کر فلیٹ پہنچ گئی۔نوری دیکھ کر کافی حیران بلکہ پریشان ہو گئے اور غصہ سے کہا۔”تم صبح کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔“ میں نے کہا۔”اس لیے چلی آئی کہ آج سحری میں شامل ہو جاؤں گی۔“ ان کا جواب سنئے۔

”تمہیں سحری کی فکر پڑی ہے۔اگر کوئی شریف بندہ راستے میں مل جاتا تو عید کرا کر ہی چھوڑتا۔“

لکچرر شپ کے انٹرویو کے لیے انھوں نے تین دن اردو اکادمی سے فرصت لے کر مجھے کمرے میں بند کر دیا۔بچوں سے کہا خود پکاؤ کھاؤ۔انٹرویو کے لیے ایک خاص زاویے سے تیاری کروائی۔خود سے میرا انٹرویو لے کر مجھے ذہنی طور پر تیار کیا اور اللہ کی شان جس طرح نوری نے تیار کرایا اسی انداز سے انٹرویو ہوا۔

میں ان کی ’دور درشٹی‘ (دور اندیشی) کی بہت قائل ہوں۔جس کام میں انھوں نے ٹوک دیا یقین جانیے نہیں ہونا ہے۔ان کی ’دور درشٹی‘ کا یہ عالم ہے کہ لینڈ لائن کی فون کی گھنٹی سے فون کرنے والوں کا نام بتا دیتے ہیں۔ دروازے کا بیل بجا، فرمایا: دیکھو فلاں صاحب آئے ہیں۔ میں اکثر حیران ہوتی ہوں لیکن وہ ہیں کہ مسکرا کر میرا خون جلاتے ہیں۔

ان سے ہزار شکایتوں کے باوجود ان کی شریکِ سفر ہونا میرے لیے فخر کی بات ہے۔ میری شخصیت کی تعمیر و توسیع میں سب سے بڑا ہاتھ انہی کا ہے۔

وہ میری زندگی میں نہ آتے تو شاید میری صلاحیتوں کو جِلا نہیں مل پاتا۔کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مسکراتے ہوئے وہ میری جانب اشارہ کر کے کہہ رہے ہیں:

تعمیر کی ہر اینٹ پہ لکھا ہے میرا نام دیوار مگر آپ سے منسوب ہوئی ہے

◀◀ ● ▶▶

C/o Moshtaque AhmadNoori
A/103 Second Floor
Ali Nagar Near Gulshan Plaza
P.o .Anisabaad Patna 800002 (Bihar)

تبصرے

نام کتاب:لفظوں کا لہو
صنف:ناول
ناول نگار:سلمان عبدالصمد
سنہ اشاعت اول:جولائی2016 سنہ اشاعت دوم:فروری2017
صفحات:224(مجلد) قیمت:100
پبلشر:دائمی پرواز ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی لکھو
مبصر:ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

سلمان عبدالصمد کا ناول ''لفظوں کا لہو'' اپنے موضوع کے اعتبار سے جدت لئے ہوئے ہے کہ فکشن میں ہم عصر اردو صحافت کو مرکز مطالعہ شاید اب تک نہیں بنایا گیا تھا۔ یوں تو اس ناول میں مصنف نے موجودہ معاشرہ کے مختلف مسائل کی جانب ہمیں متوجہ کیا ہے مثلاً شہری زندگی کا کرب، گاؤں کی تکلیفیں، کم عمر کی شادی، بیویوں کو چھوڑ کر غیر ممالک میں بسنے والے شوہروں کے ازدواجی رشتے اور اس کے مسائل، ہندستانی معیشت اور طبابت کی کمزوریاں وغیرہ۔ مگر مرکزی توجہ صحافت اور عورتوں کی زندگی پر رہی ہے، اور پورا ناول انہی دونوں موضوعات کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے۔ سلمان جہاں ایک طرف صحافت اور عورت کی طاقت کا احساس دلاتے ہیں وہیں ان دونوں کے زوال کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے بار بار صحافیوں کو زوال پذیر صحافت کے خلاف کھڑے ہونے کی تلقین کرتے ہوئے ان کو حق گوئی و راست بازی کی جانب متوجہ کیا ہے تو عورت کو بھی اپنے حق کی بازیافت کے لئے للکارا ہے۔ وہ چونکہ خود صحافی ہیں اس لئے

انہوں نے زرد صحافت، استحصال کی بنیاد پر ٹکی صحافت اور اس کے نشیب و فراز کو قریب سے محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحافت کے بعض ایسے گوشوں اور ایسے حقائق سے ہمیں روشناس کراتے ہیں جہاں ہماری نگاہ جا ہی نہیں سکتی اور جاتی بھی ہے تو ہم اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ اسی لئے وہ صحافت جیسے پاکیزہ پیشے سے وابستہ افراد کے ساتھ ہر قاری کو اس کا احساس کرانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف صحافیوں سے کہتے ہیں کہ

''صرف حق کا مطالبہ ہی نہیں، حق پیدا کرنا اور حق کی پرورش کرنا بھی
میرے لحاظ سے صحافیوں کا فریضہ ہے۔ جو ہو رہا ہے اسے دکھانے کی ضرورت ہی
کیا، وہ تو خود ہی دکھ رہا ہے۔ انہیں وہ بھی دکھانا ہے جو ہو سکتا ہے''

تو دوسری طرف قاری سے کہتے ہیں

''دنیا میں پیدا ہونے والا ہر فرد صحافی ہے۔ حق کا مطالبہ کرنا ہر ایک کا بنیادی حق ہے''

آج جب صحافت پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا دونوں کے ذریعہ ایک کمرشیل اور تجارتی شعبے کے طور پر اپنی جگہ بنا چکی ہے، جہاں اصول، آدرش اور طریقۂ کار کتابوں تک سمٹ چکے ہیں، سلمان بہت گہرائی سے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور قاری کو سیاہ اور سفید کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ کر دکھاتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ناول کا دوسرا بڑا موضوع عورت ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ سلمان نے اس عمر میں عورتوں کے مسائل کا اس قدر باریک بینی سے کیسے مشاہدہ کر لیا۔ عورتوں کی سوچ، ان کا ذہنی انتشار، رشتوں کے تعلق سے ان کی فکر، وصال کی خوشی اور ہجر کا کرب، ان کے جذبات اور ایک ہی رشتے سے بندھی دو عورتوں کی کشمکش وغیرہ پر سلمان نے جس فنکاری سے نگاہ ڈالی ہے وہ حیران کرنے والی ہے۔ انہوں نے نہ صرف ان کی نفسیات کا مطالعہ کیا ہے بلکہ ان کی ضروریات اور معاملات کا بھی گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ دیوندا سر نے کہیں لکھا تھا کہ ''عوتوں کے مسائل مردوں کے مسائل سے اتنے زیادہ مختلف ہوتے ہیں کہ مرد تخلیق کار ان کی ترجمانی نہیں کر سکتے۔ عورتوں کی کردار نگاری میں مرد غالب اور عورت مخالف تعصّبات اور رویے کسی نہ کسی طور اور سطح پر شعوری یا غیر شعوری طور پر در آتے ہیں۔'' میرے خیال میں اسر صاحب اگر آج ہوتے اور سلمان کا یہ ناول پڑھتے تو اپنا یہ قول ضرور واپس لے لیتے۔ کیونکہ سلمان نے اس ناول میں عورتوں کے جذبات کی عکاسی، دو سوتنوں کی آپسی چپقلش، نفرت، بغض، حسد یا محبت، خلوص اور یگانگت جیسے احساسات کو جس سچائی کے ساتھ زبان دی ہے وہ شاید کوئی نو عمر عورت بھی نہیں دے سکتی۔ اسی لئے سلمان کے مرد کرداروں میں وہ جاذبیت نہیں جو نسوانی کرداروں میں ہے۔ ناول کے شروع میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محسن اس کہانی کا مرکزی کردار ہے مگر جلد ہی اس کی جگہ زنیرا، نائلہ اور نیلا لے لیتی ہیں۔ ان تینوں عورتوں کے ذریعہ سلمان نے نہ صرف نسائی

معاملات ومسائل پر نگاہ ڈالی ہے بلکہ عورتوں کی حمایت میں اپنے بیانات کے ساتھ نسائی آزادی کی ہمنوائی بھی کی ہے۔تینوں عورتیں نئے زمانے کی ہیں جو بعض فطری لغزشوں کو چھوڑ کر بے حد مضبوط نظر آتی ہیں۔وہ نسوانی نزاکت وخصوصیات رکھتے ہوئے بھی تنہائی سے نبرد آزما ہوتی ہیں اور اپنی راہ خود بناتی ہیں۔وہ اپنی نسوانیت کے ساتھ باوقار اور پر اعتماد ہیں۔وہ نہ صرف حالات سے لڑتی ہیں بلکہ حالات کو بدلنے کی قوت بھی رکھتی ہیں۔

تکنیکی طور پر یہ ناول دو خوبیاں رکھتا ہے۔اول یہ کہ سلمان کا مشاہدہ عمیق ہے اس لیے وہ جزئیات نگاری کا کمال دکھاتے ہیں۔جزئیات سے محاکات کا حسن پیدا ہوتا ہے اور ناول کی پکڑ قاری پر مضبوط ہوتی ہے۔سلمان کی جزئیات نگاری قابل توجہ ہے۔ایک چھوٹا سا منظر ناول کے آغاز سے ہی دیکھئے

> ''نیند میں نائلہ کا بایاں ہاتھ قریب پھیلے اخبار کے صفحات پر جا پہنچا تھا۔دوسرے ہاتھ کی بندالٹی مٹھی ماتھے پر تھی اور دونوں گھٹنے کھڑے تھے۔اس کی ساڑی کی گولائی کا نچلا سرا بستر کی چادر سے ملا تھا اور اوپر کا، پنڈلیوں سے ذرا اوپر بلکہ گھٹنوں کے قریب آ گیا تھا۔زنیرا کے دل میں آیا کہ اسے کھینچ کر سیدھی کردے۔''(ص۔۲۲)

ناول کی دوسری خوبی اس کا مربوط پلاٹ ہے جو چھوٹے چھوٹے کئی افسانوں سے بنا گیا ہے۔یہ ایک نئی تکنیک بھی ہوسکتی ہے کہ مصنف نے اپنے موضوع کے مختلف شیڈس دکھانے کے لئے بجائے سپاٹ بیان کے ہر موضوع پر ایک کہانی لکھ ڈالی اور اسے نہایت خوبصورتی سے ایک لڑی میں پرو کر ناول کا حصہ بنادیا۔وہ بھی اس طرح کہ وہ افسانے ناول کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں۔صوفیہ،شبنم،فیضی،ثانیہ،عاطف،اسلم اور انیقہ،شوذیب وغیرہ کی کہانیوں کو اسی تکنیکی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔سلمان ابھی طالب علم ہیں اور کم عمر بھی۔اس لیے بہت سی جگہوں پر جلد بازی کا شکار بھی ہو گئے ہیں۔خاص طور پر زبان کے تعلق سے ابھی انہیں مزید محنت کی ضرورت ہے۔وہ الفاظ کا ذخیرہ رکھتے ہیں اور تخلیقی اسلوب برتنے کا ہنر بھی،بس تھوڑا سا صبر اور توجہ چاہیے۔کرافٹ مین شپ کی ایک ہلکی سی کمی کے باوجود چونکہ یہ ناول ایک اچھے ناول نگار کی بشارت دے رہا ہے اس لیے فکشن کی دنیا میں سلمان عبدالصمد کا استقبال گرمجوشی سے ہونا چاہیے۔ناول کی حصولیابی کے لیے 9810318692 پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: یہ عشق ہے
صنف: شاعری

شاعر: عرفان ستار
صفحات۔۱۶۰ قیمت۔۳۵۰ روپے
ترتیب وانتخاب: لیاقت جعفری،عمر فرحت
پیش کش: تفہیم پبلیکیشنز،راجوری (جموں کشمیر) انڈیا
مبصر: اقبال حسن آزاد

عرفان ستار جدید غزل گو شاعروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔یہاں پر ''جدید'' سے میری مراد ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والی جدید ادبی تحریک نہیں ہے بلکہ دور حاضر کا ہر شاعر اور ادیب میری نظر میں جدید ہے۔

عرفان ستار ۱۹۶۸ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔انہوں نے ایم بی اے (مارکیٹنگ) اور ایم ایس (مینیجمنٹ سائنس) کی تعلیم حاصل کی۔سردست وہ ٹورنٹو (کینیڈا) میں مقیم ہیں اور فارماسیوٹیکل انڈسٹری میں ملازمت کررہے ہیں۔''یہ عشق ہے'' ان کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کے دو شعری مجموعے ''تکرار ساعت'' (۲۰۰۵) اور ''ساعت امکاں'' (۲۰۱۶) شایع ہوکر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

عرفان ستار نے اپنے راستہ سب سے الگ چنا ہے۔وہ کسی سے متاثر نظر نہیں آتے.....نہ اساتذہ سے اور نہ ہی ہمعصروں سے۔جناب شمیم حنفی ان کی غزلوں پر خیال آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''نیا اور نوآموز شاعر بھی کبھی کبھی اپنا راستہ اس طرح نکالتا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے۔عرفان ستار تو خیر اپنی شہرت اور مقبولیت کے باعث اب،نئے غزل گویوں کے لیے بھی ماڈل اور مثال بن چکے ہیں۔ان کی ہر غزل کے ساتھ تخلیقی انکشاف کا ایک نیا،رمز آمیز اور دل کو کھینچنے والا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔پرانے لفظوں کو وہ معانی کی نئی سطح پر برتتے ہیں اور نئے مرکبات وضع کرتے ہیں۔اظہار کے نئے پن اور تجربوں کی ندرت کے لحاظ سے،ان کی غزل،تازہ کار غزل گویوں کی صف میں بھی ممتاز دکھائی دیتی ہے۔ان کے اشعار میں ایک رچی ہوئی شائستگی ملتی ہے۔ایک فنکارانہ صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے اور نئے پن کے باوجود،پختگی کا رنگ نمایاں ہے۔''

اور جناب ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ:

''عرفان ستار یوں تو ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کی بیش تر غزلیں اردو کے روایتی شعری اسالیب سے ان کی بھرپور واقفیت کی شہادت دیتی ہیں مگر ان کی شناخت بعض انفرادی رویوں میں پوشیدہ ہے۔وہ اپنے وجود،اپنی ذات اور اپنے انفرادی احساسات کو نہ تو محض روایت پرستی پر قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں اور نہ رسمی اور یکسانیت زدہ جدید لب ولہجہ کے اتباع پر قانع ہیں۔تحیر اور استعجاب ان کی غزلوں کی پہلی پہچان ہے۔''

عرفان ستار کی بیشتر غزلیں طویل بحر میں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں ایک نغمگی

کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور قاری ان کے سحر میں گرفتار ہوتا جاتا ہے۔مزید یہ کہ ان کی ہر غزل مرصع و مسجع ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

یونہی بے یقیں، یوں ہی بے نشاں، مری آدھی عمر گزر گئی
کہیں ہو نہ جاؤں میں رائگاں، مری آدھی عمر گزر گئی
کبھی ذکر حرمت حرف میں، کبھی فکر آمد و صرف میں
یونہی رزق و عشق کے درمیاں، مری آدھی عمر گزر گئی
کوئی طعنہ زن مری ذات پر، کوئی خندہ زن کسی بات پر
پئے دل نوازیٔ دوستاں مری آدھی عمر گزر گئی

نصیب ہجر ہی ٹھہرا تو رسم و راہ بھی کیا
یہ اہتمامِ ملاقات گاہ گاہ بھی کیا
نہ ہو جو ذوق تماشا یہاں تو کچھ بھی نہیں
نظر کی بزم بھی کیا دل کی خانقاہ بھی کیا
اب ترے لمس کو یاد کرنے کا اک سلسلہ اور دیوانہ پن رہ گیا
تو کہیں کھو گیا اور پہلو میں تیری شباہت لیے اک بدن رہ گیا
وہ سراپا ترا وہ ترے خال و خد میری یادوں میں سب منتشر ہو گئے
لفظ کی جستجو میں لرزتا ہوا نیم وا فقط اک دہن رہ گیا

طویل بحروں کے علاوہ انہوں نے بعض چھوٹی بحروں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور وہ ہر جگہ یکساں طور پر کامیاب نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

دیکھ مستی وجود کی میری — تا ابد دھوم مچ گئی میری
تو توجہ ادھر کرے نہ کرے — کم نہ ہوگی سپردگی میری
پوچھتے کیا ہو دل کی حالت کا — درد ہے، درد بھی قیامت کا
یار، نشتر تو سب کے ہاتھ میں ہے — کوئی ماہر بھی ہو جراحت کا

یہ تو مُشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ عرفان ستار کی غزلیں ٹھہر ٹھہر کر، لطف لے کر پڑھنے کی چیز ہیں۔ شائقین غزل کے لیے یہ ایک عمدہ تحفہ ہے۔ ہر باذوق قاری کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

◀◀ ● ▶▶

نام رسالہ: ''سہ ماہی، دربھنگہ ٹائمز، دربھنگہ''
(اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر) جنوری ۲۰۱۷ تا ستمبر ۲۰۱۷
صفحات۔ ۴۰۰ قیمت۔ ۳۰۰ روپے
مدیر: ڈاکٹر منصور خوشتر
پتا: شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی، لال باغ، دربھنگہ، بہار (انڈیا)۔ ۸۴۶۰۰۴
darbhangatimes@gmail.comwww.darbhangatimes.in
Contact No:09234772764,09472059441
مبصر: اقبال حسن آزاد

ڈاکٹر منصور خوشتر کی ادارت میں شایع ہونے والے ادبی مجلہ ''دربھنگہ ٹائمس'' کا ''اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر'' پیش نظر ہے۔ غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو ہمیشہ سے تنازعات کا شکار رہی ہے۔ کسی نے اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیا اور کسی نے اس کی گردن زنی کا حکم صادر فرمایا، کسی نے اسے چاول پر قل ھواللہ لکھنے کا فن قرار دیا اور کسی نے اسے اردو شاعری کی آبرو کہا۔ حقیقت یہ ہے غزل روز اول سے ہی ایک محبوب صنف سخن رہی ہے اور ہر دور میں اس کے چاہنے والے ایک کثیر تعداد میں موجود رہے ہیں۔ غزل اپنے ابتدائی دنوں میں قدرے خام تھی۔ اس وقت چونکہ اردو زبان پر ہندوستان کی مقامی زبانوں کا غلبہ تھا لہذا غزل کی زبان بھی نامانوس تھی۔ پھر بھی ولی دکنی کے بعض اشعار نہایت صاف اور رواں ہیں جنہیں پڑھ کر ہمیں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ مثلاً:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا — جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا

اور:

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا — ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

امیر خسرو کی زبان فارسی اور ہندوی کا آمیزہ ہے اور اس کا ایک الگ لطف ہے۔ خسرو کی ایک مشہور غزل ہے جس کے ایک شعر میں آدھا مصرع فارسی کا اور آدھا ہندی کا ہے۔ جبکہ بقیہ اشعار میں ایک مصرع فارسی کا اور دوسرا ہندی کا ہے۔ یہ غزل ہر دور میں مشہور و مقبول رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی:

زحال مسکیں مکن تغافل، درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ دور اول کے اردو غزل گو شعراء نے جو بنیاد رکھی تھی اسی پر آج غزل کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا ویسے ویسے اردو زبان نکھرتی اور سنورتی گئی اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب غزل کی زبان معیار بن گئی۔ اور اس کے تین اہم دبستان قائم ہو گئے، دبستان دلی، دبستان لکھنؤ اور دبستان عظیم آباد۔ ہر دبستان کی اپنی الگ اہمیت تھی۔ دبستان دلی میں داخلی احساسات وجذبات کی کارفرمائی تھی تو دبستان لکھنؤ میں خارجی صفات کا بیان ملتا تھا اور دبستان عظیم آباد نے اپنا راستہ ان دونوں کے درمیان سے نکالا تھا۔

محمد حسین آزاد نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف ''آب حیات'' میں اردو شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے جن میں تیسرا اور پانچواں دور ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ تیسرے دور میں میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر دردؔ جیسے بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے تو پانچویں دور میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ اور مومن خاں مومنؔ جیسے نابغۂ روزگار نے اپنے جلوے بکھیرے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو شاعری عموماً اور اردو غزل خصوصاً بے توجہی کا شکار رہی۔ ترقی پسند تحریک نے اس میں نعرے بازی کو شامل کر دیا اور غزل دلی جذبات کی ترجمانی کرنے کی بجائے نعرہ بازی کرنے لگی۔ اور جب جدید ادب نے اپنے پیر پھیلائے تو اردو شاعری چوں چوں کا مربّہ بن کر رہ گئی۔ اس پورے دورانئے میں معدودے چند ایسے شاعر گزرے ہیں جنہوں نے اردو ادب میں اپنے پختہ دستخط ثبت کیے ہوں وگرنہ ان میں سے بیشتر ماضی کے اوراق میں گم ہو گئے ہیں اور آج ان کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں ہے۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس جب جدید تحریک شروع ہوئی تو اردو ادب ایک نئی راہ پر چل پڑا۔ پرانے سانچے توڑے جانے لگے اور قارئین کے سامنے ایک اجنبی اور نامانوس لب و لہجے میں شعر و افسانے کے نمونے پیش کیے جانے لگے۔ یہ غلغلہ بڑے زور و شور کے ساتھ اُٹھا اور اور لگ بھگ بیس برسوں تک اس نے اردو ادب کو یرغمال بنا کر رکھا۔ اس عرصے میں قاری کا رشتہ ادب سے بالکل کٹ کر رہ گیا۔ اس تحریک سے بھی بہت سارے شاعر اور ادیب فیشن کے طور پر جُڑ گئے لیکن جدیدیت کے ختم ہوتے ہی یہ سب کے سب ادبی منظر نامے سے غائب ہو گئے۔ البتہ جو جینیون لوگ تھے انہوں نے اپنا وجود قائم رکھا۔

جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت کا نعرہ بلند کیا گیا لیکن اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ دراصل ترقی پسند تحریک کا احیا تھا اور ادب پھر اسی پرانے اور مقبول عام اسلوب میں پیش کیا جانے لگا جو ترقی پسن تحریک کا طرّہ امتیاز تھا۔ وہی زندگی اور زندگی سے کشید کی ہوئی کہانیاں اور اشعار۔

اکیسویں صدی کا آغاز عالمی سطح پر نہایت مایوس کن رہا۔ دنیا ایک قدم آگے چلتی ہے تو زندگی چار

قدم پیچھے چلی جاتی ہے۔ دہشت گردی اور بنیاد پرستی نے اپنے قدم اتنی مضبوطی کے ساتھ جما لیے ہیں کہ مستقبل قریب میں ان سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایسی صورت حال میں اردو کے ادیب اور شاعر ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ اس عرصے میں نہ تو قابل ذکر ناول لکھے گئے نہ افسانے اور نہ ہی شاعری کے عمدہ نمونے سامنے آئے ہیں۔ ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہے۔ قابل مبارک ہیں ڈاکٹر منصور خوشتر جنہوں نے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی ہے یا یوں کہئے کہ ٹھہرے ہوئے پانی میں پتھر پھینک کر اس میں لہریں پیدا کر رہے ہیں۔ ''دربھنگہ ٹائمز'' کا اکیسویں صدی میں غزل نمبر اسی کی مثال ہے۔ چار سو صفحات پر محیط یہ نمبر ادب کا ایک نیا سنگ میل ہے۔

اداریہ میں ڈاکٹر منصور خوشتر رقم طراز ہیں کہ:

''''دربھنگہ ٹائمز'' کی ادارتی ٹیم نے روایتی طور پر 'اکیسویں صدی میں غزل نمبر' نکالنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے پیش نظر یہ تھا کہ غزل کے بدلتے تمام بھیس سامنے آئیں، تاکہ علمی اور تنقیدی سطح پر بدلی ہوئی غزل سامنے آسکے۔ اس کی ہیئت و فارم کی مکمل داستان سامنے آئے اور ساتھ ہی وہ ادبی منظر نامہ بھی اپنی جھلکیاں دکھائے جو آنے والے پچاس برسوں میں معرض وجود میں آئے گا، لیکن غزل کے کے مکمل بدلتے منہاج و معیار کی عکاسی کے لیے یہ غزل نمبر ناکافی ہے، ہمیں اس کے اعتراف میں کوئی سکی نہیں۔''

مدیر نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی نمبر حرف آخر نہیں ہوتا۔ مضامین کے حصول کے لیے کتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہے یہ ایک ادبی رسالے کا مدیر خوب اچھی طرح جانتا ہے۔ دراصل ہمارے زیادہ تر شاعر اور ادیب حد سے زیادہ نخریلے، نازک مزاج اور خوشامد پسند واقع ہوئے ہیں۔ ایک مضمون کے لیے دس دس بار یاد دہانی کرنی پڑتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو کا رسالہ نکالنے کے لیے شیر کا دل اور پتھر کا جگر چاہئے۔ اور جب تک ڈاکٹر منصور منصور خوشتر جیسے شیر دل موجود ہیں اس زبان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اس نمبر میں سب سے پہلے استاد شاعر پروفیسر عبد المنان طرزیؔ کی نظم بعنوان ''اردو غزل اکیسویں صدی کی دہلیز پر'' شامل ہے جو معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے کامیاب ہے۔ اس نمبر میں شارب، مناظر عاشق ہرگانوی، علی احمد فاطمی، مشرف عالم ذوقی، پروفیسر رئیس انور، حقانی القاسمی، سید احمد قادری، ڈاکٹر اشرف کمال انجنئر محمد عادل، ڈاکٹر قیام نیّر، ڈاکٹر احمد کفیل، محمد اکرم خاور، شارق عدیل، ڈاکٹر احسان عالم، غلام نبی کمار، محمد داؤد محسن، صدف اقبال، صالحہ صدیقی، رضیہ پروین، ایمن تنزیل، جاں نثار معین، صفدر امام قادری، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ابوبکر

عباد، خورشید حیات، اقبال واجد، محمد فرقان سنبھلی، الیاس بابر، شبنم پروین، ظہیر حسن ظہیر، ڈاکٹر منصور خوشتر، شاہد الاسلام، رشید جہاں انور اور ڈاکٹر محمد اظہر سعود خاں شامل ہیں۔

اس نمبر کے نکالنے سے قبل ڈاکٹر منصور خوشتر نے فیس بک پر ایک مکالمہ قائم کیا تھا جس میں چار سوالات پیش کیے گئے تھے۔

(۱) کیا جدید اردو شاعری درپیش مسائل اور حالات سے مطابقت نہیں رکھتی؟ آخر کیا وجہ ہے کہ جدیدیت کی تحریک سے وابستہ شاعر سیاسی موضوعات سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا سیاست کو نظر انداز کر کے کوئی ادب زندہ رہ سکتا ہے؟

(۲) دہشت گردی، عالمی سیاست کا بدلتا چہرہ، امریکہ اسرائیل جیسے ممالک کی تانا شاہی، انسانیت کا زوال۔ آخر کیا وجہ ہے کہ یہ موضوعات ناول اور فکشن کا حصہ تو بنتے رہے لیکن ہمارے بڑے جدید شعراء کرام ایسے موضوعات کو شاعری کے لیے حرام تصور کرتے رہے؟

(۳) کیا آپ برصغیر میں ان دنوں کی جانے والی شاعری سے مطمئن ہیں؟ غالب و میر کے بعد اقبال، جگر، فانی کے بعد اسعد بدایونی، زیب غوری، عرفان صدیقی کے بعد آج غزل کا جو مزاج و معیار ہے، اس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟ ظفر اقبال تو عرفان صدیقی اور زیب غوری کو بھی شاعر تسلیم نہیں کرتے۔ ہندوستانی شاعری ان کی نظر میں کمزور ہے۔ یہ بات آپ کی نظر میں کس حد تک صحیح ہے؟ کیا یہ ایک شاعر کا دیوالیہ پن نہیں کہ وہ اردو غزل کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تقسیم کرنے کے بعد ہندوستانی شاعری کا مذاق بنا رہا ہے؟ اس لیے اسی سے ملتا جلتا ایک سوال یہ ہے کہ کیا پاکستانی غزل حقیقت میں ہندوستانی غزل سے بہت آگے ہے؟

(۴) پسند، ناپسند کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔ غالب سب کی پسند تھے لیکن یگانہ کو پسند نہیں آئے۔ آپ اتنا کیجیے کہ زندہ شاعروں میں اپنی پسند کے کچھ شاعروں کے نام بتا دیجیے۔ آپ کو کیوں پسند

اقبال حسن آزاد کا
تیسرا
افسانوی مجموعہ
پورٹریٹ
(۲۰۱۷ء)

ہیں؟ اس کی تفصیلات لکھنا چاہتے ہوں تو آپ کو پوری آزادی ہے۔

اس مکالمے میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان کے نام درج ذیل ہیں:

مشرف عالم ذوقی، عین تابش، کامران غنی صبا، سلمان عبدالصمد، احمد سہیل، مستفیض احمد عارفی، تبسم فاطمہ، اقبال حسن آزاد، خورشید حیات، ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن، نسترن احسن فتیحی، سیمی کرن، غلام نبی کمار، نورعین علی حق، ابن عظیم فاطمی، اصغر شمیم، ارشد عبدالحمید، فیضان ضیائی، انعام اعظمی، ایم آر چشتی اور انجمن اختر۔

علاوہ ازیں اس نمبر میں غزلوں کی کہکشاں بھی سجائی گئی ہے جس میں نئے پرانے کل ملا کر ایک سو دس شعراء کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

وزیر آغا، شمس الرحمن فاروقی، مظہر امام، بیکل اتساہی، تسلیم الہٰی زلفی، انور سدید، اقبال متین۔ باقر مہدی، بشیر بدر، جون ایلیا، حامدی کاشمیری، ندا فاضلی، حفیظ بنارسی، عبدالمنان طرزی، قیصر شمیم، علقمہ شبلی، اویس احمد دوراں، رہبر چندن پٹوی، منظر شہاب، ف۔س۔ اعجاز، کرامت علی کرامت، منور رانا، کرشن کمار طور، مظفر حنفی، مخمور سعیدی، پرکاش فکری، پروین کمار اشک، جاوید اختر، غلام مرتضیٰ راہی، اسلم حنیف، افتخار اجمل شاہین، افتخار امام صدیقی، ظفر گورکھپوری، عبدالاحد ساز، سلطان اختر، خورشید اکبر، عالم خورشید، قوس صدیقی، محمد سالم، جمال اویسی، فطین اشرف صدیقی، اسعد بدایونی، فراغ روہوی، یوسف ضمیر، سعدیہ صدف، ڈاکٹر نبیل احمد، شیدا بگھونوی، سلمان حیدر آفاق، قیصر صدیقی، افتخار راغب، مشتاق احمد نوری، پرویز اقبال، شارق عدیل، پرویز مانس، صفدر ہمدانی، ڈاکٹر نکہت نسیم، واجدہ تبسم، ڈاکٹر صادقہ نواب سحر، پروفیسر علیم اللہ حالی، قیصر خالد، ڈاکٹر شفق سوپوری، سالک جمیل براڑ، مرغوب اثر فاطمی، سید بصیر الحسن وفا نقوی، حیدر وارثی، حسن رہبر، انور آفاقی، اظہر نیرّ، ڈاکٹر رضی امروہوی، ڈاکٹر صفدر رضا، شاذ رمزی، ارشد صدیقی، ارمان نجمی، اسحاق ملک، اقبال بیدار، امجد علی سرور، تسنیم فاروقی، پرویز مظفر، شمیم فاروقی، حمید کریم، رونق شہری، رؤف خیر، سعید رحمانی، سلطانہ مہر، شمیم قاسمی، شہپر رسول، شہریار، عاصم شہنواز شبلی، علیم صبا نویدی، عطا عابدی، فرحت احساس، فراز حامدی، مناظر عاشق ہرگانوی، کمال جعفری، نذیر فتح پوری، منور ہاشمی، نعمان شوق، نینا جوگن، محمد عامر، احسان ثاقب، اختر شاہجہاں پوری، مصداق اعظمی، اسرار الحق جیلانی، احمد اشفاق، نصر بلخی، ایم آر چشتی، انعام علی، کامران غنی صبا، ڈاکٹر اعجاز داؤدنگری، طارق متین، امان ذخیروی، جنید عالم آروی، سالم سلیم، منور راہی، ابوالفیض عظم اور سلیم ساغر۔

شاعروں کی اس طویل فہرست میں مرحوم بھی ہیں اور موجود بھی، نئے بھی ہیں اور پرانے بھی، کہنہ مشق بھی ہیں اور نو مشق بھی۔ لیکن ترتیب میں بزرگوں کی بزرگی کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ ایک قابل گرفت بات ہے۔

ان مشمولات کے علاوہ زیر نظر شمارے میں منظوم تبصرے، تبصرے اور قارئین کے خطوط بھی

شامل ہیں جو اس کی اہمیت اور وقعت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''دربھنگہ ٹائمز'' کا 'اکیسویں صدی میں اردو غزل نمبر' ایک اہم ادبی دستاویز ہے اور ہر باذوق قاری اس کا مطالعہ کرنا چاہے گا۔ خاص طور پر ریسرچ اسکالرز کے لیے تو یہ نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: پورٹریٹ

صنف: افسانے

مصنف: اقبال حسن آزاد

صفحات۔ ۱۹۲ قیمت۔ ۱۲۵ روپے

مبصر: ڈاکٹر ریاض توحیدی

اقبال حسن آزاد اردو کے مستند افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے اب تک تین مجموعے ''قطرہ قطرہ احساس'' (۱۹۷۷ء)، مردم گزیدہ (۲۰۰۵ء) اور ''پورٹریٹ (۲۰۱۷ء) شایع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی ایک تحقیقی کاوش ''اردو نثر میں طنز و مزاح کی روایت'' (۲۰۱۴ء) بھی منظر عام پر آ چکی ہے۔

یعنی پیش نظر افسانوی مجموعہ ''پورٹریٹ'' ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جس سے ظاہر ہے کہ موصوف فن افسانہ کی آبیاری کئی دہائیوں سے کرتے آئے ہیں۔ اور ادبی رسالہ ''ثالث'' کے توسط سے تو اقبال حسن آزاد صاحب پوری اردو دنیا کے قارئین میں ایک جانی پہچانی شخصیت بن چکے ہیں۔

''پورٹریٹ'' میں درجہ ذیل تیئس افسانے شامل ہیں:

پورٹریٹ، آسیب، حصار، محبت، بندوبست، نگوڑی، دھند میں لپٹی ایک صبح، شاہ جی کی بات، دھند، کاٹنے والے جوڑنے والے، عید کا چاند، کھنڈر، دنیا داری، پھر کب آؤ گے، شریف آدمی، مرد، جلتی ریت پر ننگے پاؤں سفر، بریکنگ نیوز، گملے میں اُگی ہوئی زندگی، روح، مردم گزیدہ، قطرہ قطرہ احساس اور زندگی.....اس پل

افسانہ تخلیق کرنے کے دوران تخلیق کار ایک خاص موضوع کو ذہن میں رکھ کر کہانی بُنتا ہے اور پلاٹ کو اسی موضوع کی جزیات و احساسات سے سنوارتا ہے جس کو وحدت تاثر بھی کہا جاتا ہے لیکن جب ایک باشعور قاری متن پر ارتکاز کرتا ہے تو قرات کے دوران متن کی فعال معنویت کئی ایسے مفاہیم کو سامنے لاتی ہے کہ تجزیہ کے بعد تخلیق کار بھی متن کی معنی خیز صورتحال سے متاثر ہو جاتا ہے۔ چاہے لکھنے کے دوران اس کے ذہن میں وہ نکات یا معنی نہ بھی رہے ہوں، لیکن یہ خصوصیت ایک معیاری تخلیق میں ہی ہوتی

ہے۔ زیر نظر تصنیف کا پہلا افسانہ ''پورٹریٹ'' ہے جو کہ کتاب کا نام بھی ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے کردار کی ذہنی کیفیات (Mental Conditions) کا لفظی پورٹریٹ ہے جس کی نفسیات پر عمر بھر خوف کا آسیب چھایا رہتا ہے۔ یہ ایک قسم کا نفسیاتی افسانہ ہے جس میں کردار کی نفسیاتی الجھنوں کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ افسانے کی ابتداء ہی کردار کے خوف سے کی گئی ہے:

''آبادی سے تھوڑی دور ہٹ کر جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسے گھنے جنگلوں سے خوف آتا۔۔۔۔''

اس طرح سے افسانہ نگار کردار کی نفسیاتی حالت کا فنکارانہ تعارف پیش کرتا ہے اور کہانی کی ابتداء ہی قاری کی توجہ کھینچنے میں کارگر ثابت ہو رہی ہے۔ ابتداء میں یہ خوف کوئی علامتی تاثر نہیں چھوڑ رہا ہے بلکہ یہ ایک فطری واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن جنگل کا یہ خوف علامتی صورت میں اس وقت ڈھل جاتا ہے جب بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ ہر منزل پر یہ خوف کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ پہلی پوسٹنگ کے بعد وہ جب کسی دور دراز شہر میں مقیم ہوتا ہے تو باپ کے آخری دیدار سے محروم ہونے کا قلق اسے عمر بھر رہا۔ طویل عمر گزارنے کے باوجود اسے بڑھاپے میں بھی جنگل کا یہ خوف ستاتا رہتا لیکن اب یہ بچپن والا خوف نہیں بلکہ علامتی جنگل کا خوف بن چکا ہے:

''کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ اس کے دماغ میں کوئی جنگل اُگ آیا ہے جہاں اونچے گھنے پیڑ آپس میں جڑے کھڑے ہیں اور سورج کی روشنی ان کے بڑے بڑے پتوں سے ٹکرا کر وہیں رک جاتی ہے۔ نیچے گہرا اندھیرا ہے۔ وہ سوتے میں چونک اٹھتا۔۔۔''

اسی طرح افسانہ نگار کردار کے خوف کو علامتی پیکر میں یوں پیش کرتا ہے:

''ان ہی دنوں اسے اپنے آس پاس کسی بہت بڑی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے جنگلوں میں چھپے بہت سارے سانپ، بچھو، شیر اور چیتے، بھالو اور بندر زمین پر چاروں طرف پھیل گئے ہیں۔''

تو خوف کی یہ علامتی عکاسی کردار کے سماجی ماحول کی بدلتی صورت حال کا اشاریہ بن جاتی ہے کہ شاید یہ لوگ اقلیت میں یا مظلوم ہیں اور اب حالات ایسے بدل رہے ہیں کہ انہیں اب انسانی سماج جنگلی جانوروں کی صورت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی طرف افسانہ نگار آگے کردار کے ذریعے ہی اشارہ کرتا ہے کہ ان دنوں اس کا باپ بہت فکر مند نظر آتا تھا۔ ایک دن اس نے ماں اپنی ماں کو کہتے سنا:

''سب لوگ چلے جا رہے ہیں۔ آپ کے بڑے بھیا بھی بیوی بچوں کو

لے کر چلے گئے۔ کیوں نہ ہم لوگ بھی.....''

افسانے میں کردار کی ایک اور نفسیاتی گرہ موجود ہے جو نسیان (Amnesia) کی صورت میں نظر آتی ہے۔ کردار کا یہ نفسیاتی پہلو بھی موضوع کی معنویت میں توسیع کر رہا ہے یعنی پلاٹ میں فنی مطابقت (Artistic Adaptation) پیدا کر رہا ہے۔ افسانہ نگار نے مناسب انداز سے کردار کے داخلی کرب اور خارجی خوف کو پلاٹ کے سپرد کیا ہے جس کی وجہ سے کہانی میں کہیں پر بھی جھول نظر نہیں آتا ہے۔ نسیان کی وجہ سے اب اس کی یاداشت اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ اسے اپنی عمر بھی ٹھیک طرح سے یاد نہیں رہی تھی۔ بڑھاپے میں وہ جب اپنی عمر کا حساب انگلیوں پر کرتا رہتا تو اس کی بیوی کو شک ہو جاتا کہ شاید اس کے حواس جواب دے رہے ہیں، یہاں تک کہ اسے اب اپنے باپ کا چہرہ بھی صحیح طرح سے یاد نہیں رہا تھا:

''وہ بہت ساری باتوں کو بھول چکا تھا اور بہت ساری جگہیں اور شکلیں
بھی اس کے حافظے سے نکل چکی تھیں حتیٰ کہ اسے اپنے باپ کی شکل بھی بالکل یاد نہ
رہی تھی کہ اسے گزرے ہوئے چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا تھا۔''

کردار کا نسیان اب افسانے میں ایک اور جہت کی غمازی کرتا ہے جو متن میں کردار کے یاد ماضی کا کرب (Nostalgia) بن کر سامنے آتا ہے۔ چونکہ باپ کی وفات کے بعد وہ اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑ کر شہر میں رہتا تھا لیکن اسے اپنے گاؤں میں گزری ہوئی زندگی اور اپنے والد کی یاد ہمیشہ ستاتی رہتی تھی۔ ایک دن جب وہ شام کے وقت پارک میں ایک جان پہچان والے بوڑھے کو بہت خوش پاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے آبائی مکان میں چند روز گزار کر آیا ہے۔ بوڑھے کی بشاشت اس کی نفسیات پر اس قدر اثر انداز ہو جاتی ہے کہ اسے بھی اپنے آبائی مکان اور باپ کی یاد ستانا

اقبال حسن آزاد
کا
چوتھا
افسانوی مجموعہ
اوس کے موتی
(زیر طبع)

شروع کر دیتی ہے لیکن یہ احساس اس کی یاداشت کو کچوکے لگاتا ہے کہ اسے اپنے باپ کی صورت تک یاد نہیں ہے۔ بہر حال! ایک دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ آبائی گھر کو دیکھنے کے لیے چلا جاتا ہے۔ گھر میں پہنچ کر وہ اپنے باپ کے پرانے پورٹریٹ کو دیکھنا چاہتا ہے جو سٹور روم میں موجود تھا اور جس کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں کیونکہ اسے باپ کی شکل تک یاد نہیں رہی تھی۔ وہ دل میں بسائے ان ہی یادوں کے ساتھ اسٹور روم میں داخل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر مشقت کرنے کے بعد اسے ایک آدم قد پورٹریٹ پر نظر پڑ جاتی ہے اور وہ اس کے سامنے کھڑا ہو کر خود کلامی میں کہتا ہے:

''تو ایسا تھا اس کا باپ، سر پر ہلکے سفید بال، چوڑی پیشانی، گھنی گھنی
بھنویں، بھاری پپوٹے، ستواں ناک، پتلے ہونٹ اور دہرے جبڑے۔''

کافی دیر تک پورٹریٹ کے سامنے کھڑا رہنے کے بعد وہ جب اچانک کی آہٹ سے چونک پڑتا ہے تو اس کی بیوی اسے حیرت سے پوچھتی ہے:

''آپ اتنی دیر سے آئینے کے سامنے کیوں کھڑے ہیں؟''

اس طرح سے افسانہ نگار کردار کے نفسیاتی پورٹریٹ کی پوری کہانی پیش کر دیتا ہے۔

اقبال حسن آزاد کے افسانوں میں خاص طور پر دو چیزیں نظر آتی ہیں.....ایک سماج میں موجود انسانی اقدار کی پاسداری اور دوسرا ان ہی انسانی قدروں کا تنزل، جس کے ثبوت میں افسانہ ''دھند میں لپٹی ایک صبح'' اور ''بریکنگ نیوز'' کی کہانیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ''دھند میں لپٹی ایک صبح'' میں ایک لاوارث بچے کا مسئلہ بنیادی موضوع ہے جو صبح کے وقت مسجد کی طرف جانے والے کردار احمد سے شروع ہو کر اس کی بیوی کے درجہ ذیل ممتا بھرے جذبات پر قریباً اختتام کو پہنچتا ہے۔

''جب ہم جانوروں کے بچوں کو اپنے گھر میں رکھ سکتے ہیں تو کسی انسان
کے بچے کو کیوں نہیں۔۔۔۔؟''

اسی طرح جدید دور کی مادیت پرستی میں انسانی اقدار کے تنزل کی کہانی ''بریکنگ نیوز'' میں دکھائی گئی ہے کہ کس طرح خود کو مہذب اور سماج سدھار کے زعم کے شکار افراد اور میڈیا ایک عورت کی عصمت ریزی کی لائیو رپورٹنگ اور اس کو حیوانوں سے بچانے کے برعکس اسٹڈیو میں بحث و تمحیص کرتے رہتے ہیں۔ افسانے میں میڈیا سے وابستہ افراد کے غیر ذمہ دارانہ رویہ کو یوں ایکسپوز کیا گیا ہے:

''آیئے! اب ہم آپ کو اس پیڑت مہیلا سے ملواتے ہیں۔''
پھر وہ مائک لیے ہوئے زمین پر بے سدھ پڑی ہوئی عورت کے پاس
جاتا ہے اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر مائک اس کے منہ سٹا کر پوچھتا ہے۔

''کیا آپ ہمارے درشکوں کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ کیا اس سے پہلے
بھی کبھی آپ کے ساتھ اس پرکار کی درگھٹنا گھٹی تھی۔''

''پورٹریٹ'' میں شامل افسانوں کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ اقبال حسن آزاد نہ صرف سماج کی بدلتی ہوئی صورتحال کا گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں بلکہ تجربے کی بدولت مشاہدے کو فنی قالب میں ڈھالنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں جو ایک کامیاب افسانہ نگار کی فکشن فہمی کا عیاں ثبوت بھی ہے۔ان کے کئی افسانوں میں موضوعاتی جدت اور دلچسپ ٹریٹمنٹ بھی نظر آتا ہے جو قاری کے احساس پر خوش گوار اثرات چھوڑ جاتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نام کتاب: دہلیز
صنف: افسانہ
مصنفہ: ڈاکٹر نرگس جہاں باروی
صفحات: ۱۰۸، قیمت: ۱۵۰/روپے
اشاعت: ۲۰۱۶ء
رابطہ: 9204463376
مبصر: ڈاکٹر سید سہیل

خوبصورت صدر دروازہ کی دیدہ زیب دہلیز پر پہنچا تو جستجو ہوئی کہ داخلی نقش ونگار کو دیکھوں۔قدم بڑھنے لگے۔پے در پے باب در باب وا ہوتے گئے۔فن کاری نمایاں ہونے لگی۔داد وتحسین کے الفاظ زبان پر آنے لگے۔ہر باب سے گزر کر اندر داخل ہونے پر محسوس ہوا کہ ہر اندرونی در و دیوار میں جیسے زبان ڈال دی گئی ہو جو بکھرتے خوابوں، سسکتی تمناؤں، ریزہ ریزہ آرزوؤں کی کہانی اور جیتی جاگتی زندگانی کی روداد سنا رہی ہو۔

زندگی کے مشاہدات تو نظروں کے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔کوئی دیکھ کر گزر جاتا ہے۔حساس نظر رکھنے والا رُک کر غور کرتا ہے، سوچتا ہے اور ان میں زندگی کی حقیقت تلاش کرتا ہے۔مشاہدات کو حافظہ میں محفوظ رکھنا، پھر انہیں نچوڑ کر ان میں چلتی پھرتی زندگی کے مختلف رنگوں کی آمیزش کر کے عبارت آرائی کرنا فنکاری ہے۔''دہلیز'' محترمہ نرگس جہاں کی اسی فنکاری کا نتیجہ ہے۔

نرگس جہاں نے عصری تقاضوں کے تحت مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور اپنے احساسات کو

افسانے کی شکل میں قارئین کے غور وفکر کے حوالے کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ اس مختصر کہانی کی دوسری شکل ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے جس میں واقعہ، کردار، تجربہ اور احساس کی فنکارانہ اپیش کش ہو۔اس فنکاری کے بانی کے طور پر منشی پریم چند کو تسلیم کیا گیا ہے جنہوں نے دیہاتی اور شہری زندگی دونوں کو ہی تخلیقی فن کا موضوع بنایا۔ان کا پسندیدہ موضوع دیہات کی زندگی رہی ہے جسے انہوں نے بہت قریب سے دیکھا، سمجھا، اور پرکھا۔گاؤں والوں کی سادگی، بے چارگی، دکھ درد، توہم پرستی، جہالت، غربت اور امیر طبقوں کے ہاتھوں استحصال کا نقشہ پریم چند نے اپنے قلم کے ذریعہ کاغذ پر کھینچا ہے۔

سرسری اوراق گردانی سے پتا چلتا ہے کہ ''دہلیز'' تانیثی فکر کی گہری رغبت کی گواہی دیتا ہے جس میں عورت کو کئی روپ میں دیکھا جا سکتا ہے مثلاً ماں، بیٹی، بہن، ساس،، بھاوج اور محبوبہ وغیرہ۔دہلیز کے افسانوں میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔زن وشو کے کربناک رشتے، خواتین کے مسائل، ٹوٹتے بکھرتے ارمان، آوارہ مزاج نوجوانوں کے کردار، لرزتے آنسو اور تنہائیوں کا کرب، کہیں زندگی کی بے وقعتی کا ذکر، ممتا کی آہنی زنجیر۔غرض ''دہلیز'' کا ہر افسانہ رشتوں کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو ماحول سے جوڑ کر قاری کے دل میں ایک کسک پیدا کرتا ہے اور موضوع کے احاطے میں انفرادی اور سماجی رویّوں کی جہاں رونمائی ہوتی ہے وہیں ان کے خلاف احتجاج کی شکل میں اُبھر کر ان کے مداوا کی فکر اور تحریک کی دعوت بھی دیتا نظر آتا ہے۔

ان افسانوں میں کردار بھلے ہی فرضی ہوں مگر یہ کہانیاں محض تصوراتی نہیں۔معاشرتی زندگی کا گہرائی اور گیرائی سے جائزہ لیا جائے تو ایسی بہت ساری کہانیاں ہمارے اردگرد مل جائیں گی۔نرگس جہاں کا افسانوی مجموعہ ''دہلیز'' ایسے ہی کرداروں سے دنیا کو روشناس کراتا ہے اور ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آخر یہ سب کیوں اور کب تک.....؟ سلیس بیانیہ، سادہ اور عام فہم زبان اور تحریر کی روانی نے ''دہلیز'' کو صرف افسانوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ زندگی کا آئینہ بنا دیا ہے۔

◀◀ ● ▶▶